NINE LEAVES
ADVANCED THICKENING
HERBAL HAIR OIL
WITH ACTIVE ARGON OIL
Less Hair Fall
Thicker Hair

خاندان بھر کے لیے

ماہنامہ

ریشم

October 2017

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
PP
پاکستانی پوائنٹ

سلسلے وار ناولز، کہانیاں، افسانے، شاعری، روحانی معالج اور
آپ کا پسندیدہ سلسلہ "نوک جھوک" اندرونی صفحات پر

خاندان بھر کے لیے

ماہنامہ

ریشم

جلد نمبر: 18 شمارہ نمبر: 02 اکتوبر 2017ء

ABC Certified

APNS

آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مینجنگ ایڈیٹر: بشریٰ مسرور

ایڈیٹر: محمد طلحہ مسرور

اسسٹنٹ ایڈیٹر: کشائش مسرور

بزنس ایگزیکٹو: مسرور احمد
0321-5011568

سرکولیشن مینجر: عمران خان
0321-8772002

شعبہ اشتہارات

مارکیٹنگ مینجرز کراچی: ریاض مرزا
0323-2895528
سلیم قریشی، سیدہ راضیہ شاکر، رانا عبدالحمید

ایڈورٹائزنگ مینجر پنجاب: ثاقب بخاری
0323-5352523
0307-4400851

فوٹوگرافر: طاہر چوہدری
0321-4320844

قانونی مشیر: ایڈووکیٹ ہائی کورٹ
کرامت علی خان

لے آؤٹ: شہزاد علی

نوٹ: قیمت فی پرچہ (پاکستان) 60 روپے، (سعودی عرب) 20 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات 20 درہم، زرسالانہ (اندرون ملک) 700 روپے

ایڈیٹر و پبلشر بشریٰ مسرور نے زاہد بشیر پرنٹرز سے چھپوا کر لاہور سے شائع کیا۔

Head Office: Suite#1, 4th Floor, Block No.12 Mian Chambers, 3-Temple Road, Lahore
Ph (042) 36280130 Email: Rayshamdigest@gmail.com

Bureau Office: Plot No: 12/C, Seher Commercial, Lane No 1, DHA Phase 7 Karachi. Ph: 021-35854445

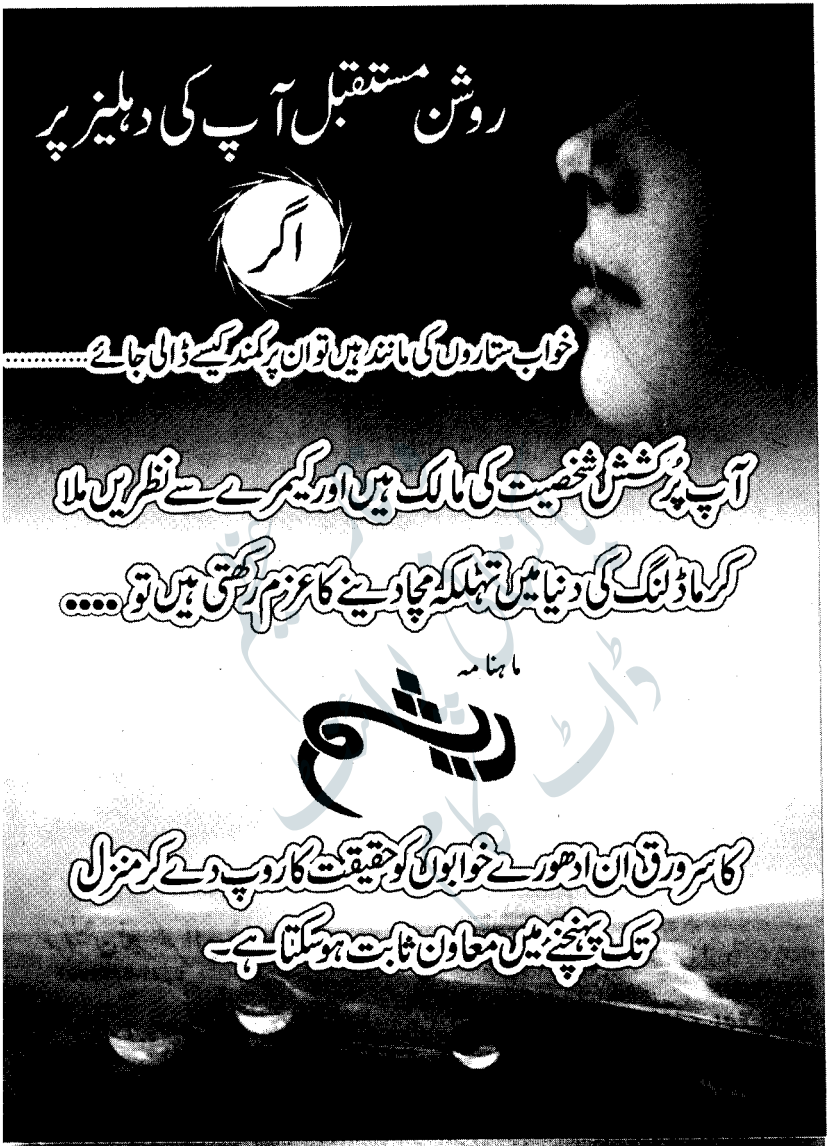

روشن مستقبل آپ کی دہلیز پر
اگر
خواب ستاروں کی مانند ہیں تو ان پر کمند کیسے ڈالی جائے..........
آپ پرکشش شخصیت کی مالک ہیں اور کیمرے سے نظریں ملا
کر ماڈلنگ کی دنیا میں تہلکہ مچا دینے کا عزم رکھتی ہیں تو ....
ماہنامہ
ریشم
کا سرورق ان ادھورے خوابوں کو حقیقت کا روپ دے کر منزل
تک پہنچنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔
ماہنامہ ریشم
Suite#1, 4th Floor, Block No.12 Mian Chambers, 3-Temple Road, Lahore
Ph (042) 36280130 Email: Rayshamdigest@gmail.com

اداریہ

سائنس کی نت نئی ایجادات نے جہاں ہماری زندگی کو سہولیات تعیشات سے بھر دیا ہے وہیں بے شمار مسائل اور تفکرات کو بھی جنم دیا ہے۔ خواتین کے کچن سے لے کر مرد حضرات کے دفاتر تک ہم سائنسی ایجادات سے نا صرف مستفید ہو رہے ہیں بلکہ اگر کہا جائے کہ ان ایجادات کے باعث ملنے والی سہولیات نے ہمیں بہت حد تک اپنا عادی بنا لیا ہے تو شاید کچھ غلط نہ ہوگا۔ یہ ایجادات جیسے جیسے عام ہوتی جاتی ہیں ویسے ویسے ان کی قیمت بھی ایک عام آدمی کی دسترس میں آتی جا رہی ہے اور زندگی کی سہولتیں بڑھتی جا رہی ہیں اور یہ سہولیات اب ضروریات زندگی بنتی جا رہی ہیں اور آج کے جدید دور کے والدین اپنے بچوں کی زندگی کو سہولیات اور تعیشات سے پُر کرنے کے لیے خود پیسہ کمانے کی مشین بنتے جا رہے ہیں۔ اور ہم اتنے مصروف رہنے لگے ہیں کہ ایک گھر کے افراد کو ایک دوسرے کے مسائل کا پتہ نہیں چلتا اور جب معلوم ہوتا ہے تو اکثر بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اب موبائل فون کو ہی لے لیجئے اس کا بے دریغ استعمال زندگی میں سہولت کے ساتھ مشکلات بھی بڑھا رہا ہے۔ ہمارے کم عمر بچے ''بلیو وہیل'' جیسی قاتل گیم ڈاؤن لوڈ کر کے کھیلتے ہیں اور ہمیں علم اس وقت ہوتا ہے کہ جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔

کہنا آپ سے صرف اتنا ہے کہ آپ کی ساری مصروفیات اپنی جگہ مگر خدارا اپنے بچوں کے مسائل اور ان کی سرگرمیوں پر نظر ضرور رکھیے کہ کہیں اپنی کسی نادانی، کوتاہی، ناسمجھی یا غلطی کی وجہ سے وہ کسی کے ہاتھوں ''بلیک میل'' تو نہیں ہو رہے یا کسی ایسی ''سرگرمی'' میں ملوث تو نہیں جو انہیں رفتہ رفتہ زندگی سے دور ہونے پر مجبور کر رہی ہو۔

بشریٰ مسرور

19 دین اور دنیا — مذہبی مضمون

23 مجھ سے ملیے میں ہوں کاشی چوہان — ممتاز احمد

32 نوک جھونک — محمد طلحہ مسرور

34 ریشمی دستک — بشریٰ مسرور — آپ کے خطوط

52 جنونِ دل — بشریٰ مسرور — سلسلے وار ناول

81 رنجش — عذرا فردوس — افسانہ

93 محبت ایک معجزہ — ممتاز احمد — افسانہ

111 مجھے تم سے محبت ہے — طیبہ عنصر مثل — افسانہ

123 کفارہ — ایم حسن نظامی — افسانہ

133 محبت نہیں دھوکہ ہے — ریما نور رضوان — افسانہ

139 ایک سوال — نزہت جبین ضیاء — افسانہ

143 تم بن — ایس امتیاز احمد — افسانہ

147 تم مجھے قبول ہو — حنا اصغر — افسانہ

155 خواب، خواہش، زندگی — ثمینہ طاہر بٹ — افسانہ

160 ستا خون — ثمینہ کنول — افسانہ

173 اور جسے رب رکھے — مجید احمد جائی — تاریخی کہانی

177 شادی کی خواہش — ایم اشفاق بٹ — جرم و سزا

183 واہ مولا تیرے رنگ — محسن علی طالب — افسانہ

185 درد کا شہر — آغا اسلم — ادبی انتخاب

201 کرائے دار — شاہد رفیق سہو — افسانہ

204 صفی بھائی — سباس گل — ناولٹ

222 جب پیار کی رت بدلے — عابدہ سین — سلسلے وار

256 دنیائے رنگ و نور — سلمیٰ آغا

257 دلچسپ عجیب و غریب

259 ریشم کا باورچی خانہ — ہما نواب خان
261 رنگ میں بھنگ — انجم انصار
265 رنگ خیال — شاہ روم خان ولی
269 ریشمی سندیسے
270 آپ کے روبرو — منتہا جاوید آرائیں — ریما نور رضوان
276 روحانی معالج
277 خود کلامی — حمیرا وحید
279 آپ کے اوراق — عبداللہ مسرور
283 باتیں صحت کی — ڈاکٹر اظہر سعید
284 بی بی کی بیوٹی ٹپس — کشائش مسرور
286 شخصیت
288 خواص نیم
289 رنگ سخن — شاہ روم خان ولی
291 لائبریری رپورٹ — مجید احمد جائی
293 ضرورت ہے ایک ''میخ گارڈریکولا'' کی — بشریٰ مسرور

حمد باری تعالیٰ

اللہ تیری شان بڑی ہے
تو ذات مہربان بڑی ہے
تری ہے یہ سب بڑائی
تیری ہے یہ سب خدائی
تو نے علم و ہنر سکھائے
بھولی باتیں یاد دلائے
تو کام آئے ناداروں کے
پردے رکھے تاجداروں کے
تو ہے پھول بہاروں میں
تو ہے شوخ نظاروں میں
بنائی تو نے لاکھ سوغاتیں
بنائے تو نے دن اور راتیں
بنایا دنیا والا جھولا
تو ہی تو ہے ہر فن مولا

(ظفر محمود انجم، راجہ جنگ)

نعت رسول مقبول ﷺ

سبق وحدانیت کا محمدؐ کے در سے ملتا ہے
شعور مرکز کعبہ اسی محور سے ملتا ہے
درودوں کی صدائیں آنسوؤں کی جھلمٹ میں
محبت کا کوئی منظر کب اس منظر سے ملتا ہے
محمدؐ کے قدموں کی مٹی ہی کرے ہے مندمل اس کو
دلوں کو زخم جو بھی وقت کے خنجر سے ملتا ہے
یہ کن رستوں سے تم الجھے ہو ہجر کے مارو
پتا شہر محمدؐ کا روح کے اندر سے ملتا ہے
ہزاروں ساغروں کی گردش پیہم پہ بھاری ہے
دو اک ساغر ہمیں جو ساقی کوثرؐ سے ملتا ہے
یہ سنگِ اسود کعبہ بظاہر ایک پتھر ہے
ترے ہونٹوں کا لیکن لمس اسی پتھر سے ملتا ہے
نیّرؔ اس دست گوہر بار کی ہم کیا کہیں خوبی
گدا کو رتبہ شاہی اسی کے در سے ملتا ہے

(امان اللہ نیّرؔ شوکت، لاہور کینٹ)

سالانہ ممبر شپ فارم

ماہنامہ ریشم ڈائجسٹ

کی سالانہ خریداری
پر زبردست رعایت

-/380 روپے کی یقینی بچت

اگر آپ کے گردوپیش میں ماہنامہ ریشم کا کوئی ایجنٹ موجود نہیں تو فکرمند ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ ہم آپ کو ریشم ڈائجسٹ کے تمام شمارے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک بھیجیں گے۔

12 شماروں کی قیمت	ڈاک خرچ	کل رقم	بچت	سالانہ قیمت
720/-	360/-	1080/-	380/-	700/-

برائے مہربانی یہ فارم پُر کرنے کے بعد ایک لفافے میں بند کر کے سرکولیشن منیجر ماہنامہ ریشم ڈائجسٹ کو نیچے دیئے گئے پتہ پر ارسال کر دیجئے۔ (شکریہ)

نام _____

پتہ _____

_____

فون نمبر _____ موبائل نمبر _____

میں ریشم ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار ماہ ..... سے بذریعہ ڈاک بننا چاہتا ہوں اور Rs..... کا منی آرڈر / بینک ڈرافٹ "Monthly Raysham" کے نام ارسال کر رہا ہوں۔

Suite#1, 4th Floor, Block No.12 Mian Chambers, 3-Temple Road, Lahore
Ph (042) 36280130 Email: Rayshamdigest@gmail.com

ماہنامہ ریشم ڈائجسٹ

دین اور دنیا

غمِ حسین علیہ السلام اور فضائل اہل بیت

کثرت کے ساتھ ذکرِ حسین کرنا محبت کی علامت ہے۔ کوئی اگر یہ کہے کہ سارا دن ساری رات نعت خوانی کی، ذکرِ حسین کیا تو یہ کون سی عبادت ہے۔ اِس کا جواب نہایت سادہ ہے کہ یہ ہم نے نہیں کہا کہ یہ عبادت ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ اور حسین رضی اللہ عنہ کے ذکر کو اپنی عبادت یعنی نماز کا حصہ بنا دیا۔ فرمایا: یوں کہو: ''اے نبی! آپ پر سلام ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکات ہوں۔'' نماز میں حضور ﷺ کا سلام رکھ دیا، اور نماز کے آخر میں آلِ نبی پر صلاۃ پڑھنے کا حکم دیا: کہ ''اے اللہ! تو حضرت محمد (ﷺ) پر اور محمد (ﷺ) کی آل پر رحمتیں نازل فرما۔'' یعنی حضور ﷺ اور آپ ﷺ کی آل پر درود نماز کے برتن میں سجا دیے گئے۔ اِسی لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ اُمور نماز نہیں بلکہ ذِکر فی الصلوٰۃ ہیں۔ نماز عمل اور عبادت ہے اور آلِ رسول ﷺ کا ذکر محبت ہے۔

بعض لوگ اِس پر اِعتراض کرتے ہیں کہ اُمت کربلا پر سوگ وار کیوں ہے، ذِکرِ حسین کیوں ہوتا ہے؟ واقعہ کربلا کو بیتے ہوئے چودہ صدیاں ہوگئی ہیں، اب غمِ حسین میں رونے کا کیا تک ہے؟ یہ صرف مطالعہ کی کمی ہے جو فریقین میں تفرقہ پروری کو ہوا دیتی ہے۔ یہ اَمر افسوس ناک ہے کہ بدقسمتی سے ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو نادانی میں یہ کہتے ہیں: کیا غمِ حسین میں رونا چاہیے؟ حالاں کہ امام حسین علیہ السلام کی اذیت حضور نبی اکرم ﷺ کی اذیت ہے اور ان سے محبت حضور ﷺ سے محبت ہے، ان کا ذکر آپ ﷺ کا ذکر ہے اور ان کا غم مصطفیٰ ﷺ کا غم ہے۔ اور یہ خالق کائنات کی سنت ہے۔ اِس پر سند کے طور پر کئی قرآنی واقعات بیان کیے جا سکتے ہیں۔ یہاں اِختصار کے پیشِ نظر حضرت مریم علیہا السلام کا واقعہ درج کیا

جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ان کا دردِ زہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''پھر دردِ زہ انہیں ایک کھجور کے تنے کی طرف لے آیا، وہ (پریشانی کے عالم میں) کہنے لگیں: اے کاش! میں پہلے سے مرگئی ہوتی اور بالکل بھولی بسری ہوچکی ہوتی'' (مریم، ۱۹:۲۳)

جو لوگ فرعون کا ذکر کرتے ہیں، نمرود کا ذکر کرتے ہیں، قارون کا ذکر کرتے ہیں مگر اہل بیت اَطہار کا ذکر کیا جائے تو انگشت طعن دراز کرتے ہیں۔ اُنہیں مندرجہ بالا آیت پر غور کرنا چاہیے۔ وہ جب یہ کہتے ہیں کہ سیدنا حسین علیہ السلام اور سیدہ زینب علیہا السلام کے ذکر سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ ان کے لیے عرض ہے ان نفوسِ قدسیہ کے ذکر سے وہی حاصل ہوتا ہے جو سیدہ مریم علیہا السلام کی دردِ زہ کا ذکر کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ سیدہ مریم علیہا السلام کی کیفیت اور شدتِ درد کے جملے سے حلال و حرام کا کوئی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے نہ فرائض و واجبات ثابت ہوتے ہیں، اور نہ شریعت کی سُنن و اَحکام صادِر ہوتے ہیں۔ ان معترضین کے لیے تو بس یہی کہا جا سکتا ہے: ''جس کو جس سے جتنا پیار ہوتا ہے اُسی قدر اُسے یاد کرتا ہے۔''

اللہ کے ہاں یہ سارا واقعہ صرف محبوبوں کا ذکر ہے، ان کی تکالیف اور غم کا اِظہار ہے۔ لہٰذا جب صدیوں بعد اپنے حبیب، مکرم ﷺ پر نازل ہونے والے قرآن میں اپنی محبوب بندی کا ذکر کرکے قرآن حکیم کا حصہ بنا دیا کہ جس کی تلاوت پر نیکیاں بھی ملتی ہیں، تو اپنے مصطفیٰ ﷺ کے لاڈلوں اور اُن کے رنج و غم کا ذکر اللہ کے ہاں کیوں نہیں ہوتا ہوگا۔

اَحادیثِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کو راضی کرنے کے لیے اور قلب و باطن میں کیفیت، سوختگی اور شکستگی پیدا کرنے کے لیے رِقت و بکا کی تعلیم بھی ملتی ہے۔ امام بیہقی اور امام دیلمی روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میں تم پر سورۃ التکاثر کی تلاوت کرتا ہوں۔ پس جو روئے گا وہ جنت میں جائے گا۔'' اِس پر بعض صحابہ کرام رو پڑے، اور بعضوں کو رونا نہیں آیا۔ اُنہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ ہم روئیں لیکن ہمیں رونا نہیں آیا۔'' اِس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمہارے اوپر دوسری بار (سورۃ التکاثر کی) تلاوت کرتا ہوں، پس جو روئے گا وہ جنت میں جائے گا۔ تاہم جسے کوشش کے باوجود رونا نہ آئے اُسے چاہیے کہ اپنی شکل ہی رونے والی بنا لے۔''

یہ حدیث مبارکہ خوفِ قبر سے رونے کا درس دیتی ہے۔ اب سیدنا عمر فاروق اَعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ دیکھتے ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اتنے جری، ثابت قدم، مضبوط اَعصاب کے مالک، اِنتظام و اِنصرام اور پختگی حکم میں سب سے اَعلیٰ تھے کہ ان کے دور میں کوئی مرد سونے کی انگوٹھی پہن کر مدینہ میں نہیں چل سکتا تھا۔ ایک طرف شخصیت کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف امام ابن ابی شیبہ اور امام بیہقی روایت کرتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب اپنے اَوراد و وظائف میں کسی ایسی آیت کی تلاوت کرتے جس میں واقعاتِ عبرت اور خوف و غم کی کیفیت ہوتی تو آپ پر اتنی رِقت طاری ہوتی کہ بے ہوش ہو کر گر پڑتے، دو دو دن تک گھر میں پڑے رہتے اور آپ کی اِس طرح عیادت کی جاتی جس طرح کسی مریض کی عیادت کی جاتی ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ)

اب رہ گیا یہ سوال کہ غم حسین میں رونا کیسا ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ پہلے سب عرفا و صلحا، اولیا، عشاق غم حسین میں روتے تھے۔ عصر حاضر میں جوں جوں مادیت بڑھتی گئی دل کی وادیاں بھی خشک ہوگئیں، روح کے سُوتے خشک ہوگئے اور آنکھیں بھی خشک ہوگئیں۔ قرآن و سنت اور آثارِ صحابہ سے ماخوذ یہ چند واقعات ثابت کرتے ہیں کہ غم پر رونا ایک شرعی اَمر ہے۔ ایسے اُمور پر اِعتراض اُس وقت وارِد ہوتا ہے جب دل کسی کی محبت سے خالی ہو، اور جب دل کسی کی

محبت سے لبریز ہو تو پھر من کے اندر سے جواب مل جاتا ہے۔ اِس کی وضاحت کئی روایات سے ہوتی ہے جن میں حسنین کریمین علیہما السلام کے فضائل و مناقب وارِد ہوئے ہیں۔

حضرت ابو سعید خدری ﷺ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''حسن اور حسین جنتی جوانوں کے سردار ہیں۔'' (جامع ترمذی)

جامع ترمذی میں ہی ایک اور حدیث ہے جسے حضرت حذیفہ ﷺ روایت کرتے ہیں کہ آقا ﷺ نے فرمایا: ''یہ ایک فرشتہ ہے جو آج رات سے پہلے کبھی زمین پر نہیں اترا، اس نے اپنے رب سے اجازت مانگی تاکہ مجھے سلام کرے اور یہ خوش خبری دینے حاضر ہوا ہے کہ فاطمہ جنتی عورتوں کی سردار ہیں، اور حسن و حسین جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں۔''

یہی حدیث حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے بھی ان الفاظ میں مروی ہے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''آسمان کے ایک فرشتے نے (اس سے پہلے) میری زیارت کبھی نہیں کی تھی، اس نے میری زیارت کے لیے اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کی اور مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ حسن اور حسین تمام جنتی جوانوں کے سردار ہیں۔''

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ آقا علیہ السلام نے فرمایا: ''جس نے حسن اور حسین علیہما السلام سے محبت کی، اس نے درحقیقت مجھ ہی سے محبت کی اور جس نے حسن اور حسین سے بغض رکھا اس نے مجھ ہی سے بغض رکھا۔''

حضرت انس بن مالک ﷺ فرماتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا گیا: آپ کو اپنے اہل بیت میں سے سب سے زیادہ کون محبوب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: حسن اور حسین۔ آپ ﷺ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا سے فرمایا کرتے تھے کہ میرے بیٹوں کو بلاؤ۔ پھر آپ ﷺ انہیں چومتے اور انہیں اپنے ساتھ لپٹا لیتے۔ (جامع ترمذی)

''حضرت علی ﷺ روایت کرتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام سینہ سے سر تک حضور نبی اکرم ﷺ کی کامل شبیہ ہیں اور امام حسین علیہ السلام سینہ سے نیچے پاؤں تک حضور نبی اکرم ﷺ کی کامل شبیہ ہیں۔'' (جامع ترمذی)

''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں حضور نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا تو آپ ﷺ چار ٹانگوں (گھٹنوں اور دونوں ہاتھوں کے بل) پر چل رہے تھے اور آپ ﷺ کی پشت مبارک پر حسنین کریمین علیہما السلام سوار تھے اور آپ ﷺ فرما رہے تھے: تمہارا اونٹ کیا خوب اونٹ ہے اور تم دونوں کیا خوب سوار ہو۔'' (طبرانی، المعجم الکبیر)

حضرت علی بن ابی طالب ﷺ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت حسن اور حسین علیہما السلام کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: جس نے مجھ سے اور ان دونوں سے محبت کی اور ان کے والد سے اور ان کی والدہ سے محبت کی وہ قیامت کے دن میرے ساتھ میرے ہی درجہ میں ہوگا۔ (جامع ترمذی)

حضرت علی ﷺ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میں، فاطمہ، حسن، حسین اور جو ہم سے محبت کرتے ہیں قیامت کے دن ایک ہی مقام پر جمع ہوں گے، ہمارا کھانا پینا بھی اکٹھا ہوگا تاآنکہ لوگ (حساب و کتاب کے بعد) جدا جدا کر دیے جائیں گے۔ (طبرانی، المعجم الکبیر)

حضرت علی ﷺ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے بتایا کہ سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے والے، میں (یعنی حضرت علی ﷺ خود)، فاطمہ، حسن اور حسین ہیں۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! ہم سے محبت کرنے والے کہاں ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: (وہ) تمہارے پیچھے پیچھے (جنت میں داخل ہوں گے)۔ (المستدرک للحاکم)

حضرت سلمان فارسی ﷺ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: حسن اور

حسین میرے بیٹے ہیں، جس نے ان سے محبت کی، اُس نے مجھ سے محبت کی، اور جس نے مجھ سے محبت کی اس سے اللہ ﷻ نے محبت کی اور جس سے اللہ ﷻ نے محبت کی اللہ ﷻ نے اسے جنت میں داخل کر دیا۔ جس نے حسن اور حسین علیہما السلام سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا، اور جس نے مجھ سے بغض رکھا اس پر اللہ ﷻ کا غضب ہوا اور جس پر اللہ ﷻ کا غضب ہوا اللہ ﷻ نے اُسے آگ میں داخل کر دیا۔'' (المستدرک للحاکم)

یہاں محبت کرنے والا بدل گیا۔ جس نے حسن و حسین سے محبت کی اس نے رسولِ خدا ﷺ سے محبت کی اور جس نے رسولِ خدا ﷺ سے محبت کی اس نے اللہ سے محبت کی اور جس سے اللہ نے محبت کی وہ سیدھا جنت میں گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل بیت اور اہل بیت کے محبین وہاں بیٹھ کے کیا کر رہے ہوں گے؟ قیامت کے دن تو حساب کتاب ہوگا، کئی میزان پر ہوں گے اور کئی پل صراط پر ہوں گے۔ یہ سارے اہل بیت کے محبّ آپ ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے مجلس میں کیا کر رہے ہوں گے؟ آقا ﷺ نے فرمایا: ''کھا پی رہے ہوں گے۔'' گویا سب کی قیامت اور اہل بیت کی پکنک ہوگی۔ اس وقت تک کھانا پینا چلے گا جب تک لوگ اپنے حساب و کتاب سے فارغ نہ ہو جائیں۔ آپ اندازہ کریں کہ قیامت اور جنت سب ان کی ہے۔ جس طرح محبت کا یہ رخ ہے اُسی طرح بغض کا بھی۔ یعنی اہل بیت سے بغض رکھنے والا اس درجے میں ہے کہ اللہ اُس سے بغض رکھے گا اور جس سے اللہ بغض رکھے وہ سیدھا دوزخ میں جائے گا۔

حضرت زید بن ارقم ؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین سلام اللہ علیہم سے فرمایا: جس سے تم لڑو گے میری بھی اس سے لڑائی ہوگی، اور جس سے تم صلح کرو گے میری بھی اس سے صلح ہو گی۔'' (جامع ترمذی)

آقا ﷺ کو امام حسین علیہ السلام سے اِس قدر شدید محبت تھی کہ اُن کا رونا بھی آپ ﷺ کو تکلیف دیتا تھا۔ حضرت یزید بن ابو زیاد ؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے باہر تشریف لائے اور سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے گھر کے پاس سے گزرے تو امام حسین علیہ السلام کی رونے کی آواز سنی، آپ ﷺ نے (سیدۂ کائنات سلام اللہ علیہا سے) فرمایا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس کا رونا مجھے تکلیف دیتا ہے۔'' (طبرانی، المعجم الکبیر)

غور کریں! جب آقا علیہ السلام امام حسین ؓ کا رونا برداشت نہ کر سکے تو کربلا میں حسین ؓ کی تکلیف کیسے برداشت کی ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ سیدنا فاروق اعظم ؓ بھی شہید ہوئے، سیدنا عثمان غنی ؓ بھی شہید ہوئے، مولا علی مرتضیٰ ؓ بھی شہید ہوئے - سب اکبرو اعظم شہید ہیں - مگر کسی کی شہادت کے دن کسی کی شہادت گاہ پر نہیں گئے۔ سیدنا عثمان غنی ؓ خود بیان کرتے ہیں کہ جس دن میں نے شہید ہونا تھا، ایک رات قبل آقا علیہ السلام خواب میں تشریف لائے فرمایا: عثمان! آج روزہ رکھ لینا، تمہاری افطاری ہمارے پاس ہوگی۔ گویا جو شہید ہوا وہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں پہنچا اور دوسری طرف یہ عالم کہ اِدھر کربلا میں شہادتیں ہو رہی ہیں اور اُدھر آقا علیہ السلام بنفسِ نفیس آخری شہادت تک میدانِ کربلا میں موجود ہیں۔

یہ تمام آثار و واقعات ثابت کرتے ہیں کہ غمِ حسین میں رونا اور حسنین کریمین کے فضائل و مناقب بیان کرنا عین ایمان ہے۔ لہٰذا ہمیں ان نفوسِ قدسیہ کی زندگیوں سے ہدایت لینا چاہیے جس کے لیے وہ قربان ہوئیں اور ان کے اُسوہ کے مطابق اپنی زندگیاں بسر کرنی چاہئیں۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

مجھ سے ملیے میں ہوں کاشی چوہان

ممتاز احمد

کاشی چوہان ایک بلند ہمت، ولولہ انگیز اور جرأت مند انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی بہت سی ادبی اور فنی خدمات ہیں اور بیک وقت مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔ استاد، ادیب، شاعر، ایڈیٹر اور ٹی وی ایکٹر کاشی چوہان نے ریشم ڈائجسٹ کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا.....

سوال: آپ کا اصل اور پورا نام؟

جواب: محمد کاشف چوہان

سوال: کس شہر میں پیدا ہوئے؟

جواب: کراچی میں۔

سوال: آپ کی عمر کتنی ہے؟

جواب: جو لوگ شوبز سے ریلیٹ ہو جاتے ہیں ان کی عمر ہمیشہ انڈر 20 یا انڈر 30 رہتی ہے۔

سوال: آپ کی تعلیم کتنی ہے؟

جواب: اردو میں ماسٹرز، بی ایڈ، ایم ایڈ

سوال: آپ کا تعلق کس فیملی سے ہے؟

جواب: کافی معزز اور شریف فیملی سے ہے۔ (ہا ہا ہا .....)

سوال: اپنی فیملی کے بارے میں کچھ تفصیل سے بتائیں؟

جواب: میرے دادا شملہ (انڈیا) سے ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ میرے والد پاکستان میں پیدا ہوئے ان کی جنم بھومی بھی کراچی اور میری بھی کراچی ہے۔ والدہ کی پیدائش سیالکوٹ کی ہے مگر صرف تین چار سال کے بعد میرے نانا فیملی سمیت کراچی آ گئے۔ دادا اور نانا دونوں کا تعلق فوج سے رہ چکا ہے۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں چار بہنیں اور دو بھائی۔ میری شادی خالہ زاد سے ہوئی اور لاہور میں ہوئی۔ میرے دو بیٹے ہیں۔

سوال: آپ نے اپنا ادبی اور فنی سفر کب شروع کیا؟

جواب: ادبی سفر تو پیدا ہونے کے بعد اس وقت سے شروع ہوا جب مجھے جناح ہسپتال کی سب سے بڑی ڈاکٹر نے گود میں اٹھایا اور میرے والد سے کہا آپ نے ہم سے جھوٹ کیوں کہا کہ آپ کی شادی خاندان میں ہوئی ہے۔ آپ پنجابی ہیں اور آپ کی وائف اور یہ بیٹا پٹھان ہیں اور میں شاید بہت زور سے مسکرایا تھا۔ یعنی دنیا میں آتے ہی پہلی کہانی کا آغاز ہو گیا تھا۔ باقاعدہ طور پر اس سفر کا یاد نہیں میں تیسری کلاس میں تھا جب محلے کی سب سے پڑھی لکھی شخصیت شکیل بھائی کے ہاتھ میں اپنے لکھے ہوئے پانچ صفحات دیئے اور کہا کہ شکیل بھائی یہ پڑھ لیں۔ اس کے بعد شکیل بھائی نے دوسرے دن مجھ سے کہا یہ سب کہاں سے لکھا ہے؟ میں نے اسی وقت کہا کہ میں نے حضور لکھا ہے، میری مس سے جا کر سکول میں پوچھ لیں اور وہ کہانی ایک پودنے اور پودنی کی تھی جو میری امی ہر

دوسرے دن سنایا کرتی تھیں۔ انہوں نے اخبار بھی لاکر دیا جس میں کہانی چھپی تھی مگر وہ میرے ریکارڈ میں محفوظ نہیں رہ سکا کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا مجھے باقاعدہ طور پر ایک ادیب بھی ظاہر ہونا تھا۔ میرے ریکارڈ کے مطابق پہلی شائع شدہ کہانی ''سچی دوستی'' تھی جو کہ ایک مصروف روزنامہ اخبار میں شائع ہوئی میں اس وقت چھٹی کلاس کا طالب علم تھا۔

سوال: اب اپنے فن سفر کے بارے میں بتائیں؟

جواب: فن کے جراثیم حقیقتاً پیدائشی ہی ہیں۔ پی ٹی وی کے یادگار ڈرامے ''مہندی'' سے فن کی دنیا میں قدم رکھا۔ پہلی انٹری اشوپیس سے زیادہ کچھ نہیں تھی مگر ڈرامہ ''مہندی'' کے ڈائریکٹر فلم انڈسٹری کی مایہ ناز شخصیت محمد جاوید افاضل صاحب کے ساتھ گزارے ہوئے دو دن یادگار ہیں۔ شوٹنگ کے دوران میں انہیں بہت قریب سے دیکھا وہ واقعی ایک لازوال شخصیت تھے۔ اس زمانے میں میں نہایت کم عمر تھا اور انہیں سیٹ پر موجود جس بچے پر بہت پیار آرہا تھا وہ میں تھا۔ ڈائریکٹر عارف خان کے ٹیلی پلے پیار تو ایسے ہی ہوتا ہے۔ میں میری انٹری ساتھ آٹھ سیمز میں ہوئی جس سے لوگ مجھے پہچاننے لگے تھے۔ ڈرامے میں اعجاز اسلم اور زینب قیوم ہیرو ہیروئن تھے۔ اس کے علاوہ قاضی واجد صاحب، طاہر صاحبہ، تمنا بیگم اور رابعہ نورین جیسے لیجنڈ اداکاروں کے ساتھ بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد قابل ذکر ڈرامہ ادریس کاوش صاحب کا ''فاقہ، کفن اور جھونپڑی'' جس میں اعتا کیمفر، کنول نذر اور تنویر صادق کے ساتھ بھرپور کام کرنے کا موقع ملا۔ موبائل عید، ریت آنگن اور ہوا، بابل کی دعائیں لیتی جا اور کرائم شو ''ڈھائی منٹ'' جو کہ میری پہچان بنا قابل ذکر ہیں۔

سوال: آپ کی کتنی کتابیں مارکیٹ میں آچکی ہیں اور مستقبل میں کیا پروگرام ہے؟

جواب: شاعری کی کتاب ''اور تم'' شائع ہوچکی ہے اس کے علاوہ ناول ''زہر عشق'' اور افسانوں اور نظموں کا مجموعہ زیر طبع ہیں۔

سوال: اپنی ڈیلی روٹین کے بارے میں بتائیں کب سوتے ہیں، کب اٹھتے ہیں اور کن کن مصروفیات میں گزرتا ہے؟

جواب: سونے کا تو مجھے نہیں پتہ ہاں مگر اٹھنے کا ضرور پتہ ہے۔ میں روزانہ صبح فجر کے وقت بیدار ہو جاتا ہوں۔

نماز کے بعد سکول کی تیاری، ناشتہ اور ساڑھے چھ بجے سکول کے لیے گھر سے روانہ ہو جاتا ہوں۔ ایک بجے سکول سے واپسی، دو بجے بچوں کو سکول سے لے کر آنا، تین بجے آفس کے لیے نکل جانا۔ واپسی کا کچھ پتہ نہیں کہ واپسی کب ہو گی۔ دس سال تک بطور ایڈیٹر سچی کہانیاں اور دوشیزہ میں اپنے فرائض سرانجام دیئے۔

سوال: فیملی میں زیادہ محبت کس سے ہے؟

جواب: اپنی ماں سے۔

سوال: آپ کا پسندیدہ رنگ؟

جواب: سرخ اور سیاہ رنگ

سوال: فنکشنز پہ جانا کیسا لگتا ہے۔ شوق سے جاتے ہیں یا مجبوری سے؟

جواب: مجھے تقریبات پر جانا قطعاً پسند نہیں۔

سوال: دوستی سوچ سمجھ کر کرتے ہیں یا بنا سوچے سمجھے؟

جواب: دوستی بنا سوچے سمجھے ہی ہوتی ہے اور اکثر خمیازے بھگتنا پڑتے ہیں مگر کیا کریں انسان کا خمیر ہی ایسا ہے محبت سے بات کرنے والا ہر شخص ہمیں اپنا سا محسوس ہوتا ہے۔ مگر اب یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ہر کسی کو دوست بنا لینا ایک ''انسان'' کی پہچان ہے مگر انسانوں ہی کے اندر ایک صفت شیطان کی بھی ہے اور شیطان کا کام دوست بن کر اپنے مفادات کے حصول کے لیے بھائی بن کر پیٹھ پیچھے چھرا گھونپنا ہوتا ہے۔

سوال: بہترین دوست کا نام؟

جواب: اظہر حسیب

سوال: میوزک سے کس حد تک دلچسپی ہے؟

جواب: موسیقی زندگی ہے۔ 90-80 کی دہائی کا لالی وڈ اور بالی وڈ کا میوزک امر ہے۔

سوال: پسندیدہ گلوکار، گلوکارہ؟

جواب: نیئر نور، مہ ناز بیگم اور ملکہ ترنم نور جہاں اس کے علاوہ لتا جی، آشا جی اور الکا جی کا کیا کہنا۔

سوال: پسندیدہ ایکٹر؟

جواب: شان اور عامر خان

سوال: پسندیدہ ایکٹریس؟

جواب: سری دیوی، مدیحہ شاہ اور بابرہ شریف

سوال: غصہ کم آتا ہے یا زیادہ؟

جواب: غصہ بہت کم آتا ہے لیکن آتا ہے تو کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں آپ کی سب سے اچھی عادت کون سی ہے؟

جواب:

میں محبت ہوں مجھے آتا ہے ہر غم کا علاج
تم ہر ایک شخص کے سینے میں میرا دل رکھ دو

سوال: اور بری عادت؟

جواب: بری عادت دوسروں پر بہت جلد بھروسہ کر لینا۔

سوال: پسندیدہ مصنف؟

جواب: لیجنڈ میں سے بانو قدسیہ، کرشن چندر، امریتا پریتم، انتظار حسین، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، بشریٰ رحمٰن، ایم اے راحت اور آج کی بات کریں تو جاوید راہی، احمد سجاد بابر، اقبال بانو، میری استاد محترم رفت سراج صاحبہ، فرزانہ آغا، دلشاد نسیم، سائرہ غلام نبی، غزالہ رشید ایڈیسن اور لیس مسیح اور حمیرا احمد اس کے علاوہ دس سال بطور ایڈیٹر کام کیا جو مصنفین ابھر کر سامنے آئے ان میں ممتاز احمد، ارم ناز، حنا بشریٰ، ثمینہ طاہر بٹ، افتخار چوہدری، وقاص حسین، حمیرا خان، رئیسہ خالد اور سید ملازم حسین شیرازی، فوزیہ احسان رانا اور ام مریم

سوال: کسی شخص سے پہلی ملاقات میں کس چیز کا اندازہ لگاتے ہیں؟

جواب: کبھی سوچا ہی نہیں۔ جب کوئی شخص ملنے آتا ہے تو ذہن میں ایک ہی بات ہوتی ہے کہ وہ محبت کرتا ہے اس لیے وقت نکال کر ملنے آیا ہے۔

سوال: گھر سے جاتے ہوئے کیا چیز لازمی ساتھ رکھتے ہیں؟

جواب: گھر سے جاتے ہوئے میرے ساتھ موبائل فون، اے ٹی ایم کارڈ، گلاسز اور باڈی سپرے ہمیشہ ساتھ ہوتے ہیں۔

سوال: فارغ وقت کے پسندیدہ مشاغل؟

جواب: میری زندگی میں فراغت نام کی چڑیا شاید بچپن ہی میں پھر سے اڑ گئی تھی۔

سوال: اگر آپ کو ایک دن کی حکومت ملے تو کون سا کام کرنا چاہیں گے؟

جواب: جو حکمران 70 سال میں نہیں کر سکے ایک دن کا حکمران کیا کرے گا۔

سوال: اپنی شخصیت کو تین لفظوں میں بیان کریں؟

جواب: پیور فل، شدت پسند اور حقیقت پسند

سوال: دولت اہم ہے یا رشتے؟

جواب: رشتے

سوال: پسندیدہ شخصیت؟

جواب: ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سوال: پسندیدہ شاعر؟

جواب: فیض احمد فیض، گلزار اور حبیب جالب

سوال: پسندیدہ کالم نگار؟

جواب: جاوید چوہدری

سوال: پسندیدہ پھل اور خوشبو؟

جواب: کھجور اور ون مین شو

سوال: کھانے میں کیا چیز پسند ہے؟

جواب: جو بھی کھانا اچھا بنے۔

سوال: دعا میں اللہ تعالیٰ سے کیا مانگتے ہیں؟

جواب: اپنے ماں باپ اور سب کے لیے سلامتی مانگتا ہوں۔

سوال: مطالعہ کی اہمیت آپ کی نظر میں؟

جواب: مطالعہ آگہی ہے مطالعہ استاد ہے۔

سوال: پاکستان کے لیے آپ کے جذبات؟

جواب: پاکستان ہے تو میں بھی ہوں۔

سوال: انٹرنیٹ کے استعمال کے حامی ہیں یا مخالف؟

جواب: آج ''انٹرنیٹ'' کا دور ہے۔

سوال: آپ کا وہ رشتہ جو آپ کو سب سے زیادہ

عزیز ہے؟

جواب: راجپوت اپنے ہر رشتے سے پیار کرتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے ماں باپ کے بعد بہن بھائی، میاں بیوی اور جب خود باپ بنے تو باپ کا رشتہ۔

سوال: صبح اٹھتے ہی پہلا کام جو آپ ہمیشہ کرتے ہیں؟

جواب: کلمہ پڑھتے ہی ٹی وی لگا کر قرآن کی تلاوت 75 والیم سے سنتا ہوں۔

سوال: کامیابی کا سہرا کس کے سر جاتا ہے؟

جواب: میری پوری فیملی کے سر جاتا ہے۔ ماں باپ نے میرے کسی بھی عمل کو غیر سنجیدہ نہیں لیا میرے متعین کیے ہوئے شعبوں پر میری حوصلہ افزائی کی۔ میری بیوی نے ہمیشہ بھرپور تعاون کیا کبھی بھی وقت نہ دینے کی شکایت نہیں کی۔

سوال: پسندیدہ کتاب؟

جواب: قرآن پاک جس نے خدا کے حکم سے میرا قلب روشن کر دیا۔

سوال: ڈپریشن میں کیا کرتے ہیں؟

جواب: چیخ و پکار یا مکمل خاموشی

سوال: شہرت ایک نشہ ہے کیا؟

جواب: شہرت کا مزہ لینا چاہیے۔

سوال: آپ شاعری ہر موڈ میں کرتے ہیں یا آمد پر منحصر ہے؟

جواب: شاعری میری زندگی ہے۔ زندگی کے لیے جس طرح آکسیجن بہت ضروری ہوتی ہے اسی طرح میری زندگی میں شاعری ہے۔

سوال: خوشگوار لمحات کیسے گزارتے ہیں؟

جواب: میری کوشش ہوتی ہے ہر لمحہ خوشگوار گزرے مگر..... ''زندگی شہد کا گلاس نہیں''

سوال: آپ کا پسندیدہ گانا؟

جواب: تیرے بنا زندگی سے کوئی شکوہ نہیں۔ (فلم آندھی)

میرا کچھ ساماں تمہارے پاس رکھا ہے۔ (فلم اجازت)

سوال: آپ کی پسندیدہ فلم؟

جواب: تیرے بنا کیا جینا، بوبی اور مجاجن (پاکستانی) دل سے، لمحے، ماچس، چاندنی

سوال: قارئین ریشم کے لیے کوئی پیغام؟

جواب: بشریٰ آپی کی وجہ سے ریشم مجھے کبھی اجنبی نہیں لگا۔ یہ بہت اچھا اور خاندان بھر کے لیے زبردست ڈائجسٹ ہے۔ ریشم کے لیے جذبات یہ ہیں کہ 13-4-2013 کو ریشم ایوارڈ تقریب تھی مجھے بلایا گیا تھا تو انتہائی مصروفیت کے باوجود بائی ایئر صبح سات بجے کی فلائٹ سے کراچی سے اسلام آباد آیا تھا اور رات بارہ بجے کی فلائٹ سے واپس کراچی۔ قارئین کے لیے یہی پیغام ہے کاشی چوہان کو محبت دینے والے میرے قاری اور لکھاری ہمیشہ سچ کا ساتھ دیں۔ دل میں یہ یقین رکھ لیں کہ ہمیشہ حق اور سچ کا بول بالا ہوتا ہے۔

☆☆☆

اقوال زریں

☆ سوچو اس کو جو تمہیں سوچتا ہے۔

☆ شکایت کا ترک کرنا صبر ہے۔

☆ تعلیم کا مقصد مثالی انسان کی تکمیل ہے۔

☆ جاہلوں کی صحبت سے پرہیز کرو ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں اپنے جیسا بنا لیں۔

☆ علم مومن کی میراث ہے یہ گم شدہ دولت جہاں سے بھی ملے لے لو۔

(حافظ عمر، لاہور)

نوک جھونک

محمد طلحہ مسرور

عرشیہ اقبال، فیصل آباد

سوال: میرے سوال کا جواب ایسے دیں کہ محاورے کے جواب میں محاورہ آئے۔

''ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور'' یہ محاورہ کن لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے؟

جواب: ''بغل میں چھری، منہ پہ رام رام'' جن لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے۔

صالحہ عزیز، کراچی

سوال: سنا ہے کہ آپ نوک جھونک چھوڑ کر جا رہے ہو؟

جواب: آپ نے ہی تو اتنا اصرار کیا تھا کہ اس کالم کو چند ماہ کے لیے آپ کے حوالے کر دیا جائے تاکہ آپ کرارے جوابات دے کر اپنے ''جاننے والوں'' سے بدلہ لے سکیں۔ ''ویسے سنی سنائی باتوں پر اعتبار نہ کیا کریں صالحہ باجی''

سوال: اگر آپ کو ریشم کا ایڈیٹر بنا دیا جائے تو سب سے پہلے کس کی تحریر لگاؤ گے؟

جواب: آپ کی ہی لگا دوں گا۔ کیا یاد کریں گی آپ بھی۔

ثمینہ کنول، ڈسکہ

سوال: ہر ماں کو اپنے چاند کے لیے چندا سی لڑکی کی تلاش رہتی ہے۔ یہ بتائیے کہ ستارے کہاں جائیں؟

جواب: وہ گانا گائیں۔ ''ستارو! تم تو سو جاؤ، پریشان رات ساری ہے۔'' اور انتظار کریں کوئی تو ستاروں پر کمند ڈالنے آ ہی جائے گا۔

افشاں قریشی، کراچی

سوال: گرمیوں میں کی جانے والی شادیوں کا کوئی ایک نقصان تو بتائیں؟

جواب: دلہن کا میک اپ جلدی پگھل جاتا ہے اور شادی پر پکنے والی سالن اور بریانی کی دیگیں جلدی خراب ہو جاتی ہیں۔

ریشم رفیق، سی

سوال: میں ''ان'' سے منہ دکھائی میں انگوٹھی لوں یا موبائل؟

جواب: انگوٹھی کی فرمائش کرنے کے لیے موبائل پہلے ہی ہتھیا لیں۔ (موبائل ملے گا تو فرمائش کریں گی ناں)

آسیہ، بہاولپور

سوال: میں بہت ''ڈر'' جاتی ہوں۔ بھلا کس سے؟

جواب: آئینے میں اپنی بغیر میک اپ صورت سے۔

سعد اللہ خان، پشاور

سوال: وہ اتنی کم عقل ہے کہ.....؟

طلحہ بھائی مکمل کریں۔

جواب: آپ نے اسے سینما لے جانے کو بلایا اور وہ ساتھ اپنی ''اماں'' کو بھی لے آئی۔

سدرہ حسن، جڑانوالہ

سوال: آپ کی اس خوب صورت مسکراہٹ کا راز؟

جواب: آپ کے اوٹ پٹانگ سوالات۔

★★★★★★

سلمیٰ سلیم، دھڑکی، سندھ

سوال: چپ چپ کھڑے ہو، ضرور کوئی بات ہے؟

جواب: آپ جو ساتھ کھڑی ہیں باتیں کرنے کی مشین..... آپ کے آگے کوئی بول سکتا ہے بھلا۔

★★★★★★

حمیرا طلعت، کینیڈا

سوال: عورت اک گلاب کا پھول ہوتی ہے تو شادی کے بعد گوبھی کا پھول کیوں بن جاتی ہے؟

جواب: تاکہ شوہر کو ''بادی'' کی بیماری میں مبتلا رکھے۔

★★★★★★

محمد عمر یاسین، ساہیوال

سوال: میرا یہی ایک دل ہے۔ یہ اگر کسی ''ایک'' کو دے دیا تو باقیوں کو کیا دوں گا؟

جواب: دلاسہ (کسی کو دل تو کسی کو دلاسہ)

★★★★★★

ریحان الطاف، لاہور

سوال: میں اکثر بھول جاتا ہوں۔ بھلا کیا؟

جواب: بیگم کی اماں کے لیے پان لے جانا۔

★★★★★★

رحیم راشد، ملتان

سوال: دھو بالا اور دلیپ کمار کی شادی کیوں نہیں ہو سکی تھی بھلا؟

جواب: تم جو تھے اس زمانے میں چاچا کیدو کا کردار ادا کرنے کے لیے۔

★★★★★★

شکیلہ آرزو، کراچی

سوال: وہ پہلے مجھے دیکھ کر ہنستے تھے اب.....؟

جواب: اب تو رو بھی نہیں سکتے بے چارے۔

★★★★★★

عائشہ اختر، خانیوال

سوال: بادل سے بادل ٹکرائے تو گرج پیدا ہوتی ہے اور دل سے دل ٹکرائے تو؟

جواب: کبھی بینڈ باجے بجتے ہیں اور کبھی جوتے برستے ہیں۔ (اپنی اپنی قسمت کی بات ہے)

★★★★★★

فری نیاز، لاہور

سوال: میرے میاں مجھے ہر وقت آنکھیں کیوں دکھاتے رہتے ہیں؟

جواب: آپ ہر وقت اپنی من مانی کرتی ہیں اور ان کی ایک نہیں چلنے دیتیں اس لیے۔

★★★★★★

پرنس افضل شاہین، بہاولنگر

سوال: آج کل کے عاشقوں میں وفا کیوں نہیں ہوتی؟

جواب: کیوں کہ عاشق عشق کرنے کے لیے ہوتے ہیں، وفا کرنے کے لیے نہیں۔

★★★★★★

ایم اشفاق بٹ، لالہ موسیٰ

سوال: برسات کی اندھیری رات ہو اور لائٹ غائب ہو، دل انجانے خدشوں سے لرز رہا ہو تو ایسے میں بھلا کون پاس ہو؟

جواب: آپ کا پستول.....!

★★★★★★

حمیرا وحید، واہ کینٹ

سوال: زندگی کیا ہے؟

جواب: محبت کرنے والوں کے لیے روگ اور شادی شدہ لوگوں کے لیے محض نوک جھونک۔

★★★★★★

ریشمی دنیا کے ریشمی ستارو!

سلام خلوص!

امید ہے کہ آپ سب بخیر و عافیت ہوں گے۔ سب سے پہلے تو جو لوگ کافی عرصہ بعد دوبارہ لوٹ کر ہماری اس پیاری محفل کا حصہ بنے ہیں۔ انہیں ہمارا بھرپور ''خوش آمدید'' قبول ہو۔ پروین شاکر کے مطابق:

وہ جہاں بھی گیا، لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی

اور مصروفیت چاہے کتنی ہی کیوں نہ ہو مگر اپنے پیارے دوستوں اور پرانے ساتھیوں کے لیے تو وقت نکالنا ہی پڑتا ہے جیسے کہ ریشم ڈائجسٹ کے بہت سے دیرینہ ساتھی ایسے بھی ہیں جو پہلے شمارے سے لے کر اب تک ہمارے ساتھ ہیں اور ہر ماہ اس ریشمی محفل میں دستک دینے کے لیے حاضر ضرور ہوتے ہیں چاہے کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں اور ساری بات ہوتی ہے محبت کی۔ اور جن سے ہمیں محبت ہو، وہاں مصروفیت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، ہمیشہ مصروفیت پر محبت غالب آجاتی ہے اور پھر وقت خود بخود نکل آتا ہے۔

اچھا جناب اب بات کرتے ہیں اپنے کچھ قابل قدر لکھاریوں کی جو ہم سے کچھ ناراض رہتے ہیں کہ ہم ان کی تحریروں کی اشاعت کے لیے خاصا انتظار کراتے ہیں اور ہمارے کچھ لکھاری بہن بھائی ایسے بھی ہیں جو تحریر ارسال کرتے کے ساتھ ہی گویا ہماری کنپٹی پر پستول رکھ لیتے ہیں کہ بھئی ابھی اسی مہینے ہماری تحریریں لگائیے ورنہ ہم آپ سے ناراض.....! تو بھئی بات یہ ہے کہ تقریباً 300 صفحات پر ہم ہر مہینے اپنے تمام رائٹرز کی تحریریں تو نہیں لگا سکتے ناں کہ ہمیں ہر ماہ بے شمار تحریریں موصول ہوتی ہیں اور ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ساری کی ساری ایک ہی بار میں لگا دیں۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی رائٹر دس دس سٹوریز ایک ساتھ بھیج کر ہر ماہ کی اشاعت پر اصرار کرتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ ضد کرتے ہیں کہ ہمارے پندرہ صفحات کے افسانے کو طویل ناول کے طور پر ڈائجسٹ میں جگہ دیجیے۔

بہنو اور بھائیو! یہ سب ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ ہر ڈائجسٹ اور میگزین کی اپنی اپنی پالیسی ہوتی ہے جس کے تحت وہ تحریروں کا انتخاب، لکھاریوں کی درجہ بندی اور معاوضے کا تعین کرتا ہے۔ اور کسی بھی لکھاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس ڈائجسٹ یا رسالے میں لکھتا ہے اس کے اصولوں کی پابندی کرے اور اشاعتی ادارے کے قواعد وضوابط میں اپنی ''ضد'' اور زبردستی سے باز رہے۔ ورنہ جلد یا بدیر ایسے رائٹرز کو بین بھی کیا جا سکتا ہے۔

ریشم ڈائجسٹ کے دروازے ہر معیاری تحریر کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور اچھے رائٹرز کو ہم ہمیشہ خوش آمدید کہتے ہیں۔ اچھے موضوعات اور نت نئے انداز کی اچھی تخلیقات ہمیں بھجواتے رہیے اور باری کے لیے ذرا صبر سے انتظار کیا کیجیے۔ بس ہمیں تو آج یہی کہنا تھا آپ سے۔ اور لیجیے اب ایک نہیں بلکہ کئی دستکیں سنائی دینے لگی ہیں تو دروازہ کھول کر بیٹھک جماتے ہیں اور لگاتے ہیں آپس میں سب گپ شپ.....

☆☆☆

فاطمہ عبدالخالق، فیصل آباد

اسلام علیکم بشریٰ آپا!

عیدالاضحیٰ مبارک..... آپ کی طبیعت کی خرابی کا پڑھا... اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے کاملہ عطا فرمائے اور آپ کو سدا یونہی ہنستا مسکراتا رکھے آمین...

آپ کو ہمارا خط پسند آیا اور ہمیں آپ کا جواب پسند آیا... لیجئے ایک بار پھر سے طویل تبصرہ حاضر خدمت ہے..... دل میں یہ خیال تھا کہ ریشم عید کے بعد ملے گا لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے عید سے پہلے ہی مل گیا، سرورق کی حسینہ نے دل خوش کر دیا اور ہم نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر فٹافٹ پڑھ ڈالا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سب سے پہلے قدم ریشمی دستک کی جانب بڑھائے اور ریشمی دستک نے تو حقیقتاً گھما دیا کیونکہ جولائی اور اگست کے شمارے کی ملی جلی دستک تھی.. میں جو سارا مہینہ یہ سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ پہلی دستک میری ہوگی لیکن نہ پا کر تو سچی دل ہی ٹوٹ سا ہو گیا... پھر ریشم کی سالانہ رپورٹ پڑھ کر دل کے مزید ٹکڑے ہوئے ہائے مقصود احمد بلوچ صاحب ہمارا تذکرہ کرنا تو بھول گئے لیکن جب حواس ذرا بحال ہوئے تو یاد آیا یہ 2016ء کی رپورٹ ہے جبکہ ہمارا ریشم سے ناطہ 2017ء میں جڑا ہے دل کو تسلی دیتے ہوئے واپس اداریے کہ جانب نظریں دوڑائیں آپ کی بات بجا ہے ہم معمولی سے فرق کو سمجھ نہیں پاتے پہلے تو یہ باتیں رشتہ داروں اور تعلقات والوں میں پائی جاتی تھیں اب تو لوگوں کے دل بھی میل سے بھرے ہوتے ہیں۔ جن سے شاید شناسائی بھی نہیں ہوتی لیکن حقیقت میں دل میں میل رکھنے والے اپنا ہی نقصان کرتے ہیں کسی کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے اور پھر ایک وقت آتا ہے جب پچھتاتے ہیں۔

حمد باری تعالیٰ اور نعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے دل کو منور کرتے ہوئے ہم نے دین اور دنیا کو تھام لیا اور قربانی سے متعلق اسلامی معلومات میں اضافہ کیا اس کے بعد بڑھے ہم آرجے کے انٹرویو کی جانب پڑھ کر اچھا لگا۔

'عید تم سے ہے' میں عذرا فردوس نے تین موضوعات پر بیک وقت خوبصورتی سے قلم اٹھاتے ہوئے اس کی عکس بندی کی کہ دل سے بے ساختہ داد نکلی۔ 'وہ سترہ دن' رانا زاہد حسین کی خوبصورت تحریر تھی جسے پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں چونکہ شمارہ عید نمبر اور یوم دفاع نمبر تھا تو عید نمبر کے حوالے سے عذرا جی کی تحریر نمبر ون پر اور یوم دفاع کے حوالے سے رانا زاہد حسین کی مختصر اور مدلل تحریر پہلے نمبر پر ٹھہری..... ریشمی دستک میں جب پڑھا کہ فریدہ جاوید فری، پرنس افضل شاہین کی بیگم کی نند ہیں مطلب کہ افضل صاحب کی بہن ہیں سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ مجھے علم نہیں تھا البتہ فریدہ جی کی تحریر بڑی عید کی بڑی خوشیاں بھی پرنس افضل صاحب کے تبصرے کی طرح چٹ پٹی تھی یہ الگ بات کہ ایک بات سے تھوڑا اختلاف ہے جب اماں کہتی ہے کولڈ ڈرنک کے ساتھ فالسے کا شربت بھی لے آنا.. دونوں ایک ساتھ..... باقی تحریر نے ہونٹوں پر ہنسی بکھیر دی..... ممتاز احمد کی تحریر بھی اچھی تھی انا کے پرچم لہرانے سے کچھ نہیں ملتا بلکہ ہنستے بستے گھر بھی اجڑ جاتے ہیں شکر ہے کہ عاتکہ کو بروقت عقل آ گئی کاش یہ عقل سبھی کو بروقت آ جائے تو معاشرے میں بڑھتی ہوئی طلاق کی شرح کم ہو جائے... مسز نگہت غفار کی تحریر 'اے وطن ہم تیرے مقروض ہیں' ان کی وطن سے محبت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ دل سے بے ساختہ اس خوبصورت تحریر کے لئے داد نکلی ہم واقعی اس ملک کے مقروض ہیں اور یہ قرض دن بدن بڑھتا جا رہا ہے... صباء ایشل صاحبہ کو ریشم میں خوش آمدید ان کی 'البیلی' تحریر واقعی البیلی تھی مرد ذات کو خرم جیسا ہی ہونا چاہئے خواتین کی حفاظت کے لئے جو سینہ تان کر کھڑا ہو سکے۔ صباء ایشل کو خوبصورت تحریر پر اور ریشم میں شامل ہونے پر بے حد مبارکباد امید ہے وہ ایسی ہی خوبصورت اور البیلی تحریریں لکھتی رہیں گی..... نزہت جبیں کی 'سزا' یہ ان کی دوسری تحریر جو میں نے پڑھی ہمیشہ کی طرح شاندار لکھا..... دنیا میں ہر چوتھا مرد بشارت علی جیسا ہے مگر ثریا جیسی صابر عورتیں بہت کم ہوتی ہیں مختصر اور پر اثر تحریر..... ڈاکٹر طارق محمود آکاش کی تحریر 'پتھر کی مورت' نے آنکھوں کو ہی پتھرا دیا، نجانے کیوں ہم ٹھوکر کھا کر ہی کیوں سنبھلتے

ہیں.. مجید احمد جائی کی کہانی 'محبت کا جانشین' کا کردار احمد ہمیشہ یاد رہے گا، یہ پاکستان احمد جیسے نوجوانوں کی شہادت کے خون سے ہی سلامت ہے... جو یہ ضیاء کو پہلی بار پڑھا..... 'بڑی اماں' جیسی خواتین مجھے بالکل پسند نہیں ہے، کیونکہ ہمارا بچپن بھی کسی ایسی ہی ایک رشتہ دار خاتون کی یادگار ہے اللہ مرحومہ کی بخشش فرمائے آمین فاکہہ جیسی لڑکیاں ایسی ہوتی نہیں ہیں بس بنادی جاتی ہیں انہیں ایسا بنانے میں معاشرے کی بڑی اماؤں کا ہاتھ ہوتا ہے اس کھیل میں فاکہہ کا اتنا قصور نہیں ہے کیونکہ بچوں کو جیسے سبق پڑھائے جاتے ہیں وہ وہی سیکھتے ہیں... 'کارپنٹیل پالش' اچھوتی تحریر تھی مجھے بہت پسند آئی۔ ایم حسن نظامی کی 'صحرائے وفا' مجھے عجیب وغریب تحریر لگی اس پر میرا کوئی تبصرہ نہیں۔ محسن علی طاب کا افسانہ بازی گر اچھی کہانی تھی دلاور جیسے دھوکے باز تو جگہ جگہ پھرتے ہیں اللہ ان جیسوں سے سب بہنوں بیٹیوں کو بچائے آمین... ایک بات جو محسوس ہوئی کہ کہانی بہت جلدی ختم کردی اگر تھوڑی اور بڑی ہوتی تو مزا آجاتا... مقصود احمد بلوچ کی 'خانہ بدوش' اور عبدالرووف سمراء کی 'دیہاتی لڑکی' اپنی طرز کی انوکھی کہانیاں تھیں، فہمیدہ غوری کی 'منی' پڑھ کر پہلے تو سمجھ ہی نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن جب آخر تک پہنچے تو سب سمجھ بھی آگیا اور ہنس ہنس کر برا حال بھی ہوا، میں جو اسٹوڈنٹس کو ٹیسٹ دے کر رسالہ پڑھ رہی تھے مجھے یوں ہنستے دیکھ کر بچے بھی ہنسنے لگے... فرح طاہر کی عید قرباں اور ایس امتیاز کی شاید وہ کبھی کہہ دے بھی اچھی کہانیاں تھیں محمد سلیم اختر کی کہانی اس بار بس ٹھیک ہی لگی تھی البتہ آخری شعر مزے کا تھا، عابدہ سبین سے معذرت خواہ ہوں چاہنے کے باوجود بھی میں ان کا ناول شروع نہیں کر پائی میں نے سوچا تھا شروع کروں گی مگر نہیں کر پائی ان شاء اللہ عابدہ سبین جی جلد ہی پڑھ کر تبصرہ کیا جائے گا... رنگ میں بھنگ ہمیشہ کی طرح مزیدار تھا... آپ کے روبرو میں مجید امجد جائی سے مل کر اچھا لگا... ممتاز احمد کے سوال بڑے مزیدار تھے ریما کا آرٹیکل نام کا پہلا حرف پڑھ کر سوچ میں پڑھ گئی... کیونکہ واقعی میرے نام کا پہلا حرف میری بھرپور عکاسی کرتا ہوا پایا... رنگ سخن میں صابر عظیم آبادی سے مل کر اچھا لگا..... رنگ خیال میں گل بخشالوی اور عارف نظیر کا کلام اچھا لگا... ریشمی سندیسے اتنے کم کیوں ہوتے ہیں؟ کوئی ظالم دوست میرے نام بھی سندیسہ بھیج دے... ریشمی مصالحہ عیدالاضحیٰ کی عکاسی کرتے ہوئے میرے منہ میں پانی لے لایا..... آپ کے اوراق میں حمیرا وحید کا بجلی پڑھ کر بے ساختہ ہنسی آئی تھی..... پوچھنا یہ تھا کہ نوک جھونک کے سوال کسے سینڈ کیے جائیں اور رنگ سخن میں شاہ روم ولی ہمیں بھول جاتے ہیں اس میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں ہمارے ہاں ہر دوسرا بندہ شاعر ہے..... ریشم سروے بھی اچھا رہا شکر ہے بشریٰ آپا میرا سروے آپ نے ایک پیج پر کیا ورنہ ہمیشہ آدھا ایک پیج پر ہوتا آدھا دوسرے پیج پر..... خوشی ہوئی سروے میں اپنا نام دیکھ کر..... مجھے محسوس ہو رہا ہیکہ میرا خط لمبا ہوتا جا رہا ہے لیکن جانے سے پہلے ان سب ریشمی رائٹرز کو شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے میری تحریر پڑھ کر اپنی رائے ریشمی دستک کے ذریعے مجھ تک پہنچائی..

مجید احمد جائی، عابدہ سبین، ریما نور رضوان، عنبرین اختر اور زرش آرائیں کی خصوصی طور پر شکر گزار ہوں... اس کے علاوہ میں ان تمام قارئین کی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری اس تحریر کو پڑھ کر مجھ سے رابطہ کیا میں آپ سب قارئین کی محبتوں کی قدر کرتی ہوں..... دعاؤں کی طلبگار

(☆ پیاری فاطمہ عبدالخالق! اتنے خوب صورت اور تفصیلی تبصرے کے لیے آپ کا بے حد شکریہ، آپ کے لیے ہماری بہت ساری دعائیں)

☆☆☆

مجید احمد جائی، ملتان شریف

پیاری آپی بشریٰ مسرور صاحبہ!

مزاج گرامی! اُمید واثق ہے دین اسلام کی پیروی کرتے ہوئے زندگی کے شب و روز بسر کرتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ

صحت وتندرستی کے ساتھ سلامت تا قیامت رکھے۔امن وسلامتی اور خوشیوں بھری زندگی سے لطف اندوز ہونے کے اسباب بنائے رکھے۔دوسروں کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہونے کی استطاعت عطا ہو اور چہروں پر خوشی اور لبوں پر مسکراہٹ کے پھول سجانے کی ہمت، جذبہ ہمہ تن قائم ودائم رہے۔آمین ثم آمین!

ماہ ستمبر 2017 کا ریشم عید الاضحیٰ کی مبارک باد دیتا ہوا موصول ہوا۔سرورق پر دوشیزہ عید کی تیاری کر کے مسکرا رہی تھی۔اب کی بار عید کی خوشیوں کے ساتھ سالگرہ ریشم کے کیک کی خوشیاں بھی ساتھ ساتھ منائی۔کیا ہوا جو کیک اپنی جیب سے خریدا۔ریشم بھی تو اپنا ہی ہے۔اداریہ بشریٰ آپی نے عرق ریزی سے لکھا اور ضمیروں کو جھنجوڑتا ہوا احساس دلاتا ہے کہ خوشیوں میں ان کو بھی شریک کریں جن کو ہم ناراض کر بیٹھے ہیں۔سوچ طلب بات ہے زندگی مختصر سی ہے پھر نفرتوں، ناراضگی کے لیے کیسے وقت نکال لیتے ہیں لوگ۔کیا ہم دین اسلام سے دُور بہت دُور جا رہے ہیں اور صراط مستقیم والے رستے سے بھٹک گئے ہیں۔ممتاز مفتی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو اپنا دوست بنا لو، ہر لمحہ اپنے ساتھ رکھو پھر دیکھو زندگی کے رنگ۔۔۔دوستوں کو کہوں گا کہ ممتاز مفتی کی کتاب ''تلاش'' ضرور پڑھیں۔یہ سطور لکھ رہا ہوں تو شام کے سائے گہرے ہو رہے ہیں اور سوشل میڈیا پر میانمار کے مسلمانوں پر ظلم وتشدد کی ویڈیو اور پوسٹیں دیکھ کر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ایک طرف ترک صدر مکمل حمایت کر رہا ہے تو دوسری طرف پاکستان کی حکومت خاموش ہے۔جانے قفل کیوں لگے ہیں۔تجزیہ نگار چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کم ازکم ایک مذمتی بیان ہی جاری کر دیا جائے۔اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی خیر فرمائے اور دُشمن اسلام کو نیست ونابود کرے آمین! میانمار، فلسطین، کشمیر اور جہاں کہیں بھی مسلمان دُشمنوں کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں ان کو آزادی نصیب فرمائے اور اُن کی غائبی امداد فرمائے جس طرح غزوہ بدر میں امداد فرمائی تھی۔آمین!

حمد باری تعالیٰ امان اللہ نیئر شوکت لے کر آئے اور اُن کی واپسی اچھی لگی۔آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے فون پر بتایا کہ ریشم کے لئے آپ کے جذبے جوان ہیں اور آپ کی کاوشوں کو ہمیشہ سراہتا ہوں۔نعت رسول مقبول ﷺ ریاض ندیم نیازی پیش کر رہے تھے۔آپ کی نعت گوئی دل کے نہاں خانوں کو گرما دیتی ہے۔دین اور دُنیا، ''اسلام میں تصور قربانی'' پڑھ کا جانکاری میں اضافہ ہوا۔مجھ سے ملیئے، میں ہوں آرجے محمد سعید مشتاق، خوبصورت لوگوں سے خوبصورت ملاقات۔ریما نور رضوان ویلڈن۔

ریشمی دستک میں آپی عید مبارک، یوم دفاع، اور ریشم کی سالگرہ کی مبارک باد دے رہی تھیں۔آپی آپ فیس بک اور واٹس ایپ پر کیوں نہیں ہیں۔پہلی دستک طیبہ عنصر مغل خوب رہی۔امان اللہ نیئر شوکت کو پھر سے محفل میں دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔خط کمال کا تھا۔مجید احمد جائی کو درخشاں ستارے کہنے پر ممنون ہوں۔آپ کا لائبریری کے اقدام کو سراہنا میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہے۔اُمید ہے آپ کا ادبی تعاون جاری وساری رہے گا۔مسز نگہت غفار صاحبہ اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک فرمائے۔آپ جیسے ادبی فیملی ستاروں کی دُعائیں ہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کامیابیوں اور کامرانیوں سے نوازتا جا رہا ہے۔الحمدللہ، ادبی لائبریری کا آغاز کر چکا ہوں۔کتاب دوستی کو فروغ دینا میرا مقصد ہے اور آپ کا اور ریشم کا ساتھ تو بہت پرانا ہے۔اللہ کرے یہ ساتھ، سلامت رہیں۔اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں کے سائے تلے ہمیشہ مسکراتا، خوش باش رکھے آمین۔بھائی کی دُعائیں اپنی بہنوں کے لیے ہیں۔فاطمہ عبدالخالق کا باریک بینی سے ریشم کا مطالعہ ان کے خط سے عیاں ہے۔پیاری آپی فریدہ جاوید فری، ایسے کیسے ہو سکتا ہے میں آپ کو بھول جاؤں۔جب آپ سے فون پر بات ہوتی ہے سیروں خون بڑھ جاتا ہے اور دلی دعائیں لبوں پر رقصاں ہوتی ہیں۔صحت کی بادشاہی کے ساتھ سلامت تا قیامت رہیں۔آمین!

اگست کا میرا خط لگانے کا شکریہ۔محسن علی طاب آج کل فیس بک پر نہیں ہو، کیوں بھائی رابطے کم کم کیوں؟ پرنس افضل شاہین، ریشم کے پرانے ساتھی ہیں اور ہمارا دوستانہ تب سے ہے جب سے پرنس صاحب ریشم میں آئے ہیں۔عابدہ سبین

چلیں اب ملتان سے چند ساتھی ریشم میں دِکھنے لگے ہیں۔ ورنہ جنوبی پنجاب سے میں ہی ہر رسالے میں نمائندگی کرتا رہا ہوں۔ ریما نور رضوان ریشم کی ترقی میں اپنا بھرپور کردار نبھا رہی ہیں۔ عنبرین اختر خونی رشتے پسند کرنے کا شکریہ، زرش آرائیں خوش آمدید ریحانہ آفتاب کے خط کے ساتھ ہی ریشمی دستک اختتام پذیر ہوئی۔

افسانوں کی دُنیا میں عذرا فردوس نمایاں کردار ادا کر رہی ہیں۔ بڑی عید کی بڑی خوشیاں، فریدہ جاوید فری نے کمال خوبصورتی سے خوبصورت تحریر ریشم کے قارئین کو دی، بہت نوازش آپی۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو، ممتاز احمد کی انٹری خوب رہی، اچھا ہوا کہ حسن کی خاموشی طوفان برپا کر سکتی تھی اگر حسن کی بیوی سالگرہ کے دن حسن کے گھر نہ جاتی، یہ اس کا اچھا فیصلہ تھا کہ ایک طوفان آنے سے پہلے ہی تھم گیا ورنہ میاں بیوی کی ناراضگی خاندانوں کے سکون برباد کر دیتی ہیں۔ اے وطن ہم تیرے مقروض ہیں، بے شک نگہت غفار نے درست ہی لکھا، یہ وطن ہے تو ہم ہیں، اس وطن کا ہم قرض اتار نہیں سکتے۔ پتھر کی مورت نے رولا دیا۔ گریٹ ڈاکٹر صاحب، محبت کا جانشین کیسی رہی یہ قارئین ہی بتائیں گے، ڈاکٹر طارق محمود کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے انٹرویو اور کہانی کو پسند فرمایا۔ اس کا سہرا ممتاز احمد صاحب کو بھی جاتا ہے جنہوں نے خوبصورت سوالات کیے۔ خانہ بدوش نے متاثر کیا، حج اکبر، ادبی انتخاب زبردست رہا۔ بازی گر نے اچھا تاثر چھوڑا۔ وہ ستر دن، منی، سازش گر، عید قربان، سزا، المیلی، عشق سچا ہے تو زبردست رہیں۔ مقصود احمد بلوچ نے سالانہ ریشمی رپورٹ لکھ کر حق ادا کر دیا۔ بہت خوب، ویلڈن، ریما نور رضوان نے ریشم سالگرہ سروے، نام کا پہلا حرف لکھ کر اپنا لوہا منوایا۔ رنگ و خیال کے انچارج شاہ روم ولی کے گھر اللہ تعالیٰ نے رحمت عطا کی، دلی مبارک باد قبول ہو، اللہ تعالیٰ ہماری بھتیجی کے نصیب اچھا کرے اور لمبی عمر نصیب ہو۔ اس کے علاوہ تمام مستقل سلسلے خوب رہے۔

(☆ اچھے مجید احمد جائی! وٹس اپ اور فیس بک کے لیے ہمیں ٹائم نہیں ملتا۔ خط لکھنے کا شکریہ)

☆☆☆

مسز نگہت غفار، کراچی

بہت پیاری سی بشریٰ جی!

اسلام علیکم:

جیتی رہیں، سلامت رہیں، فیملی سمیت شاد و آباد رہیں (آمین ثم آمین)

بھئی ماشاء اللہ اللہ نظر بد سے بچائے اس ماہ یکم اگست کو رسالہ موصول ہوا اور آج دو اگست کو تبصرہ حاضر ہے۔ 14 اگست کے حوالے سے ٹائٹل بہت پسند آیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے وطن پاکستان کو سدا سلامت، شاد و آباد رکھے۔ کامیاب و کامران رہے اللہ تعالیٰ کی امان میں رہے۔ (آمین ثم آمین)

جب لسٹ میں اپنا افسانہ بلکہ آزادی پر لکھی کہانی نہیں تھی تو دکھ ہوا کہ اس آزادی کے حوالے سے ایک کہانی کے کھونے کے بعد دوسری ارسال کی وہ بھی..... چھوٹی سی پہلی بڑی تھی۔ امید تھی یہ تو شائع ہو جائے گی ایک نظم قائداعظم پر اور ایک وطن پر لکھی وہ بھی ندارد بہر حال..... نہ ناراض ہونا ہے نہ اس محفل کو چھوڑ سکتے ہیں۔ اسی مجبوری نے ہمیں باندھ کر رکھا ہے کہ بشریٰ جیسی بہن اور اتنے سارے پیار کرنے والے عزت دینے والے مان بڑھانے والے پھر کہاں ملیں گے۔ ماشاء اللہ۔ اللہ ان سب کو سدا سلامت اور شاد و آباد رکھے۔ (آمین)

موقع کے حساب سے کہانیاں اچھی لگیں۔ ہمیشہ کی طرح اداریہ قابل تعریف اور سبق آموز تھا بالکل صحیح ہے کہ یہ نظام تب ہی ٹھیک ہوگا جب ہم، ہمارے حکمران دونوں مل کر کوشش کریں گے۔ قصور دونوں کا ہے۔ فرض بھی دونوں کا ہے۔ حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبولؐ دونوں میں ہمیں سبق دیا گیا۔ رب سے مانگنا ہو تو صدق دل کے ساتھ مانگیں۔ ہر حاجت، ہر ضرورت اس مالک سے مانگو۔ رسول پاکؐ کا مقام آپ کی اپنی امت سے وارفتگی اور احسانوں کو پہچاننا بہت ضروری ہے۔

اللہ ہم سب کو یہ توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

دین و دنیا بہت ہی معلوماتی تحریر ہے۔ اچھی اچھی باتیں بتائی جاتی ہیں۔ ہماری بقاء ہماری فلاح کے لیے۔ مجھ سے ملیے میں پیاری سی کبریٰ نوید جن سے پچھلے دنوں ایف بی پر تعارف ہوا۔ بہت ہی پیاری بچی ہے۔ بہت ہی مخلص، مہربان اور دوسروں کے لیے دل میں بہت ہی نرم جذبے رکھنے والی۔ صرف ایف بی پر رسمی گفتگو ہوئی مگر مجھے بہت پیاری لگی۔ اللہ پاک اس کو دائمی خوشیاں اور کامیابیاں نصیب کرے۔ (آمین) نوک جھونک میں ہمیشہ کی طرح اچھے سوال و جواب تھے۔

ریشمی دستک میرا بے حد پسندیدہ، ریشم کی جان و روح پیاری سی محفل جہاں سارے دوست ایک دوسرے کے دکھ درد، خوشی و مسرت میں شامل ہوتے ہیں۔ کہانیوں پر ادر ذاتی امور پر تبصرے ہوتے ہیں۔ جس سے محبت اور انسیت بڑھتی ہے۔

بشریٰ جی ایک بہت ہی چھوٹی سی گزارش ہے کہ پلیز کال ریسیو کرلیا کریں بہت ضروری بات کرنی ہوتی اور آپ کی آواز سنی ہوتی ہے یا پھر میسج کا جواب دے دیا کریں میں مانتی ہوں آپ کی مصروفیت زیادہ ہے اور طبیعت کی خرابی بھی وجہ ہے۔

شاہد سلیم بھائی آپ نے جولائی میں میرے افسانے اور غزل کو پسندیدگی کی سند سے نوازا اللہ رب العزت آپ کو دین و دنیا کی نعمتوں سے نوازے۔ (آمین) اشفاق شاہین بھائی آپ نے میرے خط کو پسند کیا فہد کی شادی کے احوال کو بھی پسند کیا۔ اللہ رب العزت آپ کے ہر قول و فعل کو پسند فرمائے۔ (آمین) مقصود بلوچ بیٹا آپ نے میرا افسانہ اور میری رنگ خیال کی تحریر آپ کو اچھی لگی۔ آپ کی زندگی میں اللہ تعالیٰ آسانیاں پیدا کرے۔ حسن نظامی بیٹا اللہ آپ کو ڈھیروں خوشیاں اور کامیابیاں نصیب کرے۔ آپ نے ہماری ریشم کی ترقی میں جو خدمات انجام دیں۔ اس کو سراہا اسے پسند کیا اور ہمیں اس اعزاز سے نوازا ہمیں بے حد خوشی اور مسرت ہو رہی ہے کہ ہمیں ہماری محنت اور ریاضت کا پھل مل گیا۔ ہمارا یہ بچہ اب بڑوں کی صف میں کھڑا ہو گیا ہے یہ ننھا پودا قد آور درخت بن گیا ہے۔ (ماشاء اللہ)

پرنس افضل شاہین اچھے بھائی آپ کو (آپ کے اوراق میں) میری تحریر اچھی لگی۔ بہت شکریہ آپ کی زندگی نہایت ہی سہل اور بے حد اچھی گزری ہماری بھابی کو خلوص بھرا اسلام کہیے۔ اللہ آپ دونوں کو ڈھیروں خوشیاں نصیب کرے۔ آپ کے گلستان حیات میں خوبصورت مہکتے پھول کھلیں۔ (آمین) ممتاز احمد بیٹا آپ کو میرا افسانہ پسند آیا بہت شکریہ بیٹا سدا سلامت رہو۔ آپ نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں میری (آپ کے اوراق میں) تحریر کو سراہا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ہر کام کو سراہے۔

کہانیاں ریما نور رضوان کی اے وطن تیرے لیے، فاطمہ عبدالخالق تیرے در پر معتبر ٹھہرے، مجید احمد خونی رشتے، ابھی اتنی ہی کہانیاں پڑھیں سب بہت اچھی تھیں۔ رنگ خیال میں میں نہیں تھی۔ شاہ روم، ارشد، گل بخشالوی، ڈاکٹر دانش، خالد مسعود کے خیالات رنگ بکھیر رہے تھے۔ عابدہ سین کا ناول بہت خوبصورتی سے محو سفر ہے۔ خود کلامی میں مقصود احمد، غزالہ جلیل، مسٹر اینڈ مسز افضل شاہین، صابرہ، اشفاق شاہین کے اشعار اور قطعات پسند آئے۔ آپ کے اوراق میں قیامت کے دن، ماں کی نافرمانی کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، ممتاز احمد، پرنس افضل، مقصود احمد، ڈاکٹر طارق محمود، ثمن، تبسم رفیق ان کی تحریریں پسند آئیں۔

پلیز میری طرف سے ڈھیروں دعائیں اللہ تعالیٰ آپ کو، آپ کی فیملی کو ریشم اور ریشم کی فیملی کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ میرے وطن کو سدا سلامت رکھے۔ (آمین)

(☆ پیاری بہن نگہت غفار! آپ کی کہانیاں کچھ تاخیر سے موصول ہوئی ہوں گی یا پھر کہانیاں زیادہ تعداد میں موجود

ہوں گی اسی لیے آپ کو مایوسی ہوئی۔ خیر دل برا نہ کیجیے، جلد باری آجائے گی۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ بڑے دل کی مالک ہیں ہمیں معلوم ہے کہ ناراض نہیں ہوتیں آپ۔ آپ کے لیے بہت سی دعائیں)

☆☆☆

حمیرا وحید، واہ کینٹ

ڈیئر آپی بشریٰ مسرور صاحبہ!

اسلام علیکم:

ریشم سے جڑے تمام افراد کو میری طرف سے دعا وسلام۔ آپی آپ کی جانب سے ریشم ڈائجسٹ ملا بے حد خوشی ہوئی۔ آپ نے میرا افسانہ شائع کیا اس کے لیے آپ کا شکریہ۔ ایک اور افسانہ سلگتا دسمبر ارسال کر رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں آپ کے معیار پر پورا اترا تو آپ ضرور شائع کریں گی۔ میری دعا ہے کہ میرے وطن کا کونہ کونہ خوشیوں سے جگمگا تا رہے۔ اگست کا شمارہ بہت جلد مل گیا۔ حمد ونعت پڑھ کر ایمان کو سرشار کرنے کے بعد آپی جی کا اداریہ پڑھا۔ آپی بہت اچھے طریقے سے یہ بات معاشرے کے تمام افراد کو بتانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ ملک کے حالات کو بہتر کرنے میں ہم سب کا اہم کردار ہوتا ہے۔ ملک میں اچھے حالات پیدا کرنے کے لیے اچھا شہری بننا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بعد اپنی پسندیدہ ریشمی دستک میں آپی کو پایا جو بڑی محبت سے ریشمی دستک میں لیٹر لکھنے کا اصرار کر رہی تھیں۔ ویسے تو تمام لیٹر اچھے تھے جو مجھے زیادہ پسند آئے ان میں مقصود بھائی، اشفاق شاہین، حسن نظامی بھائی، پرنس افضل بھائی شامل ہیں۔

کبریٰ نوید کا انٹرویو اچھا تھا۔ نوک جھونک پڑھنے کا تو اپنا ہی مزا ہے۔ اس دفعہ کہانیوں میں مہنگی آزادی، لہو کا رنگ ایک ہے، سجدہ وطن، بازگشت، خونی رشتے، اچھی کہانیاں تھیں۔ جبکہ امید ابھی باقی ہے، مجرم کون، سبق آموز اور اچھی کہانیاں تھیں۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ ڈاکٹر طارق محمود آکاش بھائی میں سارا رسالہ دیکھنے کے بعد سب سے آخر میں تسلی سے کہانیاں پڑھتی ہوں۔ جس کی وجہ سے کہانیوں پر تبصرہ کم کر پاتی ہوں۔ شاہ رخ خان کو دنیائے رنگ ونور میں پایا ریشم کے بارچی خانہ میں کھجور کے لڈو، آم کا شربت، چکن کریلے، کباب، پوٹیٹو کیک بنانا سیکھا۔ انجم انصار باجی کی تو کیا بات ہے۔ رنگ خیال میں شاعری معیاری تھی۔ میرا ملی نغمہ شائع نہ ہو سکا چلیں کوئی بات نہیں۔ بھائی شاہ روم خان کی محنت نظر آرہی ہے۔ روحانی علاج کو بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ خود کلامی میں اشعار اچھے تھے۔

آپ کے اوراق عبداللہ مسرور نے بہت اچھے طریقے سے ترتیب دیئے۔ پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ باتیں صحت کی پڑھنے کے بعد، اس دفعہ خواص میں آم کے فوائد کے بارے میں جانا۔ موسم کے حوالے سے خوراک کے صحیح استعمال اور بیوٹی ٹپس کے بارے میں جانا۔ رنگ سخن میں عقیل شاہ کی شاعری پڑھنے کو ملی۔ ملی ادبی فاؤنڈیشن پاکستان کے بارے میں جاننے کے بعد جشن آزادی سروے پڑھ کر لکھاریوں کے حالات کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔

غزالہ جلیل راؤ اور نبیلہ نازش راؤ کی والدہ محترمہ صاحبہ کی وفات کا سن کر بے حد افسوس ہوا۔ پرنس افضل بھائی کی ساس کی وفات کا سن کر بھی بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اور ان کی فیملی کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

ان تمام رائٹرز کی مشکور ہوں جو میرے اشعار، لیٹر اور میری تحریر پسند فرما رہے ہیں۔ باجی فریدہ جاوید فری کو اللہ تعالیٰ صحت دے۔ اب اجازت چاہوں گی۔ ہمیشہ خوش رہیں اور دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اللہ حافظ۔

(☆ پیاری حمیرا وحید! خط لکھنے کا بے حد شکریہ)

☆☆☆

فیصل مشتاق، قبولہ شریف

ڈیئر آپی بشریٰ مسرور صاحبہ!

اسلام علیکم:

اس بار عید نمبر 2 اور ساون نمبر ذرا دیر سے ہاتھ لگا۔ مگر کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے بالکل اسی طرح اس بار ڈائجسٹ دیر سے ملا مگر بھرپور، دلچسپ افسانوں، ناولوں، انٹرویو اور شاعری کے ساتھ مزین تھا۔ اس مرتبہ تمام افسانے بہت مزے کے تھے۔ جن میں پاگل سی لڑکی، بدلتا ساون، وہ ٹھنڈی ہوا بہت خوب لگے۔ تمام لکھاریوں نے بہت خوب لکھا۔

عید کے حوالے سے تمام کہانیاں بہت پسند آئیں۔ پرنس افضل شاہین صاحب کا نام پڑھا اور سنا تھا۔ مگر اس مرتبہ ان کا انٹرویو پڑھا اور انہیں دیکھ بھی لیا (تصویروں میں) بے شک بہت اچھے لکھاری اور اچھے انسان ہیں۔ ریما نور رضوان نے کرن عباسی کا بہت خوبصورت انٹرویو لیا۔

ریشمی دستک میں کچھ لوگ موجود تھے تو کچھ غائب تھے۔ ایم حسن نظامی، محمد قاسم خان بلوچ کے خطوط اس بار شامل نہ تھے۔ بلاشبہ ان کے خطوط کو مس کیا۔ مسٹر وکی کو سلام اور خوش آمدید اور ڈاکٹر طارق محمود آکاش نے کہا کہ خطوں میں کمی آ گئی ہے۔ بالکل ٹھیک کہا محفل میں کبھی کوئی غائب ہوتا ہے تو کبھی کوئی۔ اس بات پر تو بشریٰ آپی کو سب کی کلاس لگانی چاہیے۔ (☆ تقریباً ہر بار ہی کلاس ہوتی ہے سب کی)

حسن نظامی کا شعر بہت اچھا لگا۔ آپ کے اوراق میں ڈاکٹر طارق کا لکھا ہوا ''بارش'' بہت عمدہ تھا۔ کرن خان اسی کا افسانہ ''سسرال میں عید'' بہت زبردست تھا ویری گڈ..... اس بار کے تمام افسانے بہت بہت پسند آئے۔ ریشمی دستک کے خطوط پڑھنے میں جتنا مزہ آتا ہے اتنا کہیں نہیں آتا۔ ہر دوست کے خطوط پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے ان سے براہ راست بات ہو رہی ہو۔ ہو بھی کیوں ناں بھئی ہر دوست خط ہی اتنی اپنائیت اور محبت سے لکھتا ہے۔

آپی! آپ کو ایک اور افسانہ ارسال کر رہا ہوں۔ اگر قابل اشاعت ہو اور آپ کو اچھا لگے تو شائع کر دیجئے گا۔ لو جی میرا تبصرہ تو ہو گیا..... اب اگلے شمارے میں تمام دوستوں کے تبصرے اور خطوط کا منتظر رہوں گا۔ سب قارئین کو سلام۔ (☆ سب کی جانب سے وعلیکم السلام)

☆☆☆

ایم حسن نظامی، قبولہ شریف

قابل قدر بشریٰ مسرور صاحبہ!

آداب عرض! سلام مسنون! امید ہے آپ اور سبھی ریشمی قلم کار ساتھی خیر و عافیت سے ہوں گے۔ اگست کا آزادی

لاہور میں ماہنامہ ''ریشم'' آپ تک پہنچانے میں ہمارے معاون اور مددگار

نیئر نیوز ایجنسی اینڈ بکسیلرز

155-N ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور کینٹ

پروپرائٹر: امان اللہ نیئر شوکت: موبائل نمبر: 0336-4173392

نمبر ہاتھوں میں ہے اور اس کی ہر تحریر آزادی کے حوالے سے معیاری اور منفرد ہے۔ ریشم کا نکھار آپ کی بے پناہ کوششوں اور لاتعداد الفتوں کا مرہون منت ہے۔ اس سے بہت سے نئے قارئین میں دلچسپی بڑھ رہی ہے اور پرچہ ترقی کی طرف گامزن ہے۔

آپ کے ہر ماہ کے اداریے میں احباب کے لیے بے پناہ سبق اور نصیحتیں موجود ہوا کرتی ہیں جو کہ خوبصورت لفظوں، فقروں اور محاوروں سے مزین ہوتا ہے۔ حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول سبق آموز اور ردیف قافیے سے مزین پایا۔ جسے پڑھتے ہوئے من کے سبھی گوشے شادمانی سے جھوم اٹھے۔ دین و دنیا میں حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں ایمان افروز مضمون دل کو بہت ہی اچھا لگا۔ آپ کی محبت اور صبر پر دل عش عش کر اٹھا۔ کبریٰ نوید سے ملاقات اچھی لگی۔ انہوں نے بہن ریما نور رضوان کے سوالوں کے جوابات معیاری اور منفرد انداز سے دیئے۔ نوک جھونک شگفتگی اور حساسیت سے بھرپور پایا۔

ریشمی دستک! پرچے کے رائٹرز اور قارئین اپنے عمدہ اور خوبصورت تجزیے لیے حاضر پائے مگر بہت سے احباب غیر حاضر پائے۔ بھئی! سبھی اپنی غیر حاضری کی وجہ بتائیں۔ ریشم سے دوری کیسی.....؟ افضل شاہین صاحب کی ساس صاحبہ کی وفات پر ہم ان کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ فاطمہ عبدالخالق، شاہد سلیم، ذیشان ریاض، ساحل ابڑو، اشفاق شاہین، مقصود احمد بلوچ، پرنس افضل شاہین، محسن علی طاب، ممتاز احمد اور ایس امتیاز احمد خوبصورت تبصروں کے ساتھ ریشم کے پلیٹ فارم پر جلوہ گر پائے۔

عذرا فردوس، شاہ رخ نذیر، ساحل ابڑو، ماورا طلعہ، ریما نور رضوان سبھی ساتھیوں نے آزادی کے حوالے سے منفرد تحریریں رقم کیں جو یاد رکھنے کی تھیں۔

سر سلیم اختر، ایس امتیاز احمد، ماریہ یاسر اور ثمینہ کنول بھی خوبصورت لفظوں کے پھول لائے۔ جن کی خوشبوؤں سے من سرشار ہونے لگا۔ تو حنا اصغر، عدیلہ سلیم، صباحت رفیق اور عابدہ سبین بھی کسی سے کم نہ تھیں۔ ان کے الفاظ، فقرات بھی مسکراہٹوں سے مزین پائے۔ بقیہ سبھی کالمز خوبصورت، معیاری اور منفرد پائے۔

اس قدر عمدہ مواد کی تلاش اور اس کی سلیکشن پر بشریٰ مسرور صاحبہ کو مبارکباد قبول ہو۔ چھ ستمبر کے شہیدوں کو ڈھیروں سلام۔ جنہوں نے اس پاک مٹی کی حفاظت کے لیے اپنا تن، من اور دھن قربان کرتے ہوئے دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر ثابت کر دیا کہ ہم اپنے وطن کی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں اور یہ بھی بتا دیا کہ آئندہ کوئی بھولے سے بھی ادھر میلی آنکھ سے نہ دیکھے ورنہ ہم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا خوب جانتے ہیں۔

آخر میں سبھی احباب کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ خوش رہیے، خوشیاں بانٹیے کہ دور حاضر میں خوشیوں کی تعداد دکھوں کے مقابلے میں کم ہیں اور مسرتیں شیئر کرنے سے دکھ دور ہوتے ہیں۔

(☆ خط لکھنے کا بے حد شکریہ)

☆☆☆

عابدہ سبین، ملتان

ڈیئر بشریٰ آپی

اسلام علیکم!

ریشم کا سالگرہ نمبر دلکش سرورق کے ساتھ ملا بہت اچھا لگا۔ سب سے پہلے آپ سب کو ریشم کی سالگرہ مبارک ہو اللہ کریم ہمارے پیارے ریشم کو دن دگنی رات چوگنی کامیابی عطا کرے آمین۔

ستمبر کا شمارہ لاجواب رہا۔ افسانے عمدہ رہے۔ خاص کر ریحانہ آفتاب کا افسانہ ہلکا پھلکا سا رومانٹک مگر عمدہ اسلوب

اور خوبصورت انداز لئے ہوئے تھا۔ صباء ایشل کور یشم فیملی میں ویلکم کہیں گے بہت عمدہ طرز تحریر ہے۔ سازش گر فاطمہ نے ایک بار پھر کمال لکھا۔ صحرائے وفا میں حسن نظامی صاحب نے آتشی اور خاکی مخلوق کے فرق کو عمدگی سے پیش کیا۔ محبت کا جانشین بہت اچھا افسانہ رہا۔ عید قربان فرح طاہر نے تو آنکھیں نم کر دیں ہمارے معاشرے کی بے حسی کو بہترین انداز میں بیان کیا۔ نزہت آپی کا افسانہ سزا ہمارے معاشرے کی کڑوی سچائی آج بھی ہمارے ہاں لڑکی کی پیدائش پر ماں کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ آج بھی بیٹی کی پیدائش خوشی کا باعث نہیں۔ افسوس در افسوس..... فریدہ آپا کی تحریر بھی مزیدار تھی۔ نگہت آپی کا افسانہ افسردہ کر گیا۔ عذرا فردوس نے اچھا ٹاپک پیش کیا عورت کی زندگی ہر حال میں مشکلات کا شکار رہتی ہے ہر رشتہ ہی عورت سے قربانی مانگتا ہے۔ اس کے علاوہ محسن علی طاب، جویریہ اور دیگر دوستوں کی تحریریں بھی اچھی رہیں۔ مستقل سلسلے سب بہترین تھے۔ پیاری ریما کے انٹرویو کے سوالات بہت زبردست ہوتے ہیں۔ ریشم ڈائجسٹ ماشاء اللہ بہت مقبول و مشہور ہو گیا ہے۔ ریما کی ریشم کے لیے کوشش بھی قابل ستائش ہے۔ انٹرویوز، سروے بہترین لگتے ہیں۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ آپ سب کے لیے بہت ساری دعائیں اور سلام۔ برائے مہربانی میرے ناول پر اپنی قیمتی آراء کا اظہار ضرور کیا کریں۔ (شکریہ)

(☆ ناول اچھا جا رہا ہے اسی لیے تو شائع ہو رہا ہے۔ خط لکھنے کا شکریہ)

☆☆☆

ایم حسن نظامی، قبولہ شریف

قابل احترام بشریٰ مسرور صاحبہ!

آداب و تسلیمات!

سلام مسنون! امید ہے آپ اور ادارہ ریشم کے سبھی کارکنان خیریت سے ہوں گے۔ عید الاضحیٰ، یوم دفاع اور سالگرہ سبھی نمبرز ایک ہی پرچے میں سموئے ملے اور عید کی لاتعداد مسرتوں کو دوبالا کر گئے۔ اداریے میں پیاری بہن نے سبھی کو نفرتیں بھلا کر محبتوں کی تلقین کی اور پھر اسے ہمارے اعمال کی عیدی قرار دیا اور سچ تو یہ ہے کہ انسان پیدا کیا ہی ایک دوسرے کی محبتوں کے لیے ہے۔

حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبولؐ سے ایمانی جذبے کو معطر کرتے ہوئے۔ دین و دنیا میں آئے جہاں عید اور قربانی پہ مدلل مضمون پڑھنے کو ملا۔ محمد سعید مشتاق سے ریما نور رضوان ملا رہی تھیں۔ ان کی شخصیت جان کر بے حد اچھا لگا۔ اس بار من پسند بزم ریشمی دستک میں بہت سے نامور لکھاری شامل ہوئے۔ رونق دوبالا ہو گئی مگر ابھی بہت سے احباب اس سے دور پائے۔ بھئی اپنی بزم میں حاضری لگوا کر اپنی خیر خیریت سے آگاہ فرمائیں۔

طیبہ عنصر مغل، امان اللہ نیئر، ڈاکٹر طارق محمود آکاش، مسز نگہت غفار، فاطمہ عبدالخالق، فریدہ جاوید فری، محسن علی طاب، پرنس افضل شاہین، عابدہ سیمن، ریما نور رضوان، عنبرین اختر اور ریحانہ آفتاب سبھی نے پرچے پر اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو کر عمدہ محفل سجائی۔

عذرا فردوس، فریدہ جاوید فری، پریم چند، فرح طاہر سبھی نے عید کی مسرتوں کو اچھے اور معیاری جذبات سے اجاگر کیا۔

ممتاز احمد سالگرہ کے حوالے سے منفرد تحریر لائے۔ نگہت غفار یوم دفاع کے حوالے سے بہترین لفظوں سے وارد ہوئیں۔ سر سلیم اختر کا شمار نامور لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ ان کے قلم کے اشارے سے لفظ ناچتے ہوئے اچھے اور بھلے محسوس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر طارق محمود آکاش، جویریہ ضیاء اور ایس امتیاز احمد کی معیاری تحریریں بلندیوں پر پائیں اور اچھے سبق ملے۔

ریحانہ آفتاب! بے بی تحریر کا پلاٹ آپ نے عمدہ منتخب کیا مگر انگریزی لفظوں کی بھرمار نے اردو زبان کا تاثر ختم کر

دیا۔ اردو زبان کو اردو ہی میں لکھیں چاہے بالکل سادگی سے۔ مقصود احمد بلوچ، عبدالرؤف سمرا دونوں کی تحریریں مقابل ٹھہریں۔

صحرائے وفا جی ہاں میرے لکھے چند فقروں، جملوں کو جن ساتھیوں نے پسندیدگی کی سند سے نوازتے ہوئے فون کالز اور ایس ایم ایس کیے ان کا بے حد مشکور ہوں۔ فاطمہ عبدالخالق، محسن علی طاب، فہمیدہ غوری اور رانا زاہد بھی منفرد موضوعات لائے جو بلاشبہ سراہنے کے قابل ہیں۔

دنیائے رنگ و نور، ریشمی مصالحہ، دلچسپ معلومات، ریشمی باورچی خانہ، رنگ میں بھنگ، رنگ خیال، ریشمی سندیسے، آپ کے روبرو، خود کلامی، آپ کے اوراق، باتیں صحت کی، بیوٹی ٹپس، نام کا پہلا حروف، رنگ سخن، خواص اتنے ڈھیر سارے سلسلے جہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے ہیں وہاں معیار میں اپنی پہچان رکھتے ہیں جو حقیقتاً گھر کے ہر فرد کے لیے معیاری ہیں۔

مقصود احمد بلوچ نے سالانہ رپورٹ بہت ہی باریک بینی سے رقم کی جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ٹھہرے۔ ریما نور رضوان کی سالگرہ رپورٹ بھی بے حد پسند آئی ان کی ریشم سے وابستگی خوش آیند بات ہے۔

ساتھیو! میرا پرانا نمبر بلاک ہونے سے بہت سے احباب رابطے میں نہیں نیا نمبر 0304-6629024 نوٹ فرما لیں۔ رابطے برقرار رہیں تو محبتیں دوستیاں اور تعلق داریاں برقرار رہتی ہیں رابطے ٹوٹ جائیں تو تنہائیوں کا زہر بندے کو اندر ہی اندر کھانے لگتا ہے اور عید سعید کی حقیقی مسرتیں تو اپنوں کے روابط اور گلے لگانے سے ہی میسر آتی ہیں۔ جن سے اپنے منہ موڑ لیں ان کے مقدر میں سوائے رونے دھونے اور آنسو بہانے کے کچھ بھی نہیں بچا کرتا۔ میری طرف سے اس قدر بہترین، معیاری اور منفرد پرچہ ترتیب دینے پر بشریٰ مسرور صاحبہ اور سبھی کارکنان ریشم کو مبارکباد قبول ہو۔

(☆ خیر مبارک، مگر ہم سے زیادہ مبارک باد کے مستحق ہمارے لکھاری ہیں کہ جن کی معیاری تحریروں سے ہم ریشمی دنیا کو سجاتے ہیں اور پھر قارئین ریشم جوڈائجسٹ پڑھ کر اپنی قیمتی آراء سے نوازتے ہیں)

☆☆☆

پرنس افضل شاہین، بہاولنگر

پیاری باجی بشریٰ مسرور صاحبہ!

السلام علیکم:

اس بار اگست کا ریشم آزادی نمبر کا سرورق بھی اسی مناسبت سے سجایا گیا تھا۔ سرورق دیکھ کر میرے ہونٹوں پر یہ شعر مچلنے لگا۔

میں ایک اینٹ پر چودہ اگست لکھتا ہوں
مہکنے لگتی ہے سارے مکان کی مٹی

آگے بڑھے تو آپ کا اداریہ آزادی کا مطلب سمجھا رہا تھا اور رشوت اور کرپشن کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہیں ہمارا ملک کب ایسی لعنت سے پاک ہوگا۔ حمد و نعت و دین اور دنیا پڑھ کر روح کو سرشار کرتے ہوئے آگے بڑھا تو ہمارے ریشم کی ریشمی ساتھی ریما نور رضوان کبریٰ نوید کا انٹرویو لے رہی تھیں۔ کبریٰ نوید کی تصویر دیکھ کر اچانک خیال آیا کہ انہیں کہیں دیکھا ہے۔ ذہن پر زور دیا تو معلوم ہوا کہ موصوفہ تو ہماری فیس بک فرینڈ ہیں جیسے کہ ریما نور رضوان ہیں۔ انٹرویو واقعی زبردست ہے۔ نوک جھونک میں ریحانہ، مہ نور، حمیرا وحید کے سوالات اچھے تھے۔ آگے بڑھے تو ہماری اپنی محفل ریشمی دستک ہماری منتظر تھی۔

آپی پرانے لکھاریوں کو یاد کر رہی تھیں کہ وہ آئیں اور ریشم میں خط لکھیں۔ میرا انٹرویو پسند فرمانے پر شاہد سلیم، عنبرین

اختر، مقصود احمد بلوچ کا شکریہ۔ مقصود احمد بلوچ بھائی! آپ نے تو آپی سے میرے انٹرویو پر ایوارڈ دینے کی سفارش کر دی۔ اسٹیج فنکار کو جب بہترین اداکاری پر داد ملتی ہے تو وہ داد کسی بڑے سے بڑے ایوارڈ سے کم نہیں ہوتی۔ ایسے ہی میرے انٹرویو کی پسندیدگی بھی مجھے کسی ایوارڈ سے کم نہیں لگی۔

شاہ رخ خان کا انٹرویو، شاہ روم خان، میجر شہزاد نیئر، ارشد محمود ارشد کی غزلیں۔ گڑیا شاہ، ملائکہ حریم، غزالہ جلیل راؤ، فوزیہ ناز، اشفاق شاہین کے اشعار۔ ایس امتیاز احمد، ڈاکٹر طارق محمود آکاش، مسز نگہت غفار، انیلا ناز کے اوراق پسند آئے۔

جشن آزادی سروے ریما نور نے خوب کیا۔ عنبرین اختر! آپ کو ایسا لگا کہ جب روبینہ میرا انٹرویو لے رہی تھیں تو آپ کو یوں لگا کہ جیسے آپ بھی وہیں موجود تھیں یہ تو پھر روبینہ کا کمال ہے۔ میں اپنی بیگم کو اکلوتی کہتا ہوں اس کی ایک اور بھی وجہ ہے۔ وہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔

افسانوں میں مہنگی آزادی، لہو کا رنگ ایک ہے، سجدہ وطن، دوستی، بازگشت، ہوا کا جھونکا، خونی رشتے، اے وطن تیرے لیے، اپنے دکھ مجھے دے دو، تیرے در پر معتبر ٹھہرے پسند آئے۔

ایک روز میری اکلوتی بیگم نے مجھ سے کہا۔ آپ کی سالگرہ کے لیے اتنا قیمتی سوٹ خریدا ہے کہ بس۔

میں نے خوش ہو کر کہا شکریہ۔ دکھاؤ تو سہی وہ سوٹ۔

میری بیگم نے بھی خوش ہو کر کہا۔ میں ابھی پہن کر آتی ہوں۔

(☆ کیا کہیں اس کے سوا کہ ''بھابی زندہ باد'')

☆☆☆

ایم اشفاق بٹ، لالہ موسیٰ

آپی بشریٰ مسرور صاحبہ!

السلام علیکم:

آپی جی کافی عرصہ اپنے پیارے ریشم سے دور رہا۔ جس کی وجہ کچھ مصروفیات تھیں۔ دور بس لکھنے کی حد تک رہا ریشم میں ہر ماہ لے کر پڑھتا ضرور تھا۔ اب دوبارہ ریشم کی پررونق دنیا میں حاضری لگوانے آ گیا ہوں۔

اب غیر حاضر نہیں ہوں گا اپنی حاضری کو یقینی بناؤں گا پتہ نہیں ریشم سے اتنی محبت کیوں کر ہو گئی ہے جب تک ریشم پڑھ نہیں لیتا تھا چین نہیں آتا تھا۔ 2017ء کا محبت نمبر ہو، بہار نمبر ہو چاہے وہ دولہا نمبر یا پھر آزادی نمبر ہو ان سب کی تو کیا ہی بات ہے۔

ستمبر 2011 میں، میں نے سب سے پہلے ریشم میں سالگرہ کے حوالے سے تحریر بھیجی تھی۔ اکتوبر میں ریشم کی سالگرہ بھی تھی۔ میری اس پہلی تحریر کو بہت پذیرائی ملی تھی۔ میری اگر آج کل ریشم میں کوئی پہچان بنی ہے تو آپی بشریٰ مسرور کی وجہ سے بنی ہے۔ ریشم نے مجھے کافی سارے دوست بھی دیئے جن میں مقصود احمد بلوچ، پرنس افضل شاہین، شاہد سلیم، ڈاکٹر طارق محمود، اللہ دتہ مخلص، میرے استاد محترم محمد سلیم اختر، محمد طلحہ مسرور یہ پیارے پیارے دوست مجھے ریشم نے دیئے ہیں۔

اگست کا مہینہ کل 31 اگست بروز جمعرات کو ختم ہو جائے گا۔ 14 اگست 1947ء کو ہمارا پیارا وطن وجود میں آیا تھا قائداعظم کی کوششوں سے جب قائداعظم نے یہ سمجھا کہ ہندوستان میں جو ہندو اور مسلم اکٹھے رہ رہے ہیں۔ ان میں کوئی قدر مشترک نہیں اور یہ کسی بھی وقت مسلمانوں سے نظریں پھیر سکتے ہیں تو قائداعظم نے ایک الگ وطن کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ ہمیں یہ ملک حاصل کرنے کے لیے بڑی قربانی دینی پڑیں ہیں۔ کسی بھی قوم نے آزادی کے لیے اتنا خون نہیں بہایا جتنا مسلمانوں نے پاکستان کی آزادی کو حاصل کرنے کے لیے بہایا ہے۔ ایک لاکھ سے زائد مسلمان لڑکیوں کی

عصمتیں پامال ہوئیں۔اس پاکستان کو حاصل کرنے میں اور نہ جانے کتنے ہی مسلمان شہید ہو گئے۔
اس سوہنے پاکستان کو حاصل کرنے میں.....
تب جا کر یہ سوہنا پاکستان ملا ہے۔
آپ سب کو میری طرف سے عیدالاضحیٰ کی خوشیاں مبارک ہوں۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنی رحمت کے صدقے آپ سب کو صحت وتندرستی اور بہت ساری خوشیاں عید کی صورت میں دیکھنی نصیب فرمائے۔(آمین)
اتنا عرصہ میں ریشم کی دنیا سے دور رہا۔میرے کچھ چاہنے والے مجھ سے رابطے میں رہے۔فون کر کے میری خیریت دریافت کرتے رہتے تھے اور ریشم ڈائجسٹ کے بارے میں بھی ڈسکس کرتے رہتے تھے۔ان میں، میں اپنے محترم محمد سلیم اختر صاحب کا ذکر کروں گا کہ وہ مجھے فون کرتے رہے ہیں۔ان کا بے حد شکریہ۔مقصود احمد بلوچ جو کہ اپنی آرمی کی ڈیوٹی بھی سرانجام دیتے تھے اور مجھ سے بھی رابطے میں رہے ان کا بے حد شکریہ۔فریدہ جاوید فری بھی فون کرتی رہی ہیں۔اپنے بھائی کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ان کو صحت وتندرستی عطا فرمائے۔(آمین)
حسن ابدال کے شاہد سلیم آپ کا کیا حال ہے۔پرنس افضل شاہین لگتا ہے بہت اونچی اڑان اڑ رہے ہیں۔ایم حسن نظامی صاحب آپ کا کیا حال ہے۔کام کاج کیسا چل رہا ہے۔شاہد رفیق سہو آپ سے فون پہ بات ہوتی رہتی ہے۔آخر میں تمام ریشم کی ٹیم کو اور ریشم کے پرستاروں کو بہت بہت بکرا عید مبارک۔
(☆ ویلکم بیک! اب ناغہ کیے بغیر دستک دیتے رہنا)

☆☆☆

امان اللہ نیئر شوکت، لاہور
قابل صد احترام بشریٰ مسرور صاحبہ!
السلام علیکم ورحمتہ اللہ!
ریشم کے دروازے پر ''ریشمی دستک'' دینے کا اب نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔میری دیکھا دیکھی اب ریشمی دنیا کے بہت سے ریشمی ساتھی جو طویل عرصے سے ریشم سے عنقا ہیں، جلد نظر آئیں گے۔آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ صحت اور تندرستی دے کیوں کہ آپ ہمارے لیے ریشم کا اثاثہ ہیں۔
حمد باری تعالیٰ کی اشاعت کا بے حد شکریہ۔ریاض ندیم نیازی نے آقا ﷺ کے در پر بڑی عاجزی سے دادرسی کی ہے۔انداز بھی بہت عاجزانہ ہے۔چاہنے والوں کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔اداریہ میں خوشی کے بے شمار روپ نظر آ رہے ہیں۔ان کو اپنائیں۔آپ کو روحانی مسرت حاصل ہوگی۔
ریشم ڈائجسٹ کے قارئین، لکھاری اپنے خطوط میں السلام علیکم ورحمتہ اللہ سے ابتداء ہی نہیں کرتے یہ شگون اچھا نہیں ہے۔اس طرف بھرپور توجہ دیں۔ریشم کے سرورق میں ہمیشہ سے ہی اٹھان رہی ہے۔شکل وصورت میں اٹریکشن ول کو شاد کرتی ہے۔
عذرا فردوس نے اپنے افسانے ''عید تم سے ہے'' میں شہناز بانو کو جو کردار دیا ہے۔اس نے غلطی کا اعتراف کر کے گھر کو بکھرنے سے بچالیا۔معافی مانگنے سے بڑے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ایسے فکشن سے دوسروں کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔
عذرا فردوس ویلڈن.....افسانہ خوبصورت ہے۔
فریدہ جاوید فری ''بڑی عید کی بڑی خوشیاں'' منا رہی ہیں۔حیدر اور کنول کا ملاپ میٹھے بادام جیسا ہوا ہے۔فریدہ جاوید فری ہو کر بڑے خوبصورت خیالات کو قلم بند کرتی ہیں۔ویلڈن.....
حسن اور عاتکہ ''پہلی برتھ ڈے ٹو یو'' میں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے لیے پیار کی دستک دے رہے ہیں۔

ممتاز احمد نے بڑے جذباتی انداز میں ان کو یکجا کر دیا۔ مسز نگہت غفار بڑے واشگاف الفاظ میں کہہ رہی ہیں ''اے وطن ہم تیرے مقروض ہیں'' شہر کے چپے چپے کو بے گناہوں کے خون سے رنگنے والے بڑے بے حس اور بے ضمیر ہوتے ہیں لیکن پاک وطن کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے والے، سینوں پر گولیاں کھانے والے اپنی اور اپنے ملک کی شان بڑھاتے ہیں۔ سراج محاذ پر دشمنوں سے نبرد آزما تھا۔ قیمتی املاک کی حفاظت کا اس نے بیڑا اٹھایا ہوا تھا۔ ظالم اپنی شیطانیت سے باز نہ آئے لیکن سراج اپنے وطن پر قربان ہو گیا۔ وہ شہادت کا درجہ پانے والوں میں شامل تھا۔ مسز نگہت غفار اپنے من میں ڈوب کر قلم کو گردش میں لاتی ہیں۔ صباء ایشل ''البیلی'' چاہت رکھنے والی لکھاری ہیں۔ البیلی لڑکی شہزادے کی محبت کا اعتراف کیوں نہ کرتی۔ اس کے حسن میں رعنائی تھی۔ زندگی میں رنگینیاں لانے کے لیے ہونٹوں کے تشنہ صحرا کو دان کرنا ضروری تھا۔ دو دلوں کے ملاپ کرنے والوں کو درخت پر بیٹھے پرندوں نے بھی سلامت رہنے کی دعائیں دیں۔ یہ افسانہ سب لکھاریوں کے افسانوں پر سبقت لے گیا ہے۔ صباء ایشل بادنو بہار چلانے کے لیے گلوں میں رنگ بھرنا جانتی ہیں۔ دل کی گہرائیوں سے آپ کو عید قربان کی مبارکباد ہو۔

مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ طویل عرصہ بعد لاہور کے لاتعداد بک سٹالز پر ''ریشم'' نمایاں طور پر نظر آنا شروع ہو گیا ہے۔ مشرق، مغرب، شمال، جنوب خوب پھیلے گا اور خواتین کے دل و دماغ میں اپنی جگہ بنائے گا۔ آج وقت کی دھار اور ہے، کل وقت کی دھار دیکھنے والی ہو گی۔ محنت میں عظمت ہے۔

نزہت جبین ضیاء کی ''سزا'' بشارت علی کو غلطیوں کا احساس ہونے کے بعد ملی۔ دنیاوی سزا بچوں سے زیادتی کی ملی اور جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ملی سزا، اس نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے۔ روز روشن کی طرح۔ بشریٰ مسرور صاحبہ بہت خوش قسمت ہیں۔ ان کو ریشم کے لیے بڑے مایہ ناز اور کہنہ مشق قارئین اور لکھاری میسر ہیں جو 18 سال سے ان سے محبت اور شفقت سمیٹتے آ رہے ہیں اور ان کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ ریشم میں لکھاریوں کے افسانوں کا معیار بہت بلند ہے۔ ادب کے میدان میں ان کا قد بھی بلند ہے اور نام بھی۔

ایم حسن نظامی کا نام اس لیے بلند ہے کہ وہ ''صحرائے وفا'' سے ایک پری کو لے کر آئے ہیں لیکن یہ کیسی پری تھی جو محبتوں کی آڑ میں دوسروں کا گھر برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ پری محبوبہ بھی تھی اور آتشی مخلوق بھی۔ دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے جن اور انسان کی محبت لافانی نہیں ہوتی۔ پری کے کئی روپ تھے لیکن اکبر کی قوت ارادی مضبوط تھی اس لیے وہ اپنے ارادوں میں کامیاب رہا۔ نگہت کی محبت دیرپا تھی کیوں کہ اس نے بڑی چاہت اور اپنائیت سے اس کو چاہا تھا۔

محسن علی طالب ''بازی گر'' کی قلابازیوں کی تاب نہ لا سکا۔ بری سوسائٹی معاشرے میں انسان کی زندگی اجیرن بنا دیتی ہے۔ اس نے معاشرے میں کبیر شاہ اور سبرینا کو اچھا مقام دلا دیا۔ فرح طاہر ''عید قربان'' کے موقع پر عید قربان کے ذریعے انسان سے آرزو کی تکمیل کروا رہی ہیں۔ دعا کی قبولیت حالات بدل دیتی ہے۔ تحریر میں اس بات کی امنگ ہے کہ انسان دنیاوی خواہشات کی آرزو کم کرے۔ زندگی خوشگوار ہو جائے گی۔ عید قربان کے حوالے سے مختلف تحریریں اپنا رنگ دکھا رہی ہیں۔ محمد سلیم اختر کہہ رہے ہیں ''عشق سچا ہو تو'' محبت کی تعبیر خوبصورت زندگی کی شکل میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر طارق محمود آکاش کے پاس ''پتھر کی مورت'' ہے۔ وہ پتھر کی مورت بن کر زمانے کے نشیب و فراز کا جائزہ لے رہے ہیں کہ انسان کسی کا ہو کر سیکھتا ہے یا پھر کسی کو کھو کر سیکھتا ہے۔ ''پتھر کی مورت'' محبت کے پیارے روپ کو سنوارنے والی جذباتی تحریر ہے۔ مجید احمد جائی اپنے افسانے ''محبت کا جانشین'' میں تحریر کو افسانوی رنگ دے کر مجاہدوں کو جام شہادت پلوا رہے ہیں۔ پہلے احمد ریل گاڑی کی پٹڑی پر بم دھماکے میں شہید ہوا۔ اب اس کی اولاد حماد کا حوصلہ کتنا بلند ہے کہ وہ اگلے مورچوں پر دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے سینہ تانے کھڑا ہے۔ ایسی تحریریں وطن پر قربان ہونے کے لیے ہم میں ایمان کا جذبہ بیدار رکھتی ہیں۔

''بڑی اماں، شاید وہ کبھی کہہ دے، کاپر نیل پالش، خانہ بدوش'' اور دیہاتی لڑکی ناقابل فراموش افسانے ہیں۔
جویریہ ضیا، ایس امتیاز احمد، ریحانہ آفتاب، مقصود احمد بلوچ اور عبدالرؤف سمرا ریشم کے وہ درخشاں ادبی ستارے ہیں جو اپنے ناخن قلم سے اپنی تحریروں کی گرہیں اس سلیقے سے کھولتے ہیں کہ بذات خود ان کی قلم نگاری کی ژولیدگی متحیر رہ جاتی ہے۔ان کے جوہر قابل پر ہر طرح فخر کرنا میری فنکارانہ دیانت کی زندہ روشن دلیل ہے۔یہ سب ادیب حلیم الطبع، اخلاق، محبت، ملنساری جیسی اعلیٰ انسانی خصوصیات کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔''دلچسپ و عجیب وغریب معلومات'' میں نہ بھولنے والی، ناقابل یقین واقعات کے ساتھ حاضر ہوں گا۔انجم انصار ''رنگ میں بھنگ'' ڈال کر حکومت سے ان بے ضمیر لوگوں کے لیے نیا قانون بنوا رہی ہیں جو بیمار مرغیوں کا گوشت لوگوں کو کھلا رہے ہیں۔ایسے بے حس لوگوں کا اصل ٹھکانہ جیل خانہ ہے۔وہ وہاں سڑتے رہیں۔رنگ خیال میں گل بخشالوی پاک فوج کو سلام پیش کر رہے ہیں۔میجر شہزاد نیرؔ اپنی غزل میں سچا شور مچا رہے ہیں۔عبدالرؤف سمرا کو شریک حیات کی فکر ستا رہی ہے۔نظم خوب ہے۔عارف نظیر غزل گو ہیں کہ مرے اشعار منفرد ہیں۔نیرؔ کی کیا مجال کہ وہ انکار کرے۔''آپ کے روبرو'' میں ممتاز احمد نے معروف افسانہ نگار مجید احمد جائی سے ملاقات کرائی۔سوالوں کے سب جوابات مزیدار ہیں۔لیکن بہترین دوستوں کی محفل میں امان اللہ نیرؔ شوکت کا نام عنقا ہے۔خیر ہو مجید احمد جائی کی۔
خود کلامی میں شاعر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے ہیں۔عامر محمود اعوان کا شعر میرے دل میں گھاؤ کر گیا ہے۔
عبداللہ مسرور ''آپ کے اوراق'' میں سجنوں اور متروں کی کاوشوں کے ذریعے ان کی محبتیں سمیٹ رہے ہیں۔ریشمی ساتھیوں ڈاکٹر اظہر سعید کی ''باتیں صحت کی'' ہیں۔اپنی صحت کا خیال رکھیں۔عید پر بالوں کے اسٹائل منفرد بنوانے ہیں تو کشائش مسرور سے رابطہ کریں۔ریما نور رضوان نجومی ہوگئی ہیں۔حرف A سے بہت سے انکشاف کر رہی ہیں۔ان کی لاج رکھنا ضروری ہے۔میں واقعی آزاد زندگی اپنی مرضی سے گزارتا ہوں۔''عید قربان'' کی سب ریشمی ساتھیوں کو ڈھیروں مبارکباد ہو۔اللہ تبارک وتعالیٰ ایسی ہزاروں خوشیاں، ہم سب کو منانے کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)
(☆ ہم سب ریشم کی اس ریشمی محفل میں دل کی گہرائیوں سے آپ کو ایک بار پھر خوش آمدید کہتے ہیں۔بھرپور تبصرے کے لیے شکر گزار ہیں)

☆☆☆

عنبرین اختر، لاہور

پیاری بشریٰ مسرور صاحبہ

السلام علیکم

اللہ رب العزت زندگی کی ہر خوشی، کامیابی، صحت اور عزت آپ کے نصیب میں لکھ دے۔آمین
ستمبر کا سالگرہ نمبر عید سے پہلے ہی موصول ہوگیا۔اداریہ ہمیشہ کی طرح سبق آموز پایا۔اگر ہم دلوں سے میل اور حسد ختم کر دیں تو یقیناً زندگی پرسکون ہو جائے گی۔حمد ونعتؐ سے روح کو معطر کیا۔
مجھ سے ملیے میں آر جے محمد سعید سے ملاقات اچھی لگی۔نوک جھونک مسکراتی محفل خوب رہی۔
اب آتے ہیں افسانوں کی طرف ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سبھی افسانے کمال کے رہے۔ان میں عید تم سے ہے، بڑی عید کی بڑی خوشیاں، پپی برتھ ڈے ٹو یو، اے وطن ہم تیرے مقروض ہیں، واقعی شہیدوں کا لہو ہم سب سے اپنی اپنی قربانی مانگتا ہے۔الببلی خوبصورت لفظوں سے سجی تحریر تھی۔سزا بہترین افسانہ تھا۔بشارت علی غلطی پر تھا اسی لئے نظروں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گیا اور حدیقہ بٹی انتظار ہی کرتی رہی۔تج اکبر گولڈن ادبی تحریر تھی۔عید قربان، عشق سچا ہو تو، پتھر کی مورت، محبت کا جانشین، بڑی اماں، شاید وہ کبھی کہہ دے، کاپر نیل پالش، خانہ بدوش، دیہاتی لڑکی، صحرائے وفا، بازی گر،

منی، وہ ستر دن اور سازش گرا چھے افسانے تھے۔
مستقل سلسلوں میں رنگ خیال، ریشمی سندیسے، آپ کے روبرو، خود کلامی، آپ کے اوراق، بہترین سلسلے تھے۔ سالانہ جائزہ رپورٹ بہت اچھی لگی۔
خوش رہیں اور خوشیاں بانٹیے، ہمارے جو ریشمی لکھاری بیمار ہیں اللہ ان سب کو صحت و تندرستی خوشیاں، ترقی، عزت اور کامیابیاں عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین
اب اجازت چاہوں گی آپ سب اپنا خیال رکھیے گا، اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ والسلام
(☆ آمین! آپ بھی اپنا بہت زیادہ خیال رکھیے گا عنبرین اختر مختصر ہی سہی مگر جامع دستک کے لیے شکریہ)

☆☆☆

ریما نور رضوان، کراچی

السلام علیکم!
بشریٰ آپی، اور ریشم سے جڑے ہر فرد واحد کو پیار و خلوص بھرا اسلام!
دل کی تمام تر گہرائیوں اور سچائیوں کے ساتھ منفرد ہوتے ہوئے منفرد لفظوں کے ساتھ ستمبر کا ریشم عید الاضحیٰ اور سالگرہ نمبر تھا۔ سرورق دیدہ زیب سا بہت بھایا۔ اشتہارات کے اوراق الٹتے ہوئے اداریہ نکالا۔ واقعی آپی سو فیصد درست کہا ہے کہ انسان کی کم ظرفی اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔۔۔۔۔۔ بہت خوب ڈیئر آپی۔
ریشم ڈائجسٹ میں نئے رائیٹرز کو ویلکم۔ حمد و نعت نے من کو مسرور سا کر دیا۔ دین اور دنیا میں اسلام کا تصور قربانی ہمیں قربانی کے حوالے سے معلومات میں اضافہ کرنے کا باعث بنا۔ آرجے محمد مشتاق سعید صاحب کا انٹرویو بہت اچھا لگا۔ نوک جھونک ہمیشہ کی طرح کھلکھلاتا سا ملا۔ سوالات اور جوابات بہت خوب ہمیں بے ساختہ قہقہہ لگانے پر مجبور کر گیا۔
ریشمی دستک میں طیبہ عنصر مغل آپی، امان اللہ نیر شوکت، ایس امتیاز احمد، مسز نگہت غفار، ڈاکٹر طارق محمود آکاش، فاطمہ عبدالخالق، مجید احمد جائی، ایم حسن نظامی، پرنس افضل شاہین، عابدہ سبین، عنبرین اختر ان سب احباب نے نا صرف ریشم کا بغور مطالعہ کیا بلکہ جاندار و شاندار سا تبصرہ بھی کیا۔ ان سب کے تبصرے بہت اچھے لگے محسن علی طالب بھائی کی بات پر ان شاء اللہ عمل کیا جائے گا۔ زرش آرائیں آپ کو ریشمی دستک میں خوش آمدید آئیں ہیں تو آتی رہیے گا۔ 'اے وطن تیرے لیے' بشریٰ آپی میرے افسانے کو ریشم کے صفحات کی زینت بنانے کا بہت بہت شکریہ اور ریشمی ساتھیوں اس افسانے کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔
اب آتی ہوں ستمبر کے شمارے کی طرف سب سے پہلے پڑھی 'کارپنیل پالش' از قلم ریحانہ آفتاب، سب سے پہلے ریحانہ آپی کو ریشم ڈائجسٹ کے قلم قبیلے میں شمولیت اختیار کرنے پر ڈھیر ساری مبارکباد۔ امید ہے کہ ریحانہ آپی یہ قلمی تعاون ہمارے ساتھ سدا برقرار رکھیں گی۔ کرنز کی بھرمار، نٹ کھٹ شرارتیں، پیار و محبت کی کشتی میں سوار دو پریموں کی کہانی آسیجنے کی خاموش محبت جیت گئی۔
'عید تم سے ہے' از قلم عذرا فردوس۔ اک ایسی لڑکی کی کہانی جس نے ہر رشتے کو قربان کر کے سب کا دل جیت لیا۔ کہانی بہت بہترین لگی سبق آموز علیزے نے خود کو فنا کر دیا گھر بنا کے دیکھا دیا۔ بہت خوب۔ 'بڑی عید کی بڑی خوشی' از قلم۔ فریدہ جاوید فری۔ گھر کی بیل مسلسل بجنے والے سین نے بے ساختہ ہنسا ڈالا۔ کہانی ہلکی پھلکی اچھی لگی۔ 'اے وطن ہم تیرے مقروض ہیں' از قلم۔ مسز نگہت غفار۔ بلاشبہ یہ وطن ہمیں بہت سی قربانیوں اور جدوجہد کے بعد حاصل ہوا ہے۔ اور یہ اقتباس تو بہت خاص لگا۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ شہیدوں کا لہو آپ سب سے اپنی قربانیوں کا صلہ مانگتا ہے۔ خدارا ہم اپنے قائد کے، اپنے شہیدوں کے، اپنے وطن کے مقروض ہیں ہمیں ہر حال میں یہ قرض چکانہ

ہے۔ وطن عزیز کی محبت سے لبریز افسانہ بہت اچھا لگا۔ 'سازش گر' از قلم۔ فاطمہ عبدالخالق۔ پاک آرمی کے پس منظر میں لکھی گئی تحریر بے انتہا پسند آئی۔ عبدالرحمٰن اپنے وطن عزیز پر جان نچھاور کرنے والا جوان تھا۔ مشن کامیابی سے ہمکنار ہوا لیکن اس کی ماں ہی وطن کی دشمن نکلی۔ بیٹے کی محبت کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ مختصر مگر پراثر انداز تحریر بہت اچھی لگی۔ پیارے وطن پر ماں قربان، فرض شناسی پر ماں قربان یہ اقتباس بہت پسند آیا کہ جب انسان حق کے راستے کا مسافر ہو تو وہ بڑے بڑے خطروں سے یونہی کھیل جاتا ہے۔ کیونکہ یہ حق کے مسافر تو ہمیشہ اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھتے ہوئے گھروں سے روانہ ہوتے ہیں۔ نجانے کب کہاں ان کی جان وطن کی سلامتی پر قربان ہو جائے۔ بہت خوب ڈیئر فاطمہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ آمین ثم آمین۔

'سزا' از قلم نزہت جبین ضیاء۔ بہت بہترین، سبق آموز افسانہ اچھا لگا۔ بیٹیوں اور بیوی کو بے آسرا کرنے والے انسان کا انجام عبرتناک دیکھایا۔ ریشم ڈائجسٹ دو ہزار سولہ سروے رپورٹ مقصود احمد بلوچ صاحب نے بہت اعلیٰ تیار کی۔ زبردست۔۔۔۔ باقی شمارہ ابھی پڑھا نہیں۔

سلسلے وار ناول خوبصورت موڑ لیتا ہوا آگے کی جانب گامزن ہے۔ چھٹی قسط ابھی پڑھ نہیں سکی۔ اچھا جی اس ماہ بس اتنا ہی پڑھ سکی۔ اب ملیں گے اگلے ماہ۔ اپنا بہت خیال رکھئے گا۔ ان شاء اللہ پاک۔ مجھے دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔ میری کہانی پر اپنی رائے ضرور دیا کریں۔ کہیں پڑھا تھا۔ خوش ہونا ہے تو تعریف سنا کریں۔ بہتر ہونا ہے تو تنقید سنا کریں۔ میں اپنا طرز تحریر بہترین کرنا چاہتی ہوں۔ جس کے لیے آپ کی رائے کی منتظر رہتی ہوں۔ قارئین کی رائے لکھاری کی تحریر کو نکھار اور سنوار دیتی ہے۔ ہر رائٹرز کی طرح مجھے بھی فیڈ بیک کا انتظار رہتا ہے۔ ریشم ڈائجسٹ سے جڑے رہیے۔ اگر آپ فیس بک پر ہیں تو ہمارا آفیشل گروپ ضرور جوائن کریں۔

group.officialdigestReyshammonthly، اچھا جی اللہ نگہبان۔۔۔۔۔۔۔۔

(☆ پیاری ریما! تفصیلی تبصرہ اچھا لگا آئندہ بھی آتی رہنا)

☆☆☆

زرش آرائیں، لاہور

السلام علیکم:

پیاری بشریٰ آپی جی!

آپ کو سب سے پہلے تو عیدالاضحیٰ مبارک، اس کے بعد آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے میرے ای میل کو ریشمی دستک میں جگہ دی۔ اسی لیے دوبارہ سے تبصرہ لکھ پائی ہوں۔ آپ کی طبیعت کا سنا تو دل سے آپ کی صحت یابی کی دعائیں نکلیں۔ پرنس افضل شاہین جی کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح دلچسپ تھا۔ ریما نور رضوان اور فاطمہ عبدالخالق دونوں کا جامع تبصرہ بھی اچھا تھا۔ دونوں انٹرویو بھی اچھے تھے۔ نام کا پہلا حرف بھی دلچسپ رہا۔ رنگ خیال اور رنگ سخن بہترین سلسلے ہیں۔ سروے میں مختلف رائیٹرز سے مل کر اچھا لگا۔ ان کے خیالات جان کر اور ریشم سے ان کی محبت جان کر خوشی ہوئی ہے۔ حج اکبر بہت خوبصورت ادبی انتخاب تھا، پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اس کے علاوہ بڑی اماں، عید تم سے ہے دونوں بہت زیادہ پسند آئیں، محمد سلیم اختر کا اتنا بڑا نام ہے لیکن اس بار ان کی کہانی نے بہت مایوس کیا ہے اس لیے کہانی ادھوری چھوڑ دی۔ رانا زاہد اور فاطمہ عبدالخالق نے اس بار صنف مخالف کی محبت کے موضوع کو پس پشت ڈال کر وطن سے محبت کی کہانی پر لکھا اس لئے مجھے پسند آئیں۔ رانا زاہد صاحب اپنے طرز بیاں میں سادہ سے الفاظ میں گہری گہری باتیں سمجھا گئے جبکہ فاطمہ عبدالخالق صاحبہ کی منظر نگاری کمال کی تھی، اور واقعی وطن کی بات جب آئے تو سبھی رشتے ناطے قربان ہو جاتے ہیں۔ یہاں نگہت غفار صاحبہ کا تذکرہ اگر نہ کیا جائے تو ان کی حق تلفی ہو گی، بہت خوبصورت پیرائے میں انہوں نے اس

چمن کی مٹی کے قرض کی پکار سنائی۔ صحرائے وفا، بازی گر اور پتھر کی مورت تینوں کہانیاں پسند نہیں آئیں، خصوصاً پتھر کی مورت یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کی بہن ہو اور اسے اس رشتے کی کشش محسوس نہ ہوئی ہو؟ عجیب سی سچوئیشن تھی یا پھر مصنف اسے سوتیلی یا لے پالک بیٹی بنا دیتے تو کہانی بہت زبردست ہو سکتی تھی۔ سری دیوی میری پسندیدہ اداکارہ ہیں ان کے بارے میں پڑھ کر اچھا محسوس کیا، فرح طاہر صاحبہ کی عید قربان غمزدہ اور پرسوز تحریر تھی، نوک جھونک کا سلسلہ بھی بہت زبردست سلسلہ ہے۔

آپ سے گزارش ہے میرا خط لازمی شامل کیجیے گا، کیونکہ میں کیڈٹ کالج میں ایف ایس سی میں ایڈمیشن لیا ہے۔ وہاں تو ڈائجسٹ پڑھنا ناممکن سی بات ہے۔ البتہ چھٹیوں میں گھر آنے پر پڑھ کر تبصرہ ضرور کیا کروں گی۔ انشاء اللہ آپ میرے لیے دعا کیجئے گا میں آرمی ڈاکٹر بن سکوں۔ (☆ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی عطا فرمائے (آمین)

بشریٰ آپی اور ریشم سے جڑے تمام لوگوں کے لئے نیک تمنائیں۔ اللہ حافظ

☆☆☆

عاشق علی فیصل، فیصل آباد

اسلام علیکم

ستمبر کا ریشم بہت سی خوشیاں ساتھ لے کر آیا۔ ڈاکٹر طارق کی کہانی بہت خوب رہی۔ ڈاکٹر صاحب سے اب ناول کی فرمائش ہے۔ فریدہ آپی کے دونوں خط بڑی دلچسپی سے پڑھے۔ ممتاز بھائی شکریہ مجید احمد جائی سے آپ نے ملاقات کرا دی۔ ریشم کا خاموش قاری ہوں۔ ریشم کے دروازے پر پہلی دستک ہے۔ امید ہے کہ حاضری قبول ہوگی۔ ڈاکٹر طارق، ممتاز بھائی، مجید امجد جائی کو پرخلوص سلام۔ فریدہ آپی نے بڑی عید کی بڑی خوشیاں عطا کی۔ اللہ ان کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ ریشم پڑھنے والے اور ریشم سے محبت کرنے والے سب بہن بھائیوں کی خدمت میں عاجزانہ سلام۔

(☆ پہلی ریشمی دستک پر خوش آمدید)

☆☆☆

بشرط زندگی آئندہ انہی صفحات پر دوبارہ ملاقات ہوگی۔ اپنا بہت سا خیال رکھیے گا۔

فی امان اللہ

بے شمار چاہتوں کے ساتھ آپ سب کی

بشریٰ مسرور

خطوط اور اپنی تحریریں ہمیں اس پتے پر ارسال کریں

Suite#1, 4th Floor,

12-Mian Chambers, 3-Temple Road, Lahore

Facebook ID: Bushrarafiq

E mail: Bushraraysham@gmail.com.

اردو کمپوزنگ میں اپنی کہانیاں اور دیگر تحاریر ہمیں اسی E mail پر بھیجی جائیں۔

جنونِ دل

بشریٰ مسرور

(قارئین ریشم کے بے حد اصرار پر)

محبت اگر جنون کا رنگ اختیار کر لے تو عشق
کی معراج بن جاتی ہے۔ جنون اگر نفرت کا سوانگ
بھر لے تو ساحل سے لگے سفینوں کو ڈبو دیتا ہے اور اگر
کوئی غلط خواہش جنون کے روپ میں ڈھلنے لگے تو
خیر و شر کے بیچ کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔۔

چند ایسے لوگوں کی کہانی جو دوسروں کو اپنا اسیر دیکھنے کے جنون میں مبتلا رہتے ہیں اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرتے ہیں۔

خوشبو سے مہکتی ہوئی ہر شاخ جلا دی
لوگوں نے اسی شغل میں اک عمر گنوا دی
ہونٹوں نے تو رکھا ہے بھرم میرے جنوں کا
آنکھوں نے مگر ضبط کی دیوار گرا دی

شام زوردار آندھی چلنے کے بعد ماسٹر غلام حسین کے گھر کا کچا صحن پیپل کے زرد و ہرے پتوں سے بھر گیا تھا۔
اگرچہ آندھی تو کب کی ختم ہو چکی تھی مگر بارش میں بھیگی ٹھنڈی ہوا کے سرد جھونکے بتا رہے تھے کہ کہیں آس پاس ہی بادل خوب جم کے برسے ہیں۔
مطلع تو یہاں بھی اس وقت ابر آلود ہی تھا اور رات کے کسی پہر بھی موسلا دھار بارش ہو سکتی تھی۔ مگر تاباں نے اس کے باوجود بھی صحن میں جھاڑو دینے کے بعد رات کو سونے کے لیے چارپائیاں بچھالی تھیں۔
''اگر رات کو بارش ہوئی بھی تو فقط تین چارپائیاں تو ہیں، انہیں اٹھا کر برآمدے تک لے جانے میں بھلا کتنی دیر لگے گی۔'' اس نے سوچا تھا۔
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے شریر جھونکے تاباں کے ریشمی دوپٹے سے اٹکھیلیاں کر رہے ہیں تھے اور اسے اچھا لگ رہا تھا۔
پہلے کسی وقت جب پانچ چارپائیاں برابر برابر صحن میں بچھا کرتی تھیں تو صحن کتنا بھرا بھرا سا لگتا تھا۔ مگر پھر اماں کے مرنے اور طلال بھائی کے شہر چلے جانے کے بعد سے آنگن کتنا خالی خالی سا لگنے لگا تھا۔
آنگن کا یہی سونا پن دور کرنے کے لیے ماسٹر جی نے دیواروں کے ساتھ ساتھ کیاریاں بنا کر وہاں موسم کے تمام پھول لگا لیے تھے، مگر یہ سارے پھول ان کی تین چارپائیوں کے ساتھ مل کر بھی ان دو پلنگوں کی کمی پوری نہیں کر سکتے تھے کہ جو وہاں سے اب اٹھ چکے تھے۔
''اے کاش کہ گاؤں میں کوئی اچھا کالج ہی بن جاتا تو طلال بھائی کو تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے شہر نہ جانا پڑتا۔ یا پھر..... یا پھر کم از کم یہاں کوئی چھوٹا موٹا ہسپتال ہی ہوتا تو شاید اماں اتنی جلدی نہ مرتی۔'' تاباں کبھی کبھار اوٹ پٹانگ سوچے جاتی۔
طلال بھائی کبھی کبھار بس چھٹیوں ہی میں ملنے چلے آیا کرتے تھے۔ ورنہ تو ان کی یہی کوشش ہوا کرتی تھی کہ چھٹیوں کو گھر بیٹھ کر ضائع کرنے کی بجائے شہر میں رہ کر کوئی جز وقتی ملازمت یا کام دھندہ ڈھونڈ کر چار پیسے کما لیں تاکہ ابا کی جیب پر ان کے ماہانہ خرچ کا بوجھ نہ پڑے۔
بھلا پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ ہی کتنی ہوتی ہے!
ساری زندگی سر ڈھانپنے سے پاؤں ننگے اور پاؤں ڈھانپنے سے سر کھلا رہ جاتا ہے۔ چادر کبھی پوری ہی نہیں پڑتی۔
وہ تو اللہ کی رحمت سے ماسٹر جی کی تھوڑی بہت زمین تھی کہ جس کی وجہ سے سفید پوشی کا بھرم قائم تھا۔ اور اسی زمین کا چند گز ٹکڑا بیچ کر ہی تو انہوں نے طلال کو شہر کے اچھے کالج میں داخلہ دلایا تھا اور ہاسٹل کے جملہ اخراجات ادا کر رہے تھے۔
اور اسی زمین کے بل بوتے پر وہ بلال اور تابینہ کو مستقبل کے ڈاکٹرز کا روپ دینا چاہتے تھے۔ کیوں کہ یہ بات ان کے لاشعور میں بیٹھ چکی تھی کہ ہسپتال سے محرومی ہی نے دراصل ان کی شریک حیات نذیراں بی بی کو مرحومہ بنا دیا تھا۔
ورنہ ہیضہ کوئی ایسی بیماری تو تھی نہیں کہ اچھا بھلا جیتا جاگتا انسان چٹ پٹ مٹی کے ڈھیر میں جا ملے۔
''تابینہ عرف تاباں تو باپ کی خواہش کے احترام میں ڈاکٹر بننے کا عزم کر چکی تھی مگر..... بلال.....؟؟

☆☆☆

مسلسل بھاگتے رہنے سے اس کی ٹانگیں بے دم پڑ چکی تھیں۔ مگر وہ پھر بھی انہیں حرکت دینے پر مجبور تھا، اور لگاتار آگے کی طرف بھاگے ہی چلا جا رہا تھا۔ کیوں کہ اس کے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ ہی نہیں تھا۔
اور اگر وہ تھک کر کہیں دم لینے کے لیے ٹھہر جاتا تو یقیناً وہیں اسے دھر لیا جاتا۔ واہمے اور اندیشے خوف کا چابک بن کر

اس پر برستے تو اس کی بے جان پڑتی پنڈلیوں میں جیسے بجلی سی لپک جاتی..... اور اس کے دوڑنے کی رفتار میں آپ ہی آپ مزید شدت آ جاتی۔

''اوئے میٹرک کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا ہے..... اور جگر! تو تو چار کیمیکلس میں فیل ہے بھئی، آج تو تیرا باپ تیری چمڑی ہی ادھیڑ ڈالے گا۔ قسم اللہ پاک کی! وہ چھڑی لے کر سیدھا ادھر ہی آ رہا تھا۔ ابے بھوتنی کے! کھڑا میرا منہ کیا تک رہا ہے بھاگ جا سالے یہاں سے، جلدی بھاگ.....!''

یہ وہ آخری الفاظ تھے جو بھاگنے سے قبل اس کے کانوں نے سنے تھے۔

اور اس کے ساتھ ہی اس کی ٹانگوں میں جیسے کوئی ٹربوفٹ ہو گیا تھا، پھر تو بس جدھر اس کا منہ اٹھا اسی طرف بھاگ نکلا تھا اور اب تک بھاگ رہا تھا۔

اگرچہ بھاگتے وقت اس کے کلاس فیلوز کے قہقہے دور تک اس کا پیچھا کرتے رہے تھے مگر اسے اس وقت کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

بس اگر فکر تھی تو صرف ابا کی صلواتوں اور بید کی اس چھڑی کی جو برستے وقت یہ نہیں دیکھتی تھی کہ کس پر اور کتنی شدت سے برس رہی ہے!! مسلسل برسے ہی چلی جاتی تھی۔ پھر بدن پر کتنے نیل پڑتے اور کتنی جگہوں سے لہو بہتا..... اسے مطلق پرواہ نہ ہوتی۔ اگرچہ یہ مار پیٹ روزمرہ کا معمول نہیں تھا۔ تاہم جب کبھی ایسا ہوا تھا تو پھر اسے کئی روز تک گرم پانی کی ٹکور اور ہلدی چونا تھوپنے جیسے مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔

اس کے دوست اور کلاس فیلوز اس کی اس ''درگت'' سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے تاہم اس کی چوٹوں پر ہمدردی کے ''پھاہے'' ضرور رکھا کرتے تھے۔

''یار! قسم سے تیرا باپ تو جنگلی ہے جنگلی۔ کیا سچ مچ اسے مارتے پیٹتے وقت ذرا احساس نہیں ہوتا کہ تجھے کوئی اندرونی چوٹ بھی لگ سکتی ہے؟ اس کے دوست اکثر حیران ہو کر سوال کرتے تو وہ بس سرد آہ بھر کے رہ جاتا۔

''ویسے ماسٹر جی تیرے سگے والد ہیں ناں؟ اپن کو تو بھئی کوئی گڑبڑ ہی لگتی ہے.....''

شیدا جو انڈین فلموں کا رسیا تھا، خالص ولن والے انداز میں ایک آنکھ میچ کے عجب بے ہودہ انداز میں ہنستا تو بلال کا جی چاہتا کہ اس کی بتیسی نکال کر ہتھیلی پر جما دے مگر یہ سوچ کر کہ وہ دراصل اسی کی ہمدردی میں تو یہ بس کہہ رہا ہے، خاموش رہ جاتا۔

''نا..... تیرا باپ تجھ سے آخر چاہتا کیا ہے؟'' ایک دوست نے نہایت عالمانہ انداز میں ایک بار اس سے پوچھا تھا۔

''چاہنا کیا یار..... بس ابا کی دلی خواہش ہے کہ میں پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنوں اور ہر طرف میری قابلیت کا ڈنکا بجے۔'' بلال نے بے زاری سے جواب دیا تھا۔

''ہاہاہا..... اس کا دوست منہ پھاڑ کے ہنسا۔''

''یار یہ ہمارے ماں باپ ہم سے وہ سب کیوں چاہتے ہیں کہ جو وہ خود نہیں کر سکتے..... یا جس کی ان میں اہلیت نہیں ہوتی.....''

''تو اور کیا.....'' ایک دوسرے دوست نے پہلے والے دوست کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اگر تو اپنے باپ کا سکول ریکارڈ چیک کرے تو خود وہ شاید ایک جماعت میں تین تین سال فیل ہوا ہو۔ مگر تجھ سے ٹاپ کرنے کی امید رکھتا ہے۔ یہ تو زیادتی ہے ناں یار.....''

جواباً بلال سر جھکائے پاؤں کے انگوٹھے کے ناخن سے بس زمین کریدتا رہا۔
اس لمحے اسے اپنے اوپر بے حد ترس آیا کرتا تھا۔ ''کیسے جلاد صفت باپ سے واسطہ پڑا تھا اس کا'' دوستوں میں مذاق بن گئی تھی اس کی زندگی۔
''کیا تم لوگوں میں سے کسی کو گھر میں مار نہیں پڑتی......؟'' اس نے پوچھا تھا۔
''میرا باپ بھی بہت غصیلا ہے، اسے جب کبھی مجھ پر غصہ آتا ہے تو ماں میرے آگے ڈھال بن جاتی ہے۔'' اس کے دوست نے فخر سے سینہ تان کر جواب دیا۔
اور جن بچوں کی مائیں نہیں ہوتیں تو......؟ انہیں کون بچاتا ہے باپ کی مار سے؟ بلال زیر لب بڑبڑا کر رہ گیا تھا۔
تب اس کی نظروں کے عین سامنے اس لمحے تاباں کا چہرہ ابھرا تھا۔ جو اس کی بہن تھی اور اسے جیسے آپ ہی آپ اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔
''تو تو پیدائشی ایکٹر ہے سالے...... جبکہ تیرا باپ خواب دیکھ رہا ہے تجھے ڈاکٹر بنانے کے۔ حالانکہ جو مزے ایکٹر بننے میں ہیں وہ بے چارے ڈاکٹر کے نصیب میں کہاں؟
جیدے نے اپنی دو انگلیاں منہ میں ڈال کر خالص لوفروں والے انداز میں سیٹی بجائی تو سبھی داد دینے والے انداز میں ہنس پڑے تھے۔
''یار آج دو بجے کے بعد چودھری سرفراز کے امرودوں والے باغ پر دھاوا بولنا ہے۔'' اچانک کسی کو یاد آیا۔
''دو بجے کے بعد کیوں...... ابھی چلو!''
''نہیں نہیں بھئی سمجھا کرو ناں۔ دو بجے کے بعد راکھا...... (رکھوالا) گھوڑے گدھے بیچ کر جو سو جاتا ہے۔''
''اور اپنے ماسٹر جی کہتے ہیں کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے......''
کھوتا یعنی ڈونکی...... (گدھا) کسی نے تشریح کی۔
اس پر سب کا مشترکہ قہقہہ دور تک گونجا تھا۔ سوائے بلال کے۔
وہ ابھی تک بے خیالی کے عالم میں سر جھکائے ہاتھ کی انگلی سے زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔
''او جگر...... تو کیوں اداس ہے بھئی!'' شیدے نے اس کے بازو میں چٹکی بھری۔
''دراصل اسے اپنا ابا یاد آ رہا ہے، چھڑی سمیت......'' جیدا شرارت سے کہتا تو سب بے ساختہ ہنس پڑتے، اور بلال خجل سا ہو کر خواہ مخواہ مسکرانے لگتا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ابا سے اسے پہلا تھپڑ اس وقت پڑا تھا کہ جس وقت اس کی عمر چار سال تھی اور اسے باہر گلی میں کھیلتے ہوئے کسی بچے نے مارا تو وہ روتا ہوا اس بچے کی شکایت لے کر گھر ابا کے پاس آیا تھا۔
مگر ابا کے جوابی رویے نے اسے حیران و پریشان کر دیا تھا۔
انہوں نے فوراً ہی اس کے دوسرے گال پر ایک زوردار چانٹا جڑتے ہوئے پوچھا تھا کہ کیا وہ بچہ تم سے زیادہ روٹیاں کھاتا ہے جو تم اس سے پٹ کر گھر میں آن گھسے ہو؟
جاؤ...... باہر جا کر اس کا مقابلہ کرو اور جب کھیلتے میں لڑائی ہو جایا کرے تو رونے منہ بسورنے اور دوسروں کی شکایت کرنے کی بجائے اپنا حساب کتاب وہیں بے باق کر آیا کرو۔''
''مگر ابا وہ لڑکا مجھ سے بہت بڑا تھا۔ اور قد کاٹھ میں بھی مجھ پر حاوی تھا۔'' اپنے تئیں بلال نے صفائی پیش کرنے کی

کوشش کی تھی۔

''تو کیا ہوا..... زیادہ سے زیادہ وہ تجھے دو چار تھپڑ، اور چند لاتیں گھونسے اور مار لیتا۔ مگر مقابلے پر تو آتا تو.....!

ابا کی اس عجیب وغریب منطق پر بلال اپنا رونا دھونا بھول کر ان کا منہ تکنے لگا تھا۔

اور پھر جلد ہی وہ سب بھول بھال کر دوبارہ باہر کھیلنے چلا گیا تھا اور پھر واقعی اس نے کبھی کسی کی شکایت ابا سے نہیں کی تھی۔

اپنا حساب کتاب خود ہی بے باق کر لیا کرتا تھا۔

مگر پھر ابا کے پاس اس کی شکایات آنے لگیں۔

اور یہ بات بھی ابا کو پسند نہیں آتی تھی۔ نتیجتاً بید کی چھڑی ہوتی اور وہ.....

اور پھر چند روز قبل جب کرکٹ کھیلنے کے دوران اس کا گاؤں کے چودھری کے لاڈلے پتر جمالے سے شدید جھگڑا ہو گیا۔ تو ماں بہن کے گالیوں کے جواب میں بلال نے اس کی ٹھیک ٹھاک چھترول کر دی تھی۔ ابا سے اتنا بڑا ''واقعہ'' بھلا کیسے چھپ سکتا تھا۔ سو وہ گھر میں داخل ہوتے ہی اس پر برس پڑے تھے۔

''ناں..... مجھے بتا کہ تو جگا بدمعاش ہے اس پنڈ کا؟''

''ہیں؟..... مولا جٹ بننے کا بڑا چاؤ ہے تجھے..... جو لخائی پڑائی (لکھائی پڑھائی) چھوڑ کے دادا گیری شروع کر دی ہے تو نے؟''

''م..... م..... میں سمجھا نہیں ابا جی۔'' بلال اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کے رہ گیا تھا۔

''فکر نہ کر..... ابھی سمجھا تا ہوں تجھے۔'' انہوں نے دیوار پر کیل کے سہارے لٹکی اپنی بید کی چھڑی اتار لی۔

''نا..... ابا نہیں.....'' اس کی بہن تاباں فوراً اس کے اور ابا کے درمیان میں آ گئی تھی۔

''اومت روک مجھے..... اگر میں نہیں ماروں گا تو چودھری کے اشارے پر پولیس پکڑ کے لے جائے گی اسے اور پھر حوالات میں بند کر کے تیل میں بھیگے ہوئے لتر سے چھترول کرے گی اس کی۔

''کیوں..... کیا کیا ہے اس نے؟'' اس کی بہن نے اسے اپنے پیچھے چھپاتے ہوئے چلا کر پوچھا تھا۔

''پوچھ کیا نہیں کیا اس نے؟'' ابا نے قہر آلود نگاہوں سے اسے گھورا۔

''اس نے..... اس نے چودھری کے پتر جمالے کو مار مار کے لہولہان کر دیا ہے۔ بقول چودھری اس کے بیٹے کی کلائی کی ہڈی میں بال آ گیا ہے (فریکچر ہو گیا ہے) وہ تو ڈاکٹری معائنے کی رپورٹ کے ساتھ پرچہ کرانے پر تیار بیٹھا تھا۔

مگر مجھے بروقت پتہ چل گیا تو میں نے جا کر منت ترلہ کیا تو تب کہیں جا کر وہ کچھ نرم پڑا۔ مگر غصہ ختم نہیں ہوا ابھی اس کا۔ کہہ رہا تھا کہ ماسٹر..... میں دیکھتا ہوں کہ تو اپنے لاڈلے پتر کو کس طرح سبق سکھاتا ہے۔ اب اپنی ماسٹری کا بھرم قائم رکھنا اور یاد رکھنا کہ اگر تجھے اپنے جیتے پتر کو مزا چکھانا نہ آیا تو پھر میں خود اس کے لیے کوئی ایسی سزا تجویز کروں گا کہ وہ گاؤں بھر کے لیے عبرت کا نشان بن جائے گا۔''

''اور خود چودھری نے کیا سکھایا ہے اپنے پتر کو؟ دوسروں سے خواہ مخواہ کا پنگا لینا اور ماں بہن کی گالیاں دینا۔ قسم خدا کی! اگر آج میرا بس چلتا ناں تو میں آج زبان ہی کاٹ ڈالتا اس کی۔'' بلال سب کچھ بھول بھال کر دوبارہ جوش میں آ گیا تھا۔

''اوئے اوئے..... چپ کر جا، کہیں میں گدی سے زبان نہ کھینچ لوں تیری۔'' ماسٹر جی دانت کچکچا کر دوبارہ اس کی

جانب بڑھے اور گدی پر ہاتھ جمانا چاہا مگر تاباں ایک بار پھر درمیان میں آ گئی۔

شاید اس کی آنکھوں میں پگھلتی التجا کا اثر تھا کہ ابا کا آگے بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا تھا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر وہ گالیاں بکتا ہے تو تو اس کے ساتھ کھیلتا ہی کیوں ہے؟ دنیا بھر کے لچے لفنگے تو دوست ہیں تیرے۔'' غصے کے مارے ابا کی آنکھیں جیسے حلقوں کی قید سے آزاد ہونے کو تیار تھیں۔

بلال نے خوف زدہ ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

وہ.....ہم.....م.....میرا مطلب ہے کہ میں کب کھیلتا ہوں اس کے ساتھ۔ آج تو وہ خود ہی آ گیا تھا کہ مجھے بھی کھلاؤ اپنے ساتھ۔ ہماری ٹیم کے لڑکے پورے تھے اس لیے ہم نے منع کر دیا۔ مگر اسے شاید چودھریوں کا لڑکا ہونے پر زعم تھا۔ چنانچہ وہ فوراً گالم گلوچ پر اتر آیا۔ اور زیادہ تر وہ مجھ سے ہی پنگا لے رہا تھا۔ کیوں کہ میں اپنی ٹیم کا کپتان جو تھا۔

''پھر.....؟''

''پھر کیا بس میں نے بچھا دیا اسے زمین پر۔'' بلال مری مری آواز میں بولا۔

واہ.....سورما جی! کیا بہادری دکھائی ہے آپ نے! حکومت سے کہہ کر شیلڈ نہ دلوا دوں آپ کو۔'' ابا طنز کے نشتر چلا رہے تھے اور بلال سر جھکائے کھڑا تھا۔

''اگرچہ اس مار پیٹ میں تیرے ساتھ تیرے دوست بھی شامل تھے مگر چودھری نے سارا الزام تجھ اکیلے پر دھر دیا ہے۔'' ابا نے اس کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔

بلال اپنی جگہ بے تابی سے پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔

''خیر.....جو ہوا بہت برا ہوا، شاید تجھے اندازہ نہیں ہے بلا لے کہ تو نے اپنے باپ کے حق میں کیسے کانٹے بو دیئے ہیں۔'' ماسٹر جی تھکے ہارے انداز میں صحن میں بچھی بان کی کھردری چارپائی پر ڈھے سے گئے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

جبکہ بلال ہنوز مجرموں کی طرح سر جھکائے ان کے سامنے مودب کھڑا تھا۔

''مجھے معاف کر دے ابا'' ماسٹر جی کو کسی گہری سوچ میں ڈوبے دیکھ کر بلال آہستگی سے منمنایا تھا۔

''ابا.....!'' بلال نے انہیں دوبارہ پکار کر اپنی جانب متوجہ کیا تو وہ ایک خالی سی نظر اس پر ڈال کر رہ گئے۔

میری طرف سے تو معافی ہی معافی ہے مگر بات تو تب ہے کہ جب چودھری تجھے معاف کر دے!

''نہیں نہیں.....میں چودھری اور اس کے پتر سے معافی شافی نہیں مانگوں گا۔'' بلال ابا کا مطمع نظر جان کر تڑپ اٹھا تھا۔

''ٹھیک ہے مت مانگ معافی.....اپنے گھر والوں کا حقہ پانی بند کرا لے۔ پیو کی کھڑی فصلوں میں آگ لگوا کر تیرے دل کو سکون ملتا ہے تو یوں سہی۔ اور جب کسی رات چند نامعلوم نقاب پوش دیوار پھاند کر آئیں گے اور ہماری ساری عزت خاک میں ملا جائیں گے تو تو تب بھی ماش کے آٹے کی طرح اکڑا رہنا۔'' ابا کا لہجہ سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھا۔

''سچ بتا بلال.....کیا تجھے اپنی جوان بہن کا خیال بھی نہیں ہے؟'' اسے خاموش کھڑے دیکھ کر ابا نے قدرے نرمی سے استفسار کیا تو بلال کی نظریں بے ساختہ اپنے سے ایک سال بڑی تاباں کی جانب اٹھ گئیں۔ جو شدید اضطرابی کیفیت میں اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبائے کسی گہری سوچ میں غلطاں تھی۔ اور بے خیالی کے عالم میں اپنے آنچل کا کونا بار بار انگلی پر لپیٹ اور کھول رہی تھی۔

''دیکھ پتر.....دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں باندھا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ تو سمجھتا ہے ان معاملات کو۔ اب اتنا بچہ بھی نہیں ہے، ماشاءاللہ اس جاڑے میں پورے سترہ سال کا ہو جائے گا۔'' ابا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے ابا.....میں چودھری کے پاس جانے کو تیار ہوں۔'' بلال نے بالآخر سپر ڈال دی تھی۔

پھر وہ کس دل سے ابا کے ساتھ چودھری کے پاس گیا اور کس طرح اس سے اور اس کے لاڈلے سپوت سے معافی مانگی یہ ایک الگ کہانی تھی۔ تاہم بڑی مشکلوں کے بعد بھری پنچایت میں بلال سے معافی نامہ لکھوایا گیا۔ جس پر گاؤں کے سرپنچوں نے دستخط کیے اور یوں بلال اور اس کے گھرانے کی جان چودھریوں سے چھوٹی۔

مگر اس کے بعد سے چودھری کے بیٹے جمالے نے بلال کی زندگی عذاب بنا دی تھی وہ جہاں بلال کو دیکھتا تو اپنے دوستوں کے ہمراہ اس پر آوازیں کستا اور ذومعنی فقرے اچھالتا۔ نتیجتاً بلال کو اپنا راستہ بدلنا پڑتا۔

اس طرح کے چند واقعات کے بعد بلال کافی بدل کر رہ گیا تھا۔

اس کی زندگی سکول سے گھر اور گھر سے سکول تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ویسے بھی میٹرک کے امتحانات سر پر تھے اور وہ پوری دلجمعی کے ساتھ امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔

اس بار وہ ابا کو شکایت کا کوئی موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کی دلی خواہش تھی کہ بید کی چھڑی اور اس کا ازلی ساتھ اب ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے۔

اپنی طرف سے تو اس کے سارے پرچے اے ون ہوئے تھے۔ پھر یہ کیا ہو گیا تھا اس کے ساتھ.....

بلال کو ابھی تک یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سچ مچ اس بری طرح فیل ہوا ہے۔

بھاگتے بھاگتے اچانک اسے زوردار ٹھوکر لگی تھی اور خیالات کا سارا تانا بانا ٹوٹ گیا پھر اگلے ہی لمحے وہ منہ کے بل نیچے جا گرا تھا، اور اس کے ساتھ ہی اس کا سر لوہے کی کسی سخت شے سے جا ٹکرایا تھا۔ یہ ٹرین کی پٹڑی تھی۔ جس سے سر لگنے کے بعد اس کی آنکھوں تلے چنگاریاں سی ناچ اٹھی تھی۔

پٹڑی میں پایا جانے والا ارتعاش اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ اگلے چند لمحوں میں ٹرین یہاں پہنچنے والی ہے۔

اور پھر قریب.....بہت قریب سے ٹرین کی وسل سنائی دینے لگی تھی۔

☆☆☆

شام کا اندھیرا جوں جوں پھیلتا جا رہا تھا۔ تاباں کی بے چینی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔

آج ماسٹر جی ابھی تک گھر پہنچے تھے اور نہ بلال آیا تھا۔

تاباں نے رات کے لیے سرشام ہی روٹی پکا کر ڈلیا میں رکھ چھوڑی تھی۔ اور پھر چولہے میں سے جلتی ہوئی لکڑیاں باہر کھینچ کر ان پر پانی کا چھینٹا دیتے ہوئے دہکتے کوئلوں پر سالن گرم ہونے کے لیے رکھنے کے بعد لکڑی کی چھوٹی سی سیڑھی لگا کر دیوار سے خالہ رحمتی کے گھر جھانکنے لگی تھی۔

خالہ نے اس وقت تنور تپایا ہوا تھا اور گرما گرم روٹیاں اتار رہی تھی۔

''ماسی.....ذرا چنو کو بھیج کر شیدے اور جیدے کے گھر پتہ کرا دو کہ بلال تو نہیں ہے وہاں! جوں صبح کا گھر سے نکلا.....وہ اب تک واپس نہیں لوٹا۔'' تاباں بالکل رو دینے کو تھی۔

اس کی گھبرائی گھبرائی سی آواز سن کر ماسی بھی پریشان ہو گئی اور لگی چنوں کو پکارنے۔

تبھی مجیداں جو تاباں کی سہیلی اور ماسی رحمتی کی بیٹی تھی، آواز سن کر کمرے سے باہر نکلی آئی اور اڑی اڑی سی رنگت والی

تاباں کو دلاسہ دینے لگی۔

''فکر نہ کر..... آجائے گا بلال..... بھلا کہاں جانا ہے اُس نے..... چل تو گھبرا مت میں تیرے پاس آجاتی ہوں.....'' یہ کہہ کر مجیداں فوراً ہی اپنے گھر کے دروازے سے نکل کر تاباں کے صحن میں داخل ہوگئی اور اس کے دل بہلانے کو ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی مگر تاباں کا دل کسی بات میں نہیں لگ رہا تھا۔

اور اس کی پریشانی اس وقت سوا ہوگئی کہ جب چنوں یہ خبر لایا کہ بلال اپنے کسی دوست کے گھر موجود نہیں۔ اور نا صبح سے لے کر اب تک کسی نے اسے دیکھا تھا۔

تاباں کا دل گویا کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ ڈالا تھا۔

اس نے گاؤں کے مزید لوگوں سے پتہ کرایا۔ مگر بلال کا کہیں نام و نشان نہیں تھا، اسی اثناء میں ماسٹر جی بھی گھر آگئے تھے اور آج وہ غیر معمولی حد تک بے حد خوش تھے۔

کیوں کہ آج بلال کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا اور وہ میٹرک میں فرسٹ ڈویژن لے کر پاس ہوا تھا اور اسی خوشی میں آج وہ گاؤں بھر میں بانٹنے کے لیے چھیے حلوائی کی دکان سے گرما گرم جلیبیاں بنوا کر لائے تھے۔ مگر گھر آ کر جب انہوں نے بلال کی گمشدگی کی خبر سنی تو ان کے پیروں تلے سے جیسے زمین ہی سرک گئی اور وہ چکرا کے رہ گئے۔

آناً فاناً جنگل کی آگ کی طرح بلال کے گم ہو جانے کی خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی اور لوگ دریافت حال کے لیے ماسٹر جی کے گھر جمع ہونے لگے۔

ان کے قریبی ہمسائے حق ہمسائیگی ادا کرتے ہوئے نا صرف بلال کے گھر والوں کا خیال رکھ رہے تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بلال کی تلاش میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے اور اسی سلسلے میں گاؤں کی قریبی مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے بار بار بلال کی گمشدگی کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ مگر نتیجہ ابھی تک ڈھاک کے تین پات والا تھا۔

پھر رات گئے تک ہر طرف سے مایوس ہو کر کسی خیر خواہ نے تھانے جا کر بلال کی گمشدگی کی رپٹ بھی درج کرا دی تھی۔

طلال کو بھی اس واقعے کی اطلاع کر دی گئی تھی اور اس کی آمد کا انتظار تھا۔ یہ رات کسی قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھی۔

ماسٹر جی اور ان کی بیٹی تاباں پل پل بے تابی سے پہلو بدل رہے تھے اور ایک دوسرے سے اپنے آنسو چھپا رہے تھے۔

صبح نماز فجر کے اذان کے ساتھ ہی کسی نے ماسٹر جی کے صحن کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا تو دونوں باپ بیٹی کے دل بے ساختہ اچھل کر حلق میں آ گئے۔

''کون ہو سکتا ہے بھلا؟'' دونوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

''میں دیکھتا ہوں پتر..... چاچا غنی ان کے پڑوسی جو رات بھر سے اس پریشانی کے عالم میں ان کی دلجوئی کے خیال سے ان کے پاس ٹھہر گئے تھے اٹھتے ہوئے بولے تو ماسٹر جی بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان دونوں کو دروازہ کھول کر باہر کی سمت جاتے دیکھ کر تاباں بھی اپنی پڑوسنوں کی معیت میں دروازے تک بڑھ آئی تھی۔

''پولیس والے ہیں..... شاید کچھ بتانے آئے ہیں۔'' ماسی رحمتی نے دروازے کی جھری سے آنکھ ہٹا کر سرگوشی کے سے انداز میں اطلاع دی تو تاباں بے تابی سے آگے بڑھ آئی۔ اور باہر کی سمت سے آنے والی آوازوں کی جانب کان لگا

دیئے۔

یہ گونج دار آواز شاید پولیس کی نفری کے ساتھ موجود اے ایس آئی کی تھی۔

''ماسٹر جی! اس گاؤں سے سترہ کلومیٹر دور کماد کے کھیتوں کے ساتھ سے گزرنے والی ریلوے لائن پر ایک نوعمر لڑکے کی لاش ملی ہے، ذرا ہمارے ساتھ چل کر شناخت کرلو کہ کہیں یہ تمہارا گمشدہ بیٹا بلال تو نہیں.....!''

☆☆☆

ان اللہ مع الصابرین O

''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

''حوصلہ کرو بھائی، تم تو ویسے بھی بڑے حوصلے والے ہو۔''

''تو اور کیا!''

''ہم سب اللہ کی امانت ہیں اور لوٹ کر اسی کی طرف جانا ہے۔''

گاؤں والے بڑی محبت سے ماسٹر جی کے شانے کو تھپتھپا کر تسلیاں دے رہے تھے۔ جیسے ان سب کو اس بات کا کامل یقین ہو کہ وہ ان تسلیوں کے صحیح معنوں میں مستحق ہیں اور ریلوے ٹریک سے برآمد ہونے والی لاش سو فیصد بلال کی ہی ہو گی۔

انتہائی ضبط کا مظاہرہ کرنے کے باعث ماسٹر جی کا گندمی چہرہ سرخ ہو چلا تھا۔ مگر وہ چٹان کی طرح اپنے قدموں پر مضبوطی سے جمے کھڑے تھے۔

گرچہ ان کے لب سختی سے بھینچے ہوئے تھے، تاہم آنکھیں ہر قسم کے تاثرات سے خالی تھیں، لوگوں کے اظہار ہمدردی کے جواب میں وہ خالی خالی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ کر اپنے سر کو خفیف سی جنبش دیتے اور پھر فوراً ہی منہ پھیر کر کسی دوسری جانب متوجہ ہو جاتے۔ مبادا کوئی ان کی آنکھوں میں چمکنے والے آنسو نہ دیکھ لے۔

حتیٰ کہ آج انہوں نے چودھری کی بطور ''خاص'' اپنے گھر میں ''آمد'' کی خبر بھی بڑے سرسری انداز میں سنی تھی۔

اتنی اہم اطلاع کے باوجود انہوں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور نہ کار سے اترتے چودھری کے استقبال کے لیے بے قراری سے آگے بڑھے تھے۔

تب چودھری نے خود ہی آگے بڑھ کر ماسٹر جی کو گلے لگا لیا تھا اور پھر وہی رٹے رٹائے ڈائیلاگ جنہیں سن سن کر ماسٹر جی کے کان پک گئے تھے۔

اے ایس آئی کے حکم پر پولیس والوں کی وین ہی میں ماسٹر جی کے ہمراہ گاؤں کے دو تین معززین کو بٹھا لیا گیا تو چودھری بھی تجسس سے مجبور ہو کر ڈرائیور کے ہمراہ اپنی کار میں پولیس کی گاڑی کے ساتھ ہو لیا تھا۔ یوں یہ سب جائے حادثہ کی جانب روانہ ہوئے تھے۔ راستے میں بھی ماسٹر جی کے پڑوسی انہیں بھرپور انداز میں تسلیاں دیتے رہے تھے۔ مگر ماسٹر جی ان تمام باتوں سے بے نیاز چپ چاپ کھڑکی سے باہر دور خلاؤں میں جانے کیا تکتے جا رہے تھے۔

یہ سترہ کلومیٹر سترہ سو کلومیٹر بن گئے تھے۔

راستہ تھا کہ کسی طور کٹنے میں ہی نہیں آ کے دے رہا تھا۔

خدا خدا کر کے آخر کار دور سے کماد کے کھیت نظر آنے لگے تو ماسٹر جی کا دل گویا ان کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔

وہ بے چینی سے بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے اور اک عالم اضطراب میں پہلو بدل کر رہ جاتے۔

کبھی بے ساختہ سر اوپر اٹھا کر نظریں کھڑکی سے باہر نظر آنے والے آسمان پر جما دیتے جیسے دل ہی دل میں اپنے رب سے کوئی فریاد کرنا چاہتے ہوں......

پھر عجب بے کسی کے سے انداز میں سر جھکا کر اپنی پیشانی پر چمکنے والے پسینے کے قطروں کو اپنے کرتے کے دامن میں جذب کرنے لگتے۔

جیسے ہی وین نے دائیں جانب موڑ کاٹتے ہوئے ایک کچے راستے پر ٹرن لیا تو سامنے ہی ریل کی سیاہ پٹڑی نظر آنے لگی۔

اور ان کی گاڑی اس ریلوے ٹریک کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگی۔

کچھ دور مزید آگے جانے کے بعد انہیں دور سے سپاہی کی وردی میں ملبوس ایک پولیس مین نظر آیا جو بڑی بے تابی سے ان کا منتظر تھا۔

جیپ سیدھی اسی کے پاس جا کر رکی تھی، اور ان کی جیپ کے پیچھے چودھری نے بھی اپنی گاڑی رکوالی تھی۔

''آیئے ماسٹر صاحب!'' وین کا دروازہ کھولنے والے سپاہی نے انہیں وین سے اتر کر باہر آنے کا اشارہ کیا۔

جائے حادثہ پر موجود، لاش کی نگرانی پر مامور سپاہی نے آگے بڑھ کر اپنے اے ایس آئی کو ایک زوردار سلیوٹ پیش کیا۔

''سر جی! آپ بڑے موقعے پر پہنچے ہیں، میں ابھی آپ کو موبائل پر اطلاع کرنے ہی والا تھا۔''

''اطلاع؟ کس بات کی؟'' اے ایس آئی نے چونک کر پوچھا۔

''وہ......سر جی......یہاں ایک حادثہ اور ہو گیا ہے۔''

''کیا......؟ کیسا حادثہ؟ تمہارا ساتھی حنیف کہاں ہے اور لاش......؟؟ اے ایس آئی نے متوقع لاش کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے ایک ساتھ کئی سوالات داغ دیئے تھے۔

''و......وہ......وہی تو بتانے لگا ہوں سر جی۔'' سپاہی جس کا نام دین محمد تھا نے بمشکل تمام اپنا تھوک نگل کر ہکلاتے ہوئے جواب دیا اور پھر نہایت جوش کے عالم میں پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ شروع ہو گیا۔

''سر جی! میں اور حنیف آپ کے انتظار میں لاش کے پاس موجود تھے کہ حنیف کو اچانک حاجت محسوس ہونے لگی۔ اور وہ کماد کے کھیتوں میں گھس گیا۔ جہاں اسے سانپ نے ڈس لیا۔ اس کی چیخ کی آواز سن کر میں فوراً اس کی جانب دوڑا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حنیف کا سارا بدن نیلا کچ کا کچ ہو رہا تھا۔ اور وہ سخت اذیت میں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا کوئی نادیدہ قوت پوری طاقت سے اس کا گلا دبا رہی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی باچھوں سے سفید جھاگ سا بہنے لگا اور وہ میرے سامنے تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

''اب کہاں ہے حنیف میرا مطلب اس کی لاش؟'' اے ایس آئی نے اپنی ہتھیلی پر سٹک مارتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

''وہ سامنے کھیتوں میں......!'' سپاہی دین محمد نے ایک طرف اشارہ کیا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' اے ایس آئی نے اسی جانب قدم آگے بڑھا دیئے اور اس کی تقلید میں باقی سارے لوگ بھی اس کے ساتھ ہو لیے تھے۔ جن میں ماسٹر جی اور ان کے تمام ساتھی چودھری سمیت شامل تھے۔

''اوہ......'' اے ایس آئی نے سپاہی حنیف کی لاش پر ایک تاسف بھری نظر ڈالی اور سپاہی دین محمد کی طرف مڑا۔

''مگر تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ حنیف کی موت دراصل سانپ کے [illegible]

''جناب! میں جیسے ہی حنیف کے پاس پہنچا تو اس نے ہاتھ سے ایک جانب اشارہ کیا۔ میں نے [illegible] پگڈنڈی پر ایک سیاہ سانپ تیزی سے آگے کی طرف بھاگا جا رہا تھا جس کی لمبائی کم از کم ڈیڑھ گز تو ضرور ہو گی [illegible] کے علاوہ حنیف کی پنڈلی پر سانپ کے دانتوں کے واضح نشان بھی موجود تھے جن سے خون رس رہا تھا۔

سپاہی دین محمد کی بات کی تصدیق کے لیے اے ایس آئی نے خود آگے بڑھ کر مرحوم سپاہی کی پنڈلی چیک کی تو واقعی اس پر سانپ کے دانتوں کے نشانات موجود تھے۔ البتہ ان سے رستا ہوا خون جم کر سیاہی مائل رنگت اختیار کر چکا تھا۔

اے ایس آئی جس کا نام گل زار تھا، کچھ دیر تک لب بھینچے کھڑا سوچتا رہا اور پھر جیب سے موبائل نکال کر اپنے افسران بالا کو اس ''نئے'' حادثے کی بابت بتانے لگا اور دوسری جانب سے ملنے والی رہنمائی کی روشنی میں اپنے جونیئرز کو حنیف کی لاش سے متعلق ہدایات دیتے ہوئے وہ جیسے اچانک چونک پڑا تھا۔ ''دین محمد! ریلوے ٹریک سے ملنے والی لاش کہاں ہے؟''

''وہ سر جی! میں آپ کو بتانے ہی والا تھا مگر کیسے بتاؤں! حوصلہ نہیں پڑتا۔ میں تو اس لاش کے بارے میں خود بڑا حریان و پریشان (حیران و پریشان) ہوں...... خدا جانے وہ لاش سچ مچ کسی انسان کی تھی یا پھر...... یا پھر...... لاش کا روپ دھار کر وہ کوئی چھلاوہ تھا......!!

یہ بات کہتے ہوئے اس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔

دین محمد کی بات سن کر اے ایس آئی کی تیوری پر بل پڑ گئے اور اس نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی مگر پھر یکدم اسے نظر انداز کرتے ہوئے حنیف محمد کی لاش کے بارے میں اپنی ہدایات مکمل کیں اور پھر قدرے فرصت سے دین محمد کی جانب متوجہ ہوا۔

''ہاں دین محمد! اب کہو...... مگر یاد رکھو کہ میں یہاں تمہاری پہیلیاں بوجھنے کے لیے نہیں آیا۔ جو کہنا ہے بس جلدی سے کہہ ڈالو تاکہ آگے کی کارروائی مکمل کی جا سکے۔ اے ایس آئی نے ڈپٹ کر کہا تو سپاہی دین محمد نے محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور قدرے سرگوشی کے سے انداز میں نزدیک آ کر بتانے لگا۔

''بات دراصل یہ ہے سر جی کہ...... جب حنیف کے بدن میں زندگی کے کوئی آثار نہیں رہے تو میں اسے وہیں چھوڑ کر واپس بھاگا۔ اور جب واپس اس جگہ پہنچا جہاں لاش پڑی تھی تو یہ دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے کہ...... دور دور تک ریلوے ٹریک بالکل خالی پڑا تھا۔ اور اس کے آس پاس کوئی لاش موجود نہیں تھی......!''

''کیا؟'' اے ایس آئی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''ایسا کیسے ممکن ہے؟'' اس نے بے یقینی سے سپاہی دین محمد کی طرف دیکھا۔

اس کی بات سن کر ماسٹر جی کے چہرے پر بھی یکدم زلزلے کے سے تاثرات ابھرے تھے جبکہ ان کے ساتھ کے باقی تمام لوگ بھی حیرت و فطری تجسس سے مجبور ہو کر مزید چند قدم آگے بڑھ آئے تھے اور سب دین محمد کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''مجھے اپنی مری ہوئی ماں کی قسم جناب! میں جھوٹ نہیں بول رہا......!'' سپاہی دین محمد نے اپنی بات کی سچائی ثابت کرنے کے لیے قسم تک کھا لی۔

حنیف کے پاس سے یہاں تک پہنچنے میں مجھے زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگے ہوں گے مگر جب میں واپس آیا تو......

لاش غائب تھی۔ یہ بات بتاتے ہوئے دین محمد کی آواز میں ہلکی سی لرزش نمایاں تھی۔

''مجھے تو یہ علاقہ ویسے بھی کچھ کچھ آسیب زدہ سا لگتا ہے جناب..... ہم جس لاش کو لینے کے لیے آئے تھے وہ غائب ہے البتہ اس کی جگہ جیتا جاگتا حنیف بے جان لاش میں بدل گیا ہے۔ دین محمد نے ایک بار پھر سرگوشی کی اور محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''افوہ..... ایسی بے سروپا باتیں مت کرو دین محمد! جب اے ایس آئی نے دیکھا کہ اس کی باتوں سے باقی لوگ بھی سراسیمہ سے دکھائی دینے لگے ہیں تو اسے مجبوراً دین محمد کو ڈانٹنا پڑا تھا۔ تاہم وہ خود سوچ میں پڑ گیا تھا۔

اتنی جلدی کہاں غائب ہو سکتی تھی لاش.....

نزدیک ترین گاؤں بھی یہاں سے کم سے کم آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ جبکہ گاؤں کو سڑک سے ملانے والا راستہ بھی دوسری جانب سے گزرتا تھا۔ ادھر تو تاحد نظر صرف کھیت ہی کھیت تھے اور جس کچے راستے پر اپنی گاڑیاں ڈال کر وہ لوگ یہاں تک پہنچے تھے، وہ بھی یہاں تک آ کر ختم ہو گیا تھا۔ عام افراد کا گزر اس طرف سے کم ہی ہوا کرتا تھا اور صرف کاشت کار یا راکھے ہی کھیتوں میں کام کرنے کی غرض سے یہاں آیا کرتے تھے۔ مگر جب سے لاش کی افواہ پھیلی تھی۔ کوئی اس طرف سے گزرا تک نہیں تھا کہ مبادا پولیس اسے ہی مشتبہ سمجھ کر نہ دھر لے۔

پولیس والوں کے جبر و زبردستی سے ہر کسی کا خائف رہنا ایک عام سی بات تھی اور اسی لیے لوگ تفتیش میں مدد دینے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں انہیں ہی مجرم بنا کر عدالت میں پیش نہ کر دیا جائے۔

ممکن ہے کہ آوارہ کتے لاش کو اپنی ضیافت کا بندوبست سمجھ کر نزدیکی کھیتوں میں گھسیٹ لے گئے ہوں۔ اے ایس آئی نے سوچا مگر پانچ فٹ نو انچ کے ایک صحت مند آدمی کی لاش کو یوں چند کتوں کا گھسیٹ لے جانا بڑی حیرت انگیز بات تھی۔ تاہم اپنے مفروضے کی تصدیق کے لیے اے ایس آئی کے حکم پر پولیس اہلکاروں نے آس پاس کے سارے کھیت چھان مارے تھے مگر لاش وہاں کہیں بھی نہیں تھی اور نہ کوئی کتا دکھائی دیا تھا بالفرض اگر کتوں والی بات کو عقل تسلیم کر بھی لیتی اور یہ سمجھا جاتا کہ کتوں نے لاش کو کھا لیا ہوگا۔ تب بھی لاش کی باقیات یا کم سے کم ہڈیاں تو ملنی چاہیے تھیں۔

اور اگر یہ قیاس کیا جاتا کہ لاش کو اس کے لواحقین یا کوئی اور جرائم پیشہ افراد کسی خاص مقصد سے اٹھا کر لے گئے ہیں تو تب بھی محض دس منٹ کے قلیل عرصے میں اتنی خاموشی کے ساتھ یہ کام سرانجام دینا ناممکن تھا۔ اور ظاہر ہے کہ خود لاش چل کر کہیں جا نہیں سکتی تھی۔ عجب الجھا ہوا کیس تھا۔

اس عجیب و غریب صورتحال پر اے ایس آئی خود بھی چکرا کے رہ گیا تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے جناب کہ یوں پڑے پڑے لاش اچانک غائب ہو جائے!!'' ماسٹر جی کے ساتھ آئے ہوئے چودھری صاحب نے کسی گہری سوچ میں ڈوبے اے ایس آئی کو مخاطب کیا۔

''ہوں.....'' اے ایس آئی چونکا۔

یہاں سب کچھ ممکن ہے چودھری صاحب! اور ہماری پیشہ ورانہ ذمہ داری یہی ہے کہ ہم ناممکنات میں سے ممکن اور ممکنات میں سے ناممکن کو تلاش کریں اور درست حقائق کا سراغ لگا کر اصل مجرموں تک پہنچیں۔'' اے ایس آئی نے دھیرے سے کہا۔

''مگر یہ کیس تو خاصا مشکل ہے۔'' چودھری نے پھر کہا۔

ہمیں معاملات کا حل تڑے میں سجا سجایا کبھی نہیں ملتا۔ ہمارے لیے ہر ''کیس'' اک نیا چیلنج ثابت ہوتا ہے۔'' اے

ایس آئی نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''کیا یہ مرنے والے لڑکے کے لواحقین ہیں؟'' سپاہی دین محمد نے اے ایس آئی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا۔

ابھی تو یہ بات خود انہیں بھی نہیں معلوم۔ اے ایس آئی نے جواب دیا۔

''میں سمجھا نہیں جناب.....!!'' سپاہی دین محمد نے پلکیں جھپکیں۔

یہ ساتھ والے گاؤں کے مڈل سکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔ دراصل ان کا بیٹا جو دسویں جماعت کا طالب علم تھا، گم ہو گیا ہے۔ یہ اس کی تلاش میں یہ دیکھنے کے لیے یہاں آئے تھے کہ ریل گاڑی تلے آ کر مرنے والا لڑکا کہیں ان کا بیٹا تو نہیں تھا!''

''سر جی! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہ تو میں انہیں ابھی بھی دکھا سکتا ہوں۔'' دین محمد نے سٹیج پر کھڑے شعبدہ بازی کے اس ماہر جادوگر کی مانند فخر سے سینہ پھلا کر دعویٰ کیا جو سفید رومال سے کبوتر بنانے کا فن جانتا ہو۔

''کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟'' ماسٹر جی پہلی بار خود پر قابو نہیں رکھ سکے اور بے تابی سے آگے بڑھے جبکہ ان کی تقلید میں ان کے ساتھ باقی لوگ بھی آگے بڑھ آئے تھے۔

''نا..... تمہارے ہاتھ کون سا جام جمشید لگ گیا ہے؟'' اے ایس آئی نے چڑ کر پوچھا۔

''جام جمشید یہی سمجھیں سر جی..... یہ دیکھیں.....!'' سپاہی دین محمد نے اپنی جیب سے نیا نکور موبائل نکالتے ہوئے پہلے اے ایس آئی کی جانب فخریہ نظروں سے دیکھا۔ پھر چاروں طرف ایسے داد طلب نظریں دوڑائیں۔ جیسے شہر سے قیمتی کھلونا خریدنے والا بچہ، پہلی بار اسے اپنے دوستوں کو دکھا کر ان کی آنکھوں میں ابھرنے والی لالچ واشتیاق کی چمک سے محظوظ ہو رہا ہو۔

یہ موبائل سیٹ بھی ابھی چند روز قبل ہی تو دین محمد کا بھتیجا اس کے لیے ''باہر'' سے لے کر آیا تھا۔ اور اسی سے دین محمد نے کال ملانے اور اٹینڈ کرنے کے علاوہ اس کے کیمرے کا استعمال بھی سیکھ لیا تھا۔

اپنے نئے موبائل کی خوشی میں وہ اپنا ''بیلنس'' ضائع ہونے کی پروا کیے بغیر اپنے دوست احباب اور رشتہ داروں کا نمبر ملا کر نا صرف ان سے لمبی لمبی گفتگو کیا کرتا بلکہ جب اور جہاں موقع ملتا فوراً اپنے موبائل کے کیمرے سے تصاویر اتار کر اپنا فوٹو گرافی کا شوق پورا کرتا۔

اور آج بھی نا جانے کیوں اس نے بس یوں ہی عادتاً اپنا موبائل جیب سے نکال کر ٹرین تلے آ کر مرنے والے لڑکے کی مختلف زاویوں سے فوٹوز بنالی تھیں اور اب یہ سوچ کر پرجوش ہوا جا رہا تھا کہ اس کی یہی عادت دراصل کسی کے کام آنے جا رہی ہے۔

''یہ..... یہ دیکھیں'' اس نے موبائل کا کوئی بٹن پش کیا تو اس کی سکرین پر مرنے والے لڑکے کا چہرہ روشن ہو گیا تب اس نے موبائل ماسٹر جی کی طرف بڑھا دیا۔

ماسٹر جی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ موبائل کو پکڑتے مگر جیسے تیسے کپکپاتے ہاتھوں سے موبائل کو تھام ہی لیا۔

خاصی پاس سے لی گئی تصویر تھی جس میں چہرے کے تمام خدوخال واضح تھے۔ مگر ماسٹر جی کی آنکھیں آنسوؤں سے کچھ اس طرح لبریز تھیں کہ اشکوں کی دھند میں پہلے تو انہیں کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ پھر جب انہوں نے اپنے کرتے کی آستین سے اپنی آنکھیں پونچھ کر دوبارہ موبائل سکرین پر نظر دوڑائی تو یہ دیکھ کر انہیں اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا کہ..... تصویر

میں نظر آنے والا لڑکا ان کا بلال ہرگز نہیں تھا۔

کچھ دیر تک تو ماسٹر جی یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ آیا وہ اس لڑکے کے بلال نہ ہونے پر کھل کر اپنی خوشی کا اظہار کریں یا پھر ابھی تک اس کے لاپتہ رہنے کا ماتم شروع کر دیں۔

''یہ جانے کس بدنصیب کا نورِ چشم تھا جو نامعلوم وجوہ کی بناء پر یوں ٹرین تلے آ کر کٹ مرا تھا۔'' انہوں نے لاش پر ایک تاسف بھری نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔

''اور..... اور..... جانے ان کا اپنا لختِ جگر بلال اس وقت کہاں اور کن حالات سے دوچار ہوگا۔'' یہ سوچ کر بے اختیار ان کا دل بھر آیا تھا اور تب باوجود کوشش کے وہ گھٹی گھٹی سسکیاں بھرنے لگے تھے۔

یہ رونے کا نہیں بلکہ شکرانے کی نوافل ادا کرنے کا مقام ہے ماسٹر جی!

مرنے والے تو کبھی لوٹ کر واپس نہیں آ سکتے البتہ اگر خدا چاہے تو اس کی قدرت سے بچھڑنے والے ضرور دوبارہ مل جایا کرتے ہیں۔ دیکھنا بلال بھی ایک نہ ایک دن ضرور مل جائے گا۔ ماسٹر جی کے ساتھ آنے والوں نے بھی تصویر دیکھ کر جان لیا تھا کہ ٹرین تلے آ کر جان گنوانے والا لڑکا بلال نہیں تھا۔ تبھی ماسٹر جی کو دلاسے دے رہے تھے۔

''ہاں جی..... ابھی آس تو ختم نہیں ہوئی ناں۔ ویسے بھی سیانے کہتے ہیں کہ جب تک سانس تب تک آس۔'' چودھری بھی آگے بڑھ کے بولا۔ تو ماسٹر جی اپنے آنسو پونچھ کر سر ہلانے لگے۔

''آپ تسلی رکھیے ماسٹر جی! ہم اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہیں برتیں گے اور بلال کو جلد از جلد ڈھونڈ نکالنے کی پوری کوشش کریں گے۔'' اے ایس آئی نے بھی ماسٹر جی کا شانہ تھپتھپا کر انہیں تسلی دی۔

''آیئے ماسٹر صاحب! واپس چلتے ہیں گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' ماسٹر جی کے پڑوسی نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ہاں میرا خیال ہے کہ اب آپ لوگ واپس جائیں مگر واپسی کے لیے آپ کو چودھری صاحب کی گاڑی میں جانا ہوگا۔ کیوں کہ سرکاری گاڑی پر تو مجھے اس کیس کی تفتیش کے سلسلے میں آگے جانا ہے۔ سب آرام سے پورے آ جائیں گے میری کار میں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ چودھری نے اے ایس آئی کی جانب مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اگر بلال کے بارے میں کوئی بات معلوم ہو یا کوئی اطلاع ملے تو میرے علم میں ضرور لانی ہے۔ یہ کہہ کر اے ایس آئی نے ان سب سے ہاتھ ملا کر انہیں رخصت کر دیا۔

☆☆☆

لوہے کی پٹڑیوں کا ارتعاش بڑھ رہا تھا۔

بلال کی کمزور پڑتی سماعتیں اپنے کہیں بہت نزدیک سے شدید گڑگڑاہٹ کی آواز سن رہی تھیں۔

پھر اس نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے ٹرین کے بھاری بھرکم لوہے کے پہیوں کو تیزی سے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو اپنے بدن کی تمام تر ہمتوں کو یکجا کرتے ہوئے تیزی سے دائیں جانب کروٹ بدلنے کی کوشش کی تو ریل کی پٹڑیوں کے ساتھ پڑے ہوئے نوکیلے پتھروں کی اونچی ڈھلوان پر تیزی سے نیچے کی طرف لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے تن بدن کا کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔

جانے وہ کتنی دیر خود سے یونہی غافل پڑا رہا تھا اور جب اسے ہوش آیا تو چاروں طرف شام کا ملگجا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ بلال نے دیکھا کہ وہ ریتلی زمین پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ جہاں چاروں طرف ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔

یکدم ہی اسے اس وحشت ناک سناٹے سے خوف محسوس ہونے لگا اور وہ پھرتی سے اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے

کپڑوں سے ریت جھاڑنے لگا۔

صبح کے ناشتے کے بعد سے لے کر اب تک اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اس لیے اس وقت بھوک چمک اٹھی تھی۔ مگر وہاں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

گھر میں روزانہ اس وقت تاباں رات کے کھانے کے لیے توے پر سے گرما گرم چپاتیاں اتارا کرتی تھی اور سب سے پہلے بلال ہی کو کھانا دیا کرتی تھی۔ کیوں کہ ابا تو اکثر شام کو دیر سے گھر آتا تھا جبکہ بلال گراؤنڈ سے کھیل کر آتے ہی ''بھوک بھوک'' کا شور مچادیا کرتا تھا۔

تاباں کو معلوم تھا کہ بلال کو کھانے میں گوشت کا سالن بہت پسند ہے اور بطور خاص جس روز آلو گوشت کا سالن پکا ہو اس روز وہ بڑی رغبت سے کھانا کھاتا تھا۔ جبکہ دال سبزی والے دن وہ بڑی بے رغبتی سے بہت تھوڑا سا کھانا کھا کر جلد ہی ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔

اس لیے تاباں اس کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے اکثر گوشت پکانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ اور اس دن اپنے حصے کی بوٹیاں بھی چپکے سے بلال کی پلیٹ میں منتقل کر دیا کرتی تھی۔

وہ نا..... نا..... کرتا رہ جاتا تھا مگر تاباں ہر بار ہانڈی کا ڈھکن اتار کر اس کی پلیٹ کے ملگجے مصالحے میں روغنی شوربے کا اضافہ کر دیا کرتی تھی۔

کبھی تلی والی ہڈی کا گودا نکال کر علیحدہ پلیٹ میں اس کے لیے رکھ دیتی تھی۔ حالانکہ بلال کو یہ پسند نہیں تھا مگر تاباں یہ کہہ کر اسے کھانے پر مجبور کر دیا کرتی تھی کہ اس طرح انسان کی ہڈیوں میں گودا سلامت رہتا ہے اور ہڈیاں کمزور نہیں پڑتیں۔ اور دبلے پتلے بلال کو طاقت و توانائی کی اس عمر میں اشد ضرورت ہے تاکہ آگے چل کر بڑے ہونے کے بعد اسے کوئی مسئلہ نہ ہو۔

''تمہیں تو بڑے ہو کر بہت طاقتور بننا ہے اس لیے خوب کھایا پیا کرو۔'' تاباں اسے نصیحت کرتی۔

''کیوں تم نے مجھے اکھاڑے میں کشتی لڑنے اتارنا ہے یا پھر میری مونچھوں سے ٹریکٹر باندھ کر کھنچوانا ہے مجھ سے؟'' بلال شرارت سے مسکراتا۔

پگلے..... گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ کسی بھاری بھر کم ٹریکٹر سے کم نہیں ہوتا اور ہر مرد کو نا صرف گھریلو بلکہ باہر کی ذمہ داریوں کا بار بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ اسے خود اپنے قدموں پر جمے رہنے کے علاوہ دوسروں کو بھی سہارا دینا پڑتا ہے بعض اوقات اور جن مردوں کی ہڈیوں میں روغن نہیں رہتا ناں تو وہ جلد ہی کمزور، چڑچڑے، سڑیل اور بوڑھے ہو جاتے ہیں۔'' اپنے تئیں تاباں نے بڑے پتے کی بات کی تھی۔ بلال حیران رہ گیا۔ اتنی سی عمر میں اتنی بڑی بڑی باتیں کہاں سے سیکھ لی تھیں اس نے۔ بلال کو یوں لگا تھا کہ جیسے تاباں کے روپ میں اماں سامنے بیٹھی بول رہی ہیں۔''

''تو پھر تو تم ان نلیوں کا گودا ابا کے لیے رکھ چھوڑا کرو۔ وہ ہر وقت غصے میں رہنے لگے ہیں آج کل۔'' بلال نے شرارت سے کہا۔

اوں ہوں..... خبردار بڑوں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرتے۔ تاباں اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے گھورتی تو بلال اسے دیکھتا رہ جاتا۔

ایک دم سے کتنی بڑی بڑی سی لگنے لگی تھی تاباں..... حالانکہ بلال سے صرف سال بھر ہی تو بڑی تھی۔

مگر جب سے ماں مری تھی تو نٹ کھٹ سی تاباں نے جیسے یکدم ہی سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر اس کی ماں کا روپ دھار لیا

تھا۔صبح خود روکھی سوکھی روٹی چائے کے ساتھ نگل کر اسے اور ابا کو پیالے بھر بالائی کے ہمراہ زبردستی گھی میں تر بتر پراٹھے کھلاتی اور جلدی جلدی گھر کے بکھیڑے نمٹا کر بلال کو سکول اور ابا جی کو کام پر جانے کے لیے مدد دینے کے بعد کہیں خود تیار ہو کر ایک نزدیکی پرائیویٹ سکول میں بچوں کو پڑھانے جاتی تھی اور اس مقصد کے لیے تاباں کو منہ اندھیرے اٹھنا پڑتا تھا۔

اور جب وہ دونوں باپ بیٹے گھر آتے تو تاباں ان سے پہلے گھر میں موجود ہوتی..... حالانکہ اس کے سکول کی چھٹی بھی انہی کے ساتھ ہوتی تھی مگر وہ جانے کس طرح جلدی سے گھر پہنچ کر یونیفارم بدلتی اور کھانا گرم کر کے ان کی منتظر رہتی تھی۔

تاباں کی یاد آتے ہی بلال کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

''آج وہ کتنا پریشان ہو رہی ہوگی بلال کے لئے..... شاید بہت رو بھی رہی ہو۔'' یہ خیال بلال کو بہت بے چین کر گیا تھا۔

''چل بھئی بلالے..... گھر واپس چلیں..... ورنہ تاباں کا تو رو رو کر برا حال ہو جائے گا۔'' دل نے سمجھایا۔

اور ابا.....؟؟؟ وہ تو شاید چھڑی لے کر چھڑی ادھیڑنے کے لیے میرا منتظر ہوگا ایک تو فیل ہو جانا اور اوپر سے گھر سے بھاگ جانا..... نہیں نہیں..... ابا یقیناً کوئی رعایت نہیں کرے گا اس بار۔

ابا کا خیال آتے ہی اس کے حلق میں کڑواہٹ سی اتر گئی تھی۔

ابا مجھے نالائق اور نکما سمجھتا ہے تو اب میں کچھ بن کر ہی گھر جاؤں گا۔

تب ابا کو پتہ چلے گا کہ میں ایویں ہی نہیں تھا..... اور تاباں کے لیے تو اتنے تحفے لے کر جاؤں گا کہ وہ خوش ہو جائے گی.....

''پر کیسے؟ تیری کوئی لاٹری کھل جائے گی گھر سے بھاگ کر..... اپنے کھانے کے لیے تو جیب میں آنہ ٹکا نہیں ہے.....!'' اس کے اندر سے کسی نے جیسے اس کا مذاق اڑایا۔

کچھ بھی کرلوں گا..... مگر اب ایسے خالی ہاتھ..... چھڑی سے پٹنے کے لیے گھر واپس نہیں جاؤں گا بس۔ چاہے اسی ریتلے صحرا میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بھوک پیاس سے کیوں نہ مر جاؤں۔ اس نے دل میں تہیہ کیا۔

اسی اثناء میں دور سے آتی ہوئی ٹرین کی وسل سنائی دی۔ تو بلال ادھر متوجہ ہو گیا۔

ٹرین نزدیک آنے لگی تو بلال نے دیکھا کہ یہ کوئی پسنجر ٹرین تھی۔ جس کی رفتار بے حد سست تھی یا پھر شاید وہ کسی دوسری ٹرین کو کراس دینے کے لیے اس ویرانے میں یہاں رکنے والی تھی!

دیکھتے ہی دیکھتے ٹرین کا انجن بلال کی نظروں کے عین سامنے سے گزرتا چلا گیا اور مکمل طور پر ٹرین کے رکنے تک اس کے آگے جوڑ بہ آ کر لگا تھا وہ اکانومی کلاس کا تھا۔

بلال کو یوں لگا کہ جیسے ٹرین کے یہاں رکتے ہی اچانک جنگل میں منگل کا سا سماں پیدا ہونے لگا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ٹرین کے دروازے کھلنے لگے تھے، اور کچھ لوگ تازہ ہوا کھانے ڈبوں سے نیچے اتر آئے تھے۔

جبکہ ٹھنڈا ٹھار جوس اور بوتلیں بیچنے والے اپنی بالٹیاں کھڑکاتے اور قسم قسم کی آوازیں لگاتے ادھر سے ادھر دوڑے پھر رہے تھے۔

کسی بوگی سے بچوں کے ہنسنے کھلکھلانے اور کسی ڈبے سے نومولود کے رونے اور بچوں کے ضد کرنے پر ماں کے جھڑکنے کی آوازیں اس ماحول کی رونق میں اضافے کا باعث تھیں۔

یکا یک اردگرد کا سارا ماحول زندگی کے احساس سے بھرپور اور روشن ہو گیا تھا۔

بلال کو یکدم ہی اس ویرانے میں اتنی چہل پہل اور خود کو انسانی ہجوم میں پا کر ایک انجانے سے تحفظ کا احساس ہونے

اکا تھا۔

''بھائی صاحب...... کیا بجا ہوگا بھلا اس وقت؟'' کسی نے پاس سے گزرتے ہوئے بلال سے سوال کیا تھا۔شاید وہ آدمی بلال کو بھی اسی ٹرین کا کوئی مسافر سمجھ رہا تھا۔

بلال نے مسکراتے ہوئے اپنی خالی کلائی دکھا کر منفی میں سر ہلا دیا تھا۔

''رات کے پونے آٹھ بجنے والے ہیں جی!'' کسی دوسری جانب سے جواب ملا تھا۔

''کچھ پتہ ہے کہ یہ کون سی جگہ ہے؟'' ایک دوسرے شخص نے قریب آ کر بلال سے پوچھا۔

''بس کچھ دیر بعد میاں چنوں آنے والا ہے...... پھر ساہیوال اوکاڑہ اور اس کے بعد لاہور......'' بلال کی بجائے پاس کھڑے ایک دوسرے شخص نے تفصیل سے جواب دیا تھا۔

''جس حساب سے یہ ٹرین جگہ جگہ رکتی اور باقی گاڑیوں کو کراس دیتی جارہی ہے تو اس طرح تو یہ لاہور پہنچتے پہنچتے فجر کروے گی۔'' پہلے آدمی نے تشویش سے مفصل جواب دینے والے سے مخاطب ہو کر کہا۔

''لاہور...... لاہور...... لاہور......!'' بلال نے اور کچھ نہیں سنا تھا بس اسی نام سے اس کے اندر جیسے پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگی تھیں۔

لاہور تو اس کے خوابوں کی سرزمین تھا۔

سارے فلمی ستارے وہیں تو رہتے تھے۔

اور سارے بڑے فلمی سٹوڈیوز بھی وہیں تھے۔

بس کسی طرح اگر ایک بار وہ لاہور پہنچ جائے تو سیدھا سید نور سے جا کر ملے گا۔اور اگر اسے کسی فلم میں پہلی بار ہی ہیرو کا چانس مل گیا ناں تو...... مزہ ہی آ جائے گا۔پھر تو...... پھر......! اچانک اس کے خیالات کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔

مخالف سمت سے آنے والی ایک تیز رفتار ٹرین زن زنا زن کر کے کھٹا کھٹ دوسری پٹڑی پر سے گزرتی چلی گئی تھی۔

اس کے جاتے ہی سست رو پسنجر ٹرین کے انجن نے ایک لمبی سی وسل دی اور اس کے ساتھ ہی نیچے کھڑے تمام لوگ اپنی اپنی بوگیوں کی جانب دوڑے تھے۔

تب بلال نے اچانک اپنے دل میں ایک فیصلہ کر لیا اور رینگتی ہوئی ٹرین کے نزدیک ترین ڈبے کی طرف لپکا۔مگر ایک تو پلیٹ فارم نہ ہونے کی وجہ سے ڈبہ کافی اونچا تھا دوسرے ٹرین نے کچھ رفتار بھی پکڑ لی تھی۔شاید وہ سوار ہونے سے رہ ہی جاتا مگر ٹرین کے ڈبے کے دروازے پر موجود ایک بھلے مانس نے ہمت کر کے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر کھینچ لیا تھا۔

بلال نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

مگر تمام سیٹیں پر تھیں اور کہیں بھی اس کے بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔

اسے ہاتھ سے پکڑ کر اوپر کھینچنے والا شخص بھی اپنی سیٹ پر منہ موڑے بلال کی جانب سے لاتعلق سا ہو کر کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔

جانے اسے باہر کے گھپ اندھیرے میں کیا نظر آ رہا تھا!!

یا پھر شاید وہ اس لیے بھی یہ انداز بے رخی اپنا رہا تھا کہ کہیں بلال کو از راہ مروت اپنے ساتھ سیٹ نہ شیئر کرانی پڑ جائے۔

پوری پوری سیٹوں پر لوگ پاؤں پسارے بیٹھے تھے یا پھر لمبی تان کر سوئے ہوئے تھے۔ایک فیملی نے شاید آمنے سامنے کی دو لمبی سیٹیں اور برتھ بک کرائی ہوئی تھی۔جبھی باہر والی طرف لمبی سی چادر تان کر ایک پورا کیبن سا بنا لیا تھا۔

کہیں بھی بیٹھنے کی جگہ نہ دیکھ کر بلال ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

''کہاں جانا ہے باؤ؟'' بلال نے اس آواز کی سمت نظر دوڑائی تو ایک جوس بیچنے والا اس سے مخاطب تھا۔

''ل.....لا.....لاہو.....لاہور.....'' بلال نے تھوک نگلتے ہوئے ذرا پر اعتماد نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

اچھا.....اچھا.....جوس والا سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''اور کہاں سے آ رہے ہو؟'' جوس والے نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

''جہنم سے۔'' بلال کا دل چاہا تھا کہ یہی کہہ دے مگر خود پر ضبط کر کے بولا.....''ملتان سے۔'' (اس وقت جلدی میں اسے یہی نام یاد آیا تھا۔)

''اوہ.....اچھا اچھا'' جوس والے نے مٹھی میں سگریٹ کا ٹوٹا دبا کر اپنے مخصوص سٹائل میں لمبا سا کش بھرا۔

''سیٹ بک نہیں کرائی تھی؟'' اس نے ہونٹ گول کر کے بڑی ادا سے دھواں چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' بلال نے قدرے جھلا کر جواب دیا۔

''تبھی اب دشواری ہو رہی ہے۔'' وہ شاید اپنی ریمارکس پاس کرنے کی عادت سے مجبور تھا۔

بلال نے سنی ان سنی کر کے بے زاری سے منہ پھیر لیا۔

''کوئی بڑا نہیں ہے ساتھ؟'' جوس والے نے اسے متوجہ کرنے کے لیے ذرا بلند آواز میں پوچھا تھا۔

کیا مطلب.....میں خود بڑا نہیں دکھتا تمہیں!! بلال کا موڈ جوس والے کی الٹی سیدھی باتیں سن کر یکدم ہی بگڑ گیا تھا۔ تبھی اس نے تیوری چڑھا کے پوچھا.....

''تسی تے ناراض (ناراض) ہی ہو گئے او سجنو! لو ٹھنڈا ٹھار جوس پیو۔'' اس نے بالٹی کے برف میں سے یخ بستہ جوس کا پیکٹ نکال کر اس کی سمت بڑھایا۔

بڑی مشکل سے اس نے خود کو جوس پکڑنے سے باز رکھا تھا۔ ورنہ تو ٹھنڈے میٹھے جوس کا تصور ہی اسے اپنے ہونٹ چاٹنے پر مجبور کر رہا تھا۔ مگر وہ اپنے پپڑی زدہ ہونٹوں پر صرف زبان پھیر کے رہ گیا تھا۔

''نہیں رہنے دو۔'' اس نے جوس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے مری مری سی آواز میں منع کیا۔

تب جوس والے نے قدرے منہ بنا کر جوس واپس بالٹی میں پٹخ دیا تھا، اور خود پیٹھ موڑ کے بیٹھ گیا۔

''کاش اگر میرے جیب میں کچھ پیسے ہوتے تو میں ایک ٹھنڈا جوس ہی خرید لیتا۔ شاید اسی طرح پیٹ کے جہنم کو کچھ سکون ملتا۔''

بھوک کی وجہ سے بلال کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔

تبھی اچانک اس کے ذہن میں اک جھماکا سا ہوا۔ صبح گھر سے نکلتے وقت تاباں نے بلال کو سودا سلف لانے کے لئے کچھ پیسے دیئے تھے۔

یہ بات یاد آتے کے ساتھ ہی ان پیسوں کی تلاش میں بلال نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اس کے ہاتھ میں سو روپے کا کڑکڑاتا ہوا نوٹ موجود تھا۔

''اچھا لاؤ دے دو جوس!'' سو روپے کے لال نوٹ نے بلال کی خود اعتمادی اسے واپس لوٹا دی تھی۔

جوس والے نے جلدی سے جوس پکڑایا اور سو روپے کا کھلا گننے لگا۔

اب اگر کوئی سکٹ والا آیا تو ایک پیکٹ بھی خرید لوں گا۔ اس نے تسلی سے سوچا۔

''یوں کھڑے کھڑے تو تمہاری ٹانگیں تھک جائیں گی..... آؤ یہیں بیٹھ جاؤ۔'' جوس والے نے اپنے قریب فرش کی جانب اشارہ کیا۔

''یہاں.....؟؟؟'' بلال نے تنقیدی نظروں سے فرش کا جائزہ لیا۔ جہاں جا بجا گندگی کے چوسے ہوئے پھوک پڑے تھے اور دھول کی تہہ بچھی ہوئی تھی۔

''او جی..... اس مٹی سے بھلا کیا شرمانا!'' جوس والا بلال کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر بولا۔

''آخر مرنے کے بعد بھی تو اسی مٹی میں جا ملنا ہے۔'' اس نے خواہ مخواہ اپنے زرد دانتوں کی نمائش لگائی۔

''پھر بھی تمہاری تسلی نہیں ہوتی تو یہ لو.....!'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے کندھے پر پڑے کپڑے سے بلا تکلف فرش کی دھول صاف کر کے ایک آدمی کے بیٹھنے کی جگہ بنا دی تھی۔ اب تک بلال جوس والے کے اتنے قریب آنے سے اس لیے بھی کترا رہا تھا کہ اس کے اپنے کپڑے ریت میں پڑے رہنے کی وجہ سے میلے ہو رہے تھے۔ مگر ایک تو ڈبے میں لائٹس برائے نام آن تھیں دوسرے اس نے خاکی سا شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔ جو خاصا میل خورہ سا تھا۔ اس لیے چپ چاپ اس کے پاس آ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ ویسے بھی کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں اکڑنے لگی تھیں۔ اس لیے بیٹھ جانے ہی میں عافیت تھی۔

''اب اگلے سٹیشن پر جب گاڑی رکے تو ٹی ٹی سے مل کر اپنے لیے سیٹ ریزرو کرا لینا۔ تھوڑے سے پیسے زیادہ لگ جائیں گے مگر سفر تو سکون سے کٹ جائے گا۔'' جوس والے نے بلال کو مخلصانہ مشورہ دیا۔

''ہوں.....!'' بلال سر ہلا کے رہ گیا۔

''اب وہ اسے کیا بتاتا کہ اس کے پاس تو ٹکٹ بھی نہیں ہے۔''

''یا پھر ایک ترکیب اور بھی ہے!'' جوس والے نے بلال کو آنکھ مار کے اپنے قریب کان لانے کا اشارہ کیا۔ فوراً ہی غیر ارادی طور پر بلال اس کی جانب جھک گیا تھا۔

''تم کسی قلی کے ہاتھ پر سو، پچاس کا نوٹ رکھنا تو وہ کسی بھی اچھی سی سیٹ پر تمہیں ''قبضہ'' دلا دے گا۔ بس تو پھر آرام سے لاہور تک لمبی پسار کے جانا۔'' بات ختم کرنے کے بعد جوس والے نے داد طلب نظروں سے بلال کی جانب دیکھا اور تالی مارنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ مگر پھر فوراً ہی چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

مگر تمہارا سامان تو کہیں نظر نہیں آ رہا۔ کیا ایک چھوٹا موٹا بیگ تک ساتھ لے کر نہیں چلے تھے.....؟؟ جوس والے نے شک بھری نظروں سے بلال کی طرف دیکھا۔

''مجھے نیند آ رہی ہے.....!'' بلال نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ اور سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے زوردار جمائی لے کر اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی بوگی کی دیوار سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

یہ واضح طور پر اس بات کا اشارہ تھا کہ اب بلال مزید بات چیت کے موڈ میں بالکل بھی نہیں ہے۔ لہٰذا جوس والا یہاں سے دفعان ہو جائے۔

بلال کے تیور دیکھتے ہوئے جوس والے نے بھی اس پر دو حرف بھیجے اور اپنی سگریٹ پھٹے پرانے بوٹوں تلے مسل کر اپنی جوس والی بالٹی کھڑکھڑاتا ہوا..... وہاں سے اٹھ گیا۔

''اے ٹھنڈا ٹھار اے.....!'' اس نے حسب عادت کرارری آواز میں ہانک لگائی اور آگے بڑھ گیا۔ ٹرین کی رفتار

ایک بار پھر مدھم ہو رہی تھی۔
بلال نے اٹھ کر اپنی نزدیکی کھڑکی سے باہر جھانکا۔
آسمان کے مدھم مدھم ستاروں کی ملگجی روشنی میں...... دور سے کھمبوں پر جلتی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔
شاید کوئی سٹیشن نزدیک آنے والا تھا۔
بلال عجیب طرح سے بے چین ہو گیا۔
اس کی چھٹی حس کسی خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔ اور پھر اسے اپنے سامنے سے دو پولیس والے بوگی میں داخل ہوتے دکھائی دیئے۔ جن کی متلاشی نظریں بے تابی سے کسی کو تلاش کر رہی تھیں......
بلال کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔
کہیں یہ میری تلاش میں تو نہیں ہیں!!!
وہ کیوں ہوں گے تمہاری تلاش میں بھلا...... تم کوئی چور اچکے ہو! اس نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی۔
مگر اپنے گھر سے بھاگا ہوا بھگوڑا تو ہوں...... کیا پتہ ابا نے تھانے میں میری گمشدگی کی رپٹ درج کرا دی ہو...... اور اب پولیس والے میری تلاش میں ہوں۔
اگر میں پولیس والوں کے ہتھے چڑھ بھی گیا تو صاف صاف بتا دوں گا کہ ابا مجھے بہت مارتا ہے اور مجھے گھر واپس نہیں جانا۔ بلال نے دل میں تہیہ کر لیا تھا اور چوکنا ہو کر اپنی جگہ بیٹھ گیا......
مگر پولیس والوں نے اس کی طرف دھیان تک نہیں دیا تھا اور اپنی ہی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ یہاں کوئی ایسا تھیلا یا سفری بیگ "نہیں کہ جو لاوارث پڑا ہو۔ یا کسی کو کوئی مشکوک شخص تو نظر نہیں آیا؟" ایک پولیس والا مسافروں سے پوچھ رہا تھا۔
"یہ سامان کس کا ہے؟" دوسرے پولیس والے نے ایک بڑے سے منہ بند تھیلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کسی سے سوال کیا۔
تب لال سمجھ گیا کہ کسی ممکنہ دہشت گردی کے پیش نظر پولیس والے اپنی روزمرہ کی کارروائی میں مصروف ہیں۔ تاہم احتیاط ضروری تھی۔ اس لیے وہ دھیرے دھیرے ایک طرف کو کھسکتا ہوا چپکے سے ٹائیلٹ میں جا گھسا اور اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ ہچکولے کھاتی ٹرین ایک جگہ تھم گئی تھی۔
شاید سٹیشن آ چکا تھا۔ ٹرین کے ڈبے میں زندگی جاگ اٹھی تھی۔
مگر بلال ٹائیلٹ سے باہر نہیں آیا۔ بلکہ وہیں سے بھانت بھانت کی آوازیں سنتا رہا۔
کیہڑا اسٹیشن اے پائی جان؟ (بھائی جان) کسی نے بلند آواز میں سوال کیا تھا۔
"اوکاڑہ" دوسری سمت سے آواز آئی۔
تب بلال کو معلوم ہوا کہ ٹرین اوکاڑہ پہنچ چکی ہے اور اس کی معلومات کے مطابق اوکاڑہ سے لاہور بذریعہ ریل کم از کم تین گھنٹے ضرور لگنے تھے اور جس طرح کی ٹرین میں بلال سوار تھا وہ ہر گھنٹے بعد کہیں نہ کہیں رک کر کسی دوسری ٹرین کو کراس دیتی تھی تو شاید لاہور پہنچنے کے لیے اس کے لیے تو چار گھنٹے بھی کم تھے۔
"پتہ نہیں کون تھا یا تھی...... جو باہر سے ٹائیلٹ کا دروازہ بجا بجا کر بالآخر واپس پلٹ گیا تھا۔
پھر جتنی دیر گاڑی سٹیشن پر کھڑی رہی...... بلال ٹائیلٹ میں ہی گھسا رہا اور طرح طرح کی بولیاں سنتا رہا۔

سٹیشن پر اور ریل گاڑی کے اندر، رات میں بھی گویا دن کا سماں تھا۔
جوس، کولڈ ڈرنکس اور سکٹ والے آوازیں لگاتے پھر رہے تھے۔
ڈائننگ کار کے بیرے گرم کھانے کی صدائیں دے رہے تھے۔ اور تو اور اخبار، رسالے بیچنے والے بھی ڈبے میں چڑھ آئے تھے۔
ادھر ٹائیلٹ میں حبس، گرمی، پسینے، گھٹن اور بدبو سے بلال کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ مگر وہ کسی بھی ممکنہ خطرے کے پیش نظر اندر ہی بند رہا تھا۔
آخر کار خدا خدا کر کے گاڑی رینگنے لگی تو جیسے اس کی جان میں جان آئی۔
مگر اسی اثناء میں کسی نے ٹائیلٹ کا دروازہ دوبارہ بجایا تھا اور اس بار انداز کچھ ایسا جارحانہ تھا..... کہ بلال دل ہی دل میں سہم کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

بلال کی گمشدگی کی خبر ملتے ہی طلال بھی گھر پہنچ چکا تھا۔
اس نے آتے ہی نڈھال پڑتے باپ کو سنبھالنے اور تسلیاں دینے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ مگر اس کی خالی پیلی تسلیاں گمشدہ بلال کو تو واپس نہیں لا سکتی تھیں ناں..... اور ماسٹر جی یہ بات اپنے بیٹے کو کیسے سمجھاتے کہ مرنے والوں کا صبر کیا جا سکتا ہے مگر دنیا کی بھیڑ میں کھو جانے والے پیاروں کا غم اندر ہی اندر انسان کو چاٹ کر ختم کر دیتا ہے۔
کتنا انتظار تھا کہ ماسٹر جی کو طلال کے برسر روزگار ہونے کا۔ اور اب جبکہ اس نے خفیہ محکمے میں افسر بن جانے کی خوشخبری سنائی تھی تو بھی ماسٹر جی کے ستے ہوئے چہرے پر زندگی کی کھوئی ہوئی رونق واپس نہیں آئی تھی۔
لبوں سے خاموشی کا قفل نہیں ٹوٹا تھا۔
ابھی چند گھنٹے ہی تو ہوئے تھے بلال کو کھوئے ہوئے، مگر وہ صدیوں کے بیمار نظر آنے لگے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے بستر سے جا لگے تھے۔
پھر یکدم ہی ان پر غشی طاری ہونے لگی اور تیز بخار نے انہیں آن دبوچا۔
مگر وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بھی بلال کو ہی پکارتے رہے۔
ماسٹر جی کو پوچھنے کے لیے ہر وقت کوئی نہ کوئی گھر میں آیا رہتا تھا اور دونوں بہن بھائیوں کی ہمت بڑھاتا رہتا۔
اس وقت حوصلہ افزائی کی زیادہ ضرورت واقعی ان دونوں کو تھی کیوں کہ انہیں بلال کی گمشدگی کے صدمے کو برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ بیمار ماسٹر جی کو بھی سنبھالنا تھا۔
اب بھی طلال باپ کے پاؤں دبا رہا تھا جبکہ تاباں ماسٹر جی کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی کہ جب اے ایس آئی گل زار نے دروازے پر دستک دی۔ طلال نے اے ایس آئی گلزار کا نام سن کر اسے اندر بلا لیا۔
سلام و دعا کے بعد وہ طلال کے پاس ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور ماسٹر جی کی خیر خیریت پوچھنے لگا۔ جبکہ اس کی نظریں تابینہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔
اسے تابینہ کے چہرے پر چھائی بے پناہ معصومیت نے سچ مچ اپنا اسیر کر لیا تھا۔ اپنے دلکش نازک سراپے، ناک میں چمکتی لونگ اور لمبی سیاہ چوٹی کے ساتھ وہ سیدھی اس کے دل میں اتر چکی تھی۔
''اب کے گاؤں جاؤں گا تو ماں کو یہ خوش خبری سناؤں گا کہ مجھے اس کے لیے چاندنی بہو مل گئی ہے۔'' وہ دل میں

سوچ کر مسکرا دیا تھا۔

''تاباں..... تم جا کر تھانیدار جی کے لیے لسی پانی کا بندوبست کرو۔'' طلال نے بہن کو ہدایت دی اور خود اے ایس آئی سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔

تاباں صحن میں آئی تو کھلے دروازے کی اوٹ سے جانو کمہار کا بچہ اندر جھانک رہا تھا۔

کیا بات ہے کاکے..... اندر آجا.....! تابینہ نے اسے دیکھتے ہی پکارا تھا۔ کیونکہ جانتی تھی کہ کاکے کا نزول کبھی بھی بے معنی نہیں ہوتا۔

''امی کہتی ہے ایک پلیٹ سالن دے دو۔ اگر پک گیا ہے تو.....!'' کاکے نے ادھر ادھر محتاط نظروں سے دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا اور پھر موقع دیکھتے ہی اپنی نیکر کی جیب سے ایک تہہ شدہ رقعہ نکال کر احتیاط سے تاباں کی جانب بڑھایا۔

موڑ والے قبرستان کے پاس ایک موٹر سائیکل پر سوار لڑکے نے مجھے یہ چٹھی دے کر کہا تھا کہ ماسٹر غلام حسین کی بیٹی تک چپکے سے یہ چٹھی پہنچا دو، مگر خبردار کسی کو اس بات کا پتہ نہیں لگنا چاہیے۔

اور.....! کاکا کچھ بتاتا بتاتا رک گیا تھا۔

اور کیا؟ تاباں نے بے تابی سے پوچھا۔

اس کام کے لیے اس نے مجھے انعام میں دس روپے کا نوٹ بھی دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر تم نے احتیاط سے یہ خط تاباں تک پہنچا دیا تو پھر وہ بھی خوش ہو کر تمہیں انعام میں دس روپے کا نوٹ دے گی اور پھر تم لمبی عیش کرنا۔

خط تو میں نے تم تک پہنچا دیا..... اب نکالو دس روپے کا نوٹ تاکہ میں جاؤں۔ ورنہ وہ مولوی حرامی اپنی دکان بند کر کے جورو کی بغل میں جا گھسے گا تو پھر چیز لینے کے لیے شام تک اس مردود کا انتظار کرنا پڑے گا۔ کاکے نے اک شان بے نیازی سے اپنا سر کھجاتے ہوئے دکاندار کے بارے میں قصیدہ گوئی کی تو تاباں دم بخود رہ گئی۔

ہا..... ہائے..... ایسی گندی گالیاں کہاں سے سیکھیں تو نے..... بری بات جو آئندہ.....!

او جلدی کرو باجی..... اپن کے پاس تمہارا لیکچر سننے کے لیے زیادہ ٹیم (ٹائم) نہیں ہے۔ کاکے نے بے زاری سے تاباں کی بات کاٹتے ہوئے خالصتاً انڈین فلمی انداز میں کہا تو اس نے مصنوعی خفگی سے کاکے کو گھورتے ہوئے دوپٹے کے پلو میں بندھے چند سکے اس کی جانب بڑھا دیئے۔

پہلے تو کاکے نے اک حقارت بھری نظر ان چند سکوں پر ڈالی مگر پھر فوراً ہی ان کی مالیت کا اندازہ لگاتے ہوئے مطمئن انداز میں انہیں دس روپے کے نوٹ میں لپیٹ کر اپنی مٹھی میں دبایا اور زقند بھرتا ہوا..... یہ جا..... وہ جا.....!

تاباں نے رقعہ اپنے گریبان کی گہرائی میں منتقل کیا اور ستو کا شربت بنا کر طلال بھائی اور اے ایس آئی کو دینے کے بعد ایک الگ کمرے میں چلی آئی اور دھڑکتے دل کے ساتھ رقعہ کھول کر بے تابی سے تحریر پر نظریں دوڑائیں۔

لکھا تھا!

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی موڑ والے قبرستان کے پاس داڑھی والے برگد تلے پہنچ جانا۔ میں وہاں تمہیں منتظر ملوں گا۔ اور دیکھو! میں اس سلسلے میں اس بار تمہارا کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔ اتنی دور سے صرف تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے آتا ہوں مگر تم.....!!

اچھا اگر واقعی تمہیں مجھ سے محبت ہے تو پلیز ٹالنا مت۔

تمہارا منتظر

تمہارا اپنا

زیڈ.....

تاباں نے سرد آہ بھر کے اس خط کو بھی دیگر خطوط کی طرح اپنے صندوق کی تہہ میں کپڑوں تلے رکھ دیا اور صندوق کو تالا لگانے کے بعد چابی اپنے پراندے میں باندھی اور افسردہ سی ہو کر باہر نکل آئی۔

ابھی شام کا اندھیرا پھیلنے میں خاصا وقت تھا۔ مگر ظفری سے ملنے کی کوئی ترکیب تاباں کے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر ابھی اسے رات کا کھانا بھی بنانا تھا۔

''دال چاول بنا لیتی ہوں..... وہ جلدی بن جائیں گے۔'' تاباں نے سوچا اور بڑی سی پرات میں چاول نکال کر چننے بیٹھ گئی۔

''مجھے کچھ کرنا ہی ہوگا ظفری سے ملنے کے لیے۔ میں اسے ناراض نہیں کر سکتی۔'' اس نے فیصلہ کر لیا اور ذہن میں اس سے ملاقات کے لیے گھر سے نکلنے کے بہانے سوچنے لگی۔

اگرچہ ان کی محبت کو اتنا زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ اسے اپنے من مندر میں دیوتا کا درجہ دے چکی تھی۔

اور ظفری بھی تو اسے اتنے کم عرصے میں کتنا چاہنے لگا تھا۔

وہ اس کی ایک کلاس فیلو کا دور پار کا کزن تھا اور جب وہ اپنی کلاس فیلو کی بہن کی شادی میں شرکت کے لیے گئی تھی تو وہاں ظفری بھی آیا ہوا تھا۔

ابٹن، مہندی، شادی اور رخصتی کی رسومات میں بارہا ایک دوسرے سے ملنے کے بعد وہی ہوا تھا جو عموماً افسانوں یا فلموں کی دنیا میں ہوتا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔

دونوں نے ایک دوسرے کے روبرو اظہار محبت کیا اور دوبارہ ملنے کی آس دل میں لیے ایک دوسرے کو الوداع کیا تھا۔

تاباں رات دن ظفری کے تصور میں گم رہنے لگی تھی۔ مگر اس شادی کے بعد ان دونوں کی دوبارہ ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

ظفری تنہائی میں تاباں سے ملاقات کا متمنی تھا۔ مگر تاباں کے لیے یہ بہت مشکل کام تھا۔

دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ظفری نے ''کاکے'' کی صورت میں رابطے کا ذریعہ تو ڈھونڈ لیا تھا۔ تاہم تاباں کے دوبارہ دیدار کی تمنا ابھی دل میں باقی تھی اور آخر کار تاباں کو اس سے ملاقات کی ایک ترکیب سوجھ ہی گئی تھی۔

☆☆☆

''اری نیک بخت! میں تو تجھے بتانا ہی بھول گیا تھا کہ بھائی غلام حسین کا چھوٹا بیٹا بلال گم ہو گیا ہے اور خود بھائی غلام حسین اس صدمے سے سخت بیمار پڑے ہیں۔'' خادم حسین نے اپنی بیگم کا موڈ قدرے خوشگوار دیکھ کر اسے بتایا۔

''کیوں تمہیں الہام ہوا ہے کیا؟'' خادم حسین کی بات پر ان کی بیگم کی ساری خوش مزاجی رخصت ہو گئی اور انہوں نے تیوری چڑھاتے ہوئے، تیکھے لہجے میں شوہر سے سوال کیا۔

نہیں..... وہ..... دراصل..... میں پچھلے دو تین دن سے بھائی غلام حسین کے متعلق پریشان کن خواب دیکھ رہا تھا.....

تو پھر میں نے ان کے بڑے بیٹے طلال کو اس کے ہاسٹل میں فون کیا تو پتہ چلا کہ طلال تو گاؤں گیا ہوا ہے چونکہ اس کا بھائی گم ہو گیا ہے اور والد صاحب سخت بیمار ہیں۔'' خادم حسین نے دھیرے سے بتایا۔

''تو یوں کہو نا کہ بظاہر میرے سامنے تو اپنے بھائی سے تمہارے تعلقات کشیدہ ہیں مگر اندرون خانہ تم نے اپنے بھائی بھتیجوں سے مکمل رابطہ رکھا ہوا ہے جبکہ بری بننے کے لیے تو صرف میں ہی تھی۔''

اونہہ..... بیمار ہیں غلام حسین بھائی.....! بیگم خادم حسین نے منہ بگاڑ کر شوہر کی نقل اتاری،

''فضول کی باتیں مت کرو..... آپس کی ناراضگیاں اور گلے شکوے بھی زندگی اور صحت و تندرستی کے ساتھ اچھے لگتے ہیں.....'' انہوں نے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہاں تو وہاں کون سا ماتم کی دریاں بچھ گئی ہیں! جب کوئی ایسی ویسی اطلاع آئے تو چلے جانا..... پرسا دینے کے لیے۔'' بیگم خادم نے ہاتھ نچا کر ٹھوس دلی سے کہا۔

حمیدہ بیگم! میں اپنے بھائی اور اس کے بچوں سے ملنے کے لیے تمہاری اجازت کا پابند نہیں ہوں۔ میں نے تو شریک حیات ہونے کی بناء پر تم سے اپنی پریشانی شیئر کرنا چاہی تھی مگر تم اس قابل ہی نہیں ہو.....! خادم حسین اچانک دکھی سے ہو گئے۔

''اوہو..... و..... دکھ..... پریشانی.....! واہ جی صدقے جاؤں..... حمیدہ بیگم استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ آج تم اس بھائی کے لیے اتنا پریشان ہو رہے ہو جس نے یہ چند کمروں کا مکان اور چند بیگھے زمین دے کر تم سے بہت کچھ چھین لیا تھا۔''

دیکھو حمیدہ بیگم! میں اس بات پر تم سے الجھنا نہیں چاہتا۔ نہ اس بات کو دہرانا چاہتا ہوں کہ ہم دونوں بھائیوں میں نفاق ڈالنی والی ہستی بھی کوئی اور نہیں بلکہ.....!''

ہاں ہاں تھوپ دو سارا الزام مجھ پر..... حمیدہ بی بی نے ان کی بات اچک کر آنکھیں نکالیں.....

میں زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا۔ صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ میں کل بھائی غلام حسین کی عیادت کے لئے گاؤں جا رہا ہوں۔ تم ساتھ چلو گی..... یا نہیں؟''

''اونہہ..... میری جاتی ہے جوتی..... تم ہی ان کے آگے پیچھے جوتے چٹخاتے پھرا کرو..... حمیدہ بیگم غصے میں پاؤں پٹختی کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

''پتہ نہیں کون اتنی دیر سے اندر گیا ہوا ہے۔ باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔'' کسی نے چلا کر باہر سے کہا اور اس کے ساتھ ہی ٹائیلٹ کا دروازہ پوری طاقت سے دوبارہ بجایا گیا تھا۔

او چیک کرو جی..... کہیں کوئی گڑبڑ ہی نہ ہو.....! کسی نے مشورہ دیا تھا۔

اب عافیت اسی میں تھی کہ بلال ٹائیلٹ سے باہر نکل آتا۔ سو نکل آیا تھا۔

''تو یہ ہے.....!'' دروازے پر موجود بھاری بھرکم شخص نے طنزیہ نظروں سے بلال کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔

بلال نظریں چرا کر آگے بڑھ گیا اور سیدھا کسی کی پشت سے جا ٹکرایا۔

یہ ٹکٹ چیکر تھا.....

''ٹکٹ پلیز.....!'' اس نے بلال کی طرف مڑتے ہی اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا.....

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے)

☆☆☆

رنجش

عذرا فردوس

شادی ایک مقدس فریضہ ہے اور زندگی
میں نئے رشتوں کی شمولیت انسان کو اپنے مکمل
ہونے کا احساس بخشتی ہے۔۔۔۔۔

ایک لڑکی کا فسانہ جو آزادانہ ماحول میں جینے کی تمنا رکھتی تھی

وہ ایک خوشگوار دن تھا۔ اتنا ہی خوشگوار اور تر و تازہ جتنا خوش رنگ گھاس اور نیلے آسمان پر لہرانے والے بادل اور رنگ برنگی تتلیاں کسی عام دن کو بنا سکتی ہیں۔

مگر زیمل کے لیے وہ دن بھی عام سے دنوں کی طرح تھا۔ اکتاہٹ بھرا، یکسانیت سے بھرپور، زیمل اپنے چھوٹے سے کچن میں برتن دھونے میں مصروف تھی۔ اچانک اسے گرمی کا احساس ہوا۔ وہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی کچن سے نکلی اور اپنے گھٹن زدہ کمرے میں غیر آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ کل رات سے لائٹ گئی ہوئی تھی اور اب دن کے بارہ بج چکے تھے۔ زیمل کو شدید گرمی لگ رہی تھی۔

''میں اس زندگی سے اکتا گئی ہوں۔ اس گھر سے نکلنا چاہتی ہوں۔'' زیمل نے گہری سانس لے کر بلند آواز میں کہا۔ اس کا یہ کہنا اپنی جگہ درست تھا وہ اپنے والد کی سخت مزاجی اور پابندیوں سے بھرپور زندگی سے اکتا چکی تھی۔

زیمل کے والد کی رہائش گاؤں میں تھی وہ گاؤں کے مدرسے میں بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ زیمل ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ ڈھائی برس پہلے زیمل کی ماں وفات پا چکی تھیں۔ زیمل کے ابا کو ہر قسم کی تفریح سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ چاہتے تھے زیمل بھی اپنی ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اطاعت گزار، صابر، ان تھک کام کرنے والی اور باپ کی ہدایت پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنے والی بنے جو زیمل کے لیے ممکن نہ تھا۔

زیمل نے میٹرک پاس کیا تھا۔ تب اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ ماں کی وفات کے بعد اس نے بڑی مشکل سے اپنے ابا کو اس بات کے لیے رضامند کیا تھا کہ وہ اسے کالج میں ایڈمیشن دلوا دیں۔ اب انٹر کرنے کے بعد ابا نے حکم جاری کیا تھا کہ زیمل مزید تعلیم حاصل نہیں کر سکتی۔ مجبوراً وہ گھر بیٹھ گئی تھی۔ زیمل کا زیادہ تر وقت گھر میں کڑھتے ہوئے گزرتا تھا۔ ابا کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ زیمل کی سہیلیاں اس کے گھر آئیں یا وہ خود ان کے گھر جائے۔

زیمل کے ابا عبدالحمید کی شدت سے خواہش تھی جتنی جلدی ممکن ہو زیمل کی شادی کر دی جائے اور اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انہوں نے جان پہچان کے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ زیمل کے لیے کسی مذہبی لڑکے کا رشتہ بتائیں۔

ابا جیسے خیالات کے حامل مذہبی لڑکے سے شادی کا سوچ کر زیمل کو بیزاریت محسوس ہونے لگتی۔ زیمل بھی دل میں تہیہ کر چکی تھی کہ وہ مر جائے گی مگر کسی مولوی نما لڑکے سے شادی نہیں کرے گی۔ زیمل کو بناؤ سنگھار اور اچھے، اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ قاری عبدالحمید عورتوں کا بناؤ سنگھار ناپسند کرتے تھے۔ ضرورت سے زیادہ کپڑے رکھنا اور بنانا انہیں پسند نہیں تھا۔

زیمل کو سال میں عید پر نئے کپڑے پہننا نصیب ہوتے تھے۔ عام دنوں میں وہ پرانے گھسے ہوئے کپڑے پہنے رہتی تھی۔ ابا کی ہدایت کے مطابق زیمل کو بال کھلے رکھنا منع تھا۔ اس وجہ سے وہ بالوں کو خوب کس کے باندھتی یور وغیرہ کا ذکر ہی کیا۔ کیوں کہ قاری عبدالحمید کی رائے میں یہ چیزیں سیدھی دوزخ کے دروازے کی طرف لے جاتی تھیں۔ زیمل کو گھر کے کام کاج سارے خود ہی کرنے پڑتے جو ایک زمانے میں اس کی امی مرحومہ کیا کرتی تھیں۔ زیمل نے کئی بار ابا سے بحث بھی کی کہ وہ اس پر ہر بات کی پابندی نہ لگائیں۔ مگر وہ ابا ہی کیا جو زیمل کی بات سے اتفاق کر لیتے۔ ابا زیمل کی معصوم خواہشوں کو یہ کہہ کر رد کر دیتے کہ اس کی خواہشات ان کی نظر میں ناپسندیدہ ہیں۔ امی کی وفات کے چند ماہ بعد گاؤں میں میلہ لگا۔ زیمل نے ابا سے میلہ دیکھنے کی اجازت طلب کی۔ زیمل کی سہیلیاں فروا اور ردا میلے میں گھومنے جا رہی تھیں۔ قاری عبدالحمید نے زیمل کی بات سنتے ہی منع کر دیا اور کہا اس طرح کی جگہوں پر جانے سے گناہ کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اس کے بجائے وہ گھر بیٹھ کر کوئی دینی کتاب کا مطالعہ کر لے۔ ایک دفعہ زیمل نے ایک راہ گیر کو راستہ بتا دیا وہ پڑوس کے گھر سے آ رہی تھی کہ کسی شخص نے اس سے رشید

صاحب کے گھر کا پتہ پوچھا۔

زیمل نے اس شخص کو پتہ سمجھا دیا کسی پڑوسی نے یہ بات اس کے ابا تک پہنچادی۔ قاری عبدالحمید کو یہ سن کر شدید صدمہ پہنچا۔ انہوں نے زیمل کو کھری، کھری سنائیں۔

''جولڑکی دلیر ہوجائے۔ راہ چلتے شخص سے گفتگو کرے وہ اپنے باپ اور شوہر دونوں کو رسوا کرتی ہے۔ برائی سے مسرت حاصل کرنے والے عذاب کے مستحق ٹھہریں گے اور برائی سے دامن بچانے والوں کے لیے اجر عظیم ہے۔''

زیمل نے ابا کے سامنے احتجاج کیا کہ اس کی گفتگو نہایت بے ضرر تھی۔ مگر ابا نے اس کی ایک نہ سنی امی کی موت کے بعد ڈھائی برس تک تنہا اذیت سہتے رہنے سے زیمل کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ کمرے میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کس طرح اس زندان سے چھٹکارہ حاصل کیا جائے۔ زیمل اپنی بوریت پر آہیں بھر رہی تھی کہ گھر کی کنڈی بج اٹھی۔ زیمل نے گیٹ کھولا سامنے اس کی رشتے کی خالہ رخسانہ کھڑی تھیں۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے اداس اور تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔''

رخسانہ کی گھاگ نظروں نے زیمل کو دیکھتے ہی کہا۔

''خالہ! آپ اندر آئیں۔'' زیمل نے راستہ دیا اور رخسانہ ناز کو ساتھ لیے اپنے کمرے میں آگئی۔

''توبہ! اس قدر گرمی اور حبس ہے تمہارا اس گھر میں دم نہیں گھٹتا۔'' رخسانہ ناز نے کرسی پر بیٹھتے ہی اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''خالہ بیٹھیں، میں آپ کے لیے شربت بنا کر لاتی ہوں۔''

''رہنے دو شربت کو، مجھے پتہ ہے تمہارے گھر میں شربت ہونے سے رہا۔'' رخسانہ نے طنز کیا۔

پھر بولیں۔ ''مجھے اپنی اداسی کی وجہ نہیں بتاؤ گی کسی کے سامنے دل کی بات کہنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے۔''

''خالہ! میں اکتاہٹ بھری زندگی سے بے زار ہوگئی ہوں دل چاہتا ہے اس گھر کو چھوڑ کر چلی جاؤں۔ ابا مجھ سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ میں امی کی طرح ان کی ہر بات پر عمل کروں اور تو اور انہوں نے میری شادی کے لیے کسی مولوی کی تلاش شروع کردی ہے۔ ساری زندگی ابا کی سختیاں اور پابندیاں میں سہتی رہی ہوں۔ اس آس پر کہ شادی کے بعد میں ان کی قید سے رہا ہو جاؤں گی اور ابا ہیں کہ میرے جذبات و احساسات سے بے خبر اپنی مرضی مجھ پر مسلط کرنے کے لیے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ سوچ بغیر کے مجھے ان کے فیصلے سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔ زندگی صرف ایک مرتبہ ملتی ہے مجھے بھی حق حاصل ہے کہ میں اپنی مرضی کی زندگی جیوں، پہنوں، اوڑھوں، میک اپ کروں، گھوموں پھروں، امی کی زندگی میرے سامنے ہے۔ ساری زندگی انہوں نے ابا کے حکم کی بجا آوری میں گزاری ان کی پابندیاں سہتے، سہتے وہ وفات پاگئیں۔ مجھے امی جیسی زندگی گزارنے کی کوئی خواہش نہیں۔'' زیمل سسک پڑی۔

''حوصلہ کرو زیمل، تم جیسی زندگی گزارنا چاہتی ہو ویسی ہی زندگی گزار سکتی ہو اس کے لیے تمہیں تھوڑی سی ہمت کرنا ہوگی۔'' رخسانہ ناز نے زیمل کے خیالات سے متاثر ہونے کے بعد اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ابا کے سامنے میرے انکار کی کیا اہمیت ہے وہ تو اپنی ہی کہتے ہیں اور اپنی ہی منواتے ہیں وہ تو مجھے ہر وقت یہ احساس دلاتے رہتے ہیں کہ انہیں میری شادی کی فکر کھائے جارہی ہے۔ میری وجہ سے ان کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے۔ اپنی نیند کو پرسکون بنانے کے لیے وہ میرا ہاتھ اپنے جیسے کسی بندے کو تھمانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں چاہے میرا ہونے والا شوہر ابا کی عمر کا ہو۔'' رخسانہ ناز نے گہری نظروں سے زیمل کو دیکھا پھر بولی۔

''زیمل تم زندگی کو اپنی مرضی سے گزار سکتی ہو میں تمہیں یہاں سے لے چلوں گی اور تمہاری شادی بہت اچھے سے لڑکے سے کرواؤں گی۔ تمہیں احساس ہے تمہاری خوبصورتی کی وجہ سے تمہاری شادی اچھے سے اچھے لڑکے

سے ہوسکتی ہے۔''

''چھوڑیں خالہ آپ مذاق کرنے لگی ہیں۔''

''ارے میں مذاق نہیں کررہی اگر تمہارے ابا کسی طرح تمہیں میرے ساتھ بھیج دیں تو میں اپنی کہی بات سچ کر دکھاؤں گی۔''

''ابا، تو آپ کی بے پردگی کی وجہ سے آپ کو پسند نہیں کرتے وہ آپ کے سامنے اپنے نیک خیالات کا اظہار اس لیے نہیں کرتے کہ آپ نے اپنا یہ گھر ہمیں مفت میں رہنے کو دیا ہوا ہے۔ سال میں ایک دفعہ آپ شہر سے گاؤں آتی ہیں تو ہم لوگوں کے لیے تحفہ تحائف لاتی ہیں۔ آپ کی سخاوت کی وجہ سے ابا کی زبان آپ کے آگے بند رہتی ہے۔''

''بھائی حمید! کی اس عادت کا میں فائدہ تمہیں پہنچانا چاہتی ہوں تمہاری امی میری خالہ زاد بہن تھیں مجھے اس سے خاص انسیت تھی۔ میرے دونوں بیٹے باہر تعلیم کے لیے چلے گئے ان کے خیالات بھی بدل گئے ورنہ میری خواہش تھی کہ میں اپنے بیٹوں میں سے کسی ایک کی تم سے شادی کرتی۔ خیر میں تمہیں بیٹی کی طرح سمجھتی ہوں تمہارے ابا سے میں کل ہی بات کروں گی کہ وہ کچھ مہینوں کے لیے تمہیں میرے ساتھ بھیج دیں۔''

''آپ کوشش کرلیں۔ ابا مجھے چند دنوں کے لیے آپ کے ساتھ بھیجنے کے لیے بمشکل تیار ہوں گے۔''

''تم میری عقل کی داد دینا۔ میں تمہارے ابا کو منالوں گی۔'' رخسانہ ناز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر زیمل سے گفتگو کرنے کے بعد وہ اپنے حویلی نما گھر میں روانہ ہوگئی۔ اگلے دن قاری عبدالحمید، رخسانہ ناز کی حویلی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رخسانہ نے رسمی گفتگو کے بعد قاری عبدالحمید سے کہا۔

''کیا آپ دو ماہ کے لیے زیمل کو میرے ساتھ میرے گھر جانے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ اصل میں میری ملازمہ جو دن، رات میرے ساتھ ہوتی ہے وہ چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ نئی قابل اعتبار ملازمہ ڈھونڈنا شہر میں خاصا مشکل ہے۔ رات میں، میں اکیلی نہیں رہ سکتی وقت کاٹنا خاصا مشکل ہوجاتا ہے۔ پھر میری طبیعت خراب ہوجائے تو بڑا مسئلہ ہوجائے گا۔''

قاری عبدالحمید، رخسانہ ناز کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ پھر کہا۔ ''آپا رخسانہ! آپ کو شہر میں تنہا رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ یہاں گاؤں میں رہیں آپ کی خدمت کے لیے ہم باپ بیٹی حاضر ہیں۔''

''بھائی عبدالحمید! میں سالوں سے شہر میں رہ رہی ہوں۔ یہاں گاؤں میں، میں ہفتے، دس دن سے زیادہ نہیں رک سکتی۔ آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔ زیمل کو میں بیٹی سمجھتی ہوں ہوسکا تو میں کوشش کروں گی کہ شہر میں اس کے لیے کسی اچھے اور نیک لڑکے کا رشتہ مل جائے۔ زیمل پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہے۔''

قاری عبدالحمید انکار کرتے ہوئے ہچکچانے لگے۔ رخسانہ ناز کے آگے انکار کی ان میں ہمت نہ تھی۔ رخسانہ ناز نے چکنی چپڑی باتیں کرکے انہیں راضی کرلیا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب زیمل کی خوشی سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ وہ رخسانہ ناز کے ساتھ ان کے گھر میں موجود تھی۔ زیمل کو شہر پہنچنا ایک خواب لگ رہا تھا۔ کئی دفعہ اس نے اپنے بازو میں چٹکی کاٹ کر تسلی کی کہ وہ حقیقت کی دنیا میں ہے۔

''تمہارے ابا، ایک بوڑھی بلا ہیں۔ تم دیکھنا میں تمہیں اس اذیت بھری زندگی سے نجات دلا کر رہوں گی۔ کل صبح میں تمہیں مارکیٹ لے جاؤں گی وہاں تم بوتیک سے اچھے، اچھے سوٹ لینا۔ تم میرے ساتھ پارلر بھی چلنا تمہاری آئی بروز اور ہیئر کٹنگ ہوجائے گی۔ میں تمہیں سر سے پاؤں تک بدل دوں گی۔ تم خود حیران رہ جاؤ گی۔''

رات سوتے وقت رخسانہ ناز نے زیمل سے کہا۔ زیمل ان کے پاؤں دبانے میں مصروف تھی۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ اگلے دن رخسانہ ناز نے زیمل کو شاپنگ بھی کرائی اور اسے پارلر بھی لے گئیں۔ گھر آ کر زیمل نے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر بھرپور نظروں سے اپنا جائزہ لیا تو اسے

اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

''کیا واقعی میں ہوں؟'' زیمل کو زندگی میں پہلی بار اپنی بے انتہا خوبصورتی کا احساس ہوا۔ نت نئے جذبے تھے کہ امنڈتے چلے آرہے تھے۔ نئے خواب پا کر زیمل نے فیصلہ کیا کہ ماضی کی بے روح اور گھٹن زدہ زندگی سے ہر قیمت پر چھٹکارہ حاصل کیا جائے مگر کیسے؟ یہ ایک سوالیہ نشان تھا۔

''خود کو آئینے میں دیکھ کر کیسا لگ رہا ہے تمہیں۔'' رخسانہ ناز نے کمرے میں داخل ہو کر زیمل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''بہت اچھا آپ نے میرے لیے اتنا کچھ کیا مگر میرے خوب صورت نظر آنے کا کیا فائدہ؟ مجھے جانا تو ابا کے پاس ہے نہ کہ شوہر کے گھر۔ ابا کے پاس جا کر پھر میں مشقت بھری زندگی گزاروں گی۔'' زیمل کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔

''تم فکر کیوں کرتی ہو میں تمہارے لیے اچھا سا رشتہ تلاش کرتی ہوں۔ اس سلسلے میں، میں اتوار کے اخبار میں اشتہار دینے والی ہوں۔''

''رخسانہ خالہ! سچ آپ میرے لیے اتنا کچھ کرنے والی ہیں۔ میں آپ کا شکریہ لفظوں میں ادا نہیں کر سکتی۔''

''بس تم دعاؤں میں مجھے یاد رکھنا۔ تمہارے لیے میں کچھ کر سکوں میرے لیے یہی اہم ہے۔''

''خالہ! اگر ابا کو اشتہار کے متعلق پتہ چل گیا تو کیا ہوگا وہ تو سخت خفا ہوں گے۔''

''ضرورت رشتہ کے لیے اشتہار دینا معیوب نہیں میں کون سا غلط بیانی کر رہی ہوں تمہاری شخصیت اور تعلیم حقیقی بیان کر رہی ہوں جو فیملی یا لڑکا تم سے شادی کا خواہش مند ہوگا وہ آ کر تمہیں دیکھے گا پھر ہی رشتہ طے ہوگا۔ تمہارے ابا کو راضی کرنا میرا کام ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے خالہ مگر ایک بات میں آپ کو بتا دوں کہ میں کسی مولوی ٹائپ لڑکے سے شادی نہیں کروں گی۔'' زیمل نے قطعی لہجے میں کہا۔

''تو تم پر امید ہو کہ تمہارے لیے کسی ہینڈسم اور آزاد خیال لڑکے کا رشتہ آئے گا۔'' رخسانہ ناز نے معنی خیز مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل، میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ میرے لیے اتنا کچھ کریں گی۔ میرے رشتے کے لیے اخبار میں اشتہار دیں گی۔''

''یہ تو مجبوری ہے شہر میں رشتوں کا حصول آسان نہیں۔ ایک دوسرے سے میل ملاپ ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ اب تم آئینے کے سامنے کھڑی رہو گی یا میرے لیے کھانے کا کچھ انتظام بھی کرو گی۔ سارا دن باہر گھومنے کے بعد میں تھک گئی ہوں۔''

''آپ بتائیں کیا پکانا ہے میں فوراً بنا لیتی ہوں۔''

''فریج میں سے چکن نکال کر کڑاہی بنا لو سخت بھوک لگ رہی ہے۔ دوپہر میں صرف برگر پر گزارہ کیا تھا۔''

''جی بہتر خالہ'' زیمل نے سعادت مندی سے کہا اور فوراً کمرے سے نکل گئی۔

اتوار کے دن رخسانہ ناز کی طرف سے ضرورت رشتہ کا اشتہار اخبار میں شائع ہو گیا۔ زیمل نے اخبار میں شائع اشتہار پڑھا اور مسکرا دی۔ اشتہار میں تحریر تھا۔

''انیس سالہ دوشیزہ، بے انتہا خوبصورت تعلیم انٹر، مذہبی گھرانے سے تعلق کے لیے پڑھے لکھے برسر روزگار لڑکے سے رابطہ کریں۔ جنہیں جہیز کا لالچ نہ ہو۔''

اشتہار شائع ہونے کے چوتھے روز رخسانہ ناز سے کسی خاتون نے رابطہ کیا۔ اگلے روز وہ اپنے بھانجے کے ساتھ ان کے گھر پر موجود تھیں۔ خاتون کا نام فرح تھا۔ انہوں نے اپنے بھانجے کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ ان کے بھانجے کا نام سوحان ہے اور اس نے بی کام تک تعلیم حاصل کی ہے۔

''میں سوحان کی شادی جلد از جلد کر کے اپنی بیٹی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ سوحان اپنی ماں کی وفات کے بعد سے میرے پاس ہے۔ اس کے والد دوسری شادی کر چکے ہیں۔ سوحان بے حد سیدھا سادہ ہے۔ اس لیے میں نے

سوچا اس کی شادی ایسی لڑکی سے ہو جو تیز طرار نہ ہو۔'' سوحان کی خالہ فرح نے مزید بتایا۔

چائے سے فارغ ہو کر رخسانہ ناز، فرح کو ساتھ لے کر برابر والے کمرے میں چلی گئیں تاکہ سوحان اور زیمل ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں۔

''جہاں تک آپ کے حسن کا تعلق ہے اشتہار میں ہرگز جھوٹ نہیں لکھا گیا ہے مگر مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ آپ کو شوہر کی تلاش کے لیے ایسا عجیب طریقہ کیوں اختیار کرنا پڑا۔ آپ جیسی خوب صورت لڑکی کے لیے شوہر کی تلاش تو کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔'' سوحان نے زیمل سے براہ راست گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

زیمل نے جواب دیتے ہوئے اپنے گھریلو حالات کی وضاحت کی کہ اس کے والد اس کی شادی کس طرح کے شخص سے کرنے کے خواہش مند تھے۔ جوں، جوں وہ سوحان سے گفتگو کرتی گئی اسے سوحان کا نیم مزاحیہ، ہمدردانہ لہجہ متاثر کرنے لگا اور وہ قائل ہوگئی کہ سوحان کے ساتھ زندگی گزارنا سہل ہوگا۔ ایک گھنٹے کی روبرو ملاقات کے بعد زیمل نے سوحان پر اپنے حالات واضح کر دیے اور اپنی مشکل بیان کردی۔

''میری عمر انیس برس ہے اور میں اپنے والد کی رضا مندی کے بغیر شادی نہیں کرسکتی۔ میرے والد کبھی ایسا داماد قبول نہیں کریں گے جو مذہبی گھرانے سے تعلق نہ رکھتا ہو وہ تو میری شادی کسی قاری یا مولانا سے کرنے کے خواہش مند ہیں۔'' یہ سن کر سوحان کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور وہ بولا۔

''آپ فکر نہ کریں آپ کے والد کو مطمئن کرنا میرا کام ہے میں اپنے خاندان کا ایسا پس منظر بیان کروں گا کہ آپ کے والد مجھے بھی اپنے جیسے مولوی خاندان کا فرد سمجھیں گے۔'' سوحان نے اسے مطمئن کیا زیمل کو یوں لگا جیسے وہ اور سوحان اور بھی قریب آ گئے ہوں۔

''سوحان، گھر چلنے کا ارادہ نہیں ہے۔'' اتنے میں سوحان کی خالہ، رخسانہ ناز کے ساتھ آ گئیں اور انہوں نے کمرے میں آتے ہی سوحان پر طنز کیا۔

''جی چلیں۔'' سوحان نے کھسیا کر کہا۔

سوحان کے رخصت ہونے کے بعد رخسانہ ناز نے زیمل سے پوچھا کہ اسے سوحان کیسا لگا ہے۔

''بہت اچھا، میں تو دل سے دعا کر رہی ہوں خالہ، بھانجے کی گھر جا کر ایک رائے ہو۔''

''مجھے تو لگ رہا ہے سوحان کو تم پسند آ گئی ہو۔ اصل میں تو لڑکے کی پسند اہم ہے اگر ان لوگوں کی طرف سے مثبت جواب آ گیا تو پھر یہ سوچنا ہوگا کہ تمہارے والد کو کیسے راضی کیا جائے۔'' رخسانہ ناز نے سوچتے ہوئے کہا۔

''خالہ! ابا کو منانا آپ کا کام ہے آپ کہہ دیجیے گا کہ یہ لوگ آپ کے جاننے والے ہیں۔ ابا انجان لوگوں کا سن کر ملنے پر بھی تیار نہیں ہوں گے۔''

''فکر مت کرو میری جان، پہلے ان لوگوں کی طرف سے ہاں تو ہونے دو اس کے بعد تمہارے ابا کو بھی سنبھال لیں گے۔'' رخسانہ ناز بے فکری سے بولی۔

زیمل سوچنے لگی بہت جلد اس کے خواب پورے ہونے والے ہیں جن کی تعبیر کی تلاش میں وہ شہر آئی تھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا سوحان کی خالہ نے رخسانہ ناز سے رابطہ نہیں کیا۔ اس دوران زیمل کے لیے اخبار کی وساطت سے تین رشتے اور بھی آئے ان لوگوں کو زیمل کے دیہاتی پس منظر پر اعتراض تھا۔ زیمل ایک دفعہ پھر مایوسی کا شکار ہوگئی۔

تقریباً مہینے بعد سوحان کی خالہ فرح نے رخسانہ ناز سے رابطہ کیا اور ان کو اپنی طبیعت کی خرابی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ وہ زیمل کے والد کو شہر بلوالیں وہ سوحان کی ان سے ملاقات کروا کر جلد از جلد اس معاملے میں ان کی رائے کی خواہش مند ہیں تاکہ شادی جیسی اہم ذمے داری کو ادا کیا جاسکے۔

رخسانہ ناز نے اگلے دن قاری عبدالحمید سے رابطہ کیا اور انہیں زیمل کے لیے آئے رشتے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ وہ سوحان کی فیملی کو اچھی طرح سے جانتی ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے قاری عبدالحمید پر زور دیتے ہوئے کہا

کہ وہ سوحان سے شہر آ کر ملاقات کرلیں اتنے اچھے لوگ کسی کی طرف سے ہاں کے انتظار میں بیٹھے نہیں رہتے۔ سوحان کی مثالی پارسائی کی بھی رخسانہ ناز نے زوردار تعریفیں کیں۔

آخر عبدالحمید ہچکچاتے ہوئے سوحان سے ملاقات پر آمادہ ہوگئے۔ وہ فوراً شہر پہنچے سوحان اور اس کے والد سے ملاقات کی۔ ہر طرح کی تسلی کے بعد سوحان اور زیمل کی شادی سادگی سے کرنے پر تیار ہوگئے۔ ایک ماہ کے اندر زیمل کی شادی سوحان سے ہوگئی۔ زیمل کی رخصتی اپنے گاؤں سے ہوئی۔ شہر میں وہ سوحان کی خالہ کے گھر رخصت ہوکر آئی۔ شادی کے بعد دو ماہ کیسے گزرے زیمل کو پتہ ہی نہیں چلا۔

سوحان نہایت زندہ دل شخص تھا۔ بے رنگ، پرہیزگاری میں برسوں گزارنے نے زیمل میں بچگانہ حرص پیدا کردی تھی مگر سوحان کسی چیز پر اعتراض نہ کرتا۔ صرف ایک چیز کبھی، کبھی زیمل کو پریشان کردیتی سوحان اپنے بارے میں بہت کم بات کرتا۔

سوحان کی خالہ فرح اپنی بیٹی کے پاس کینیڈا روانہ ہوگئیں۔ ان کی روانگی کے اگلے روز سوحان نے زیمل سے کہا کہ اسے اب اپنے والد کے ساتھ رہنا ہوگا کیونکہ اس گھر کا کرایہ دینا اس کے بس کی بات نہیں۔

زیمل اپنے ساس، سسر کے ساتھ رہنا تو نہیں چاہتی تھی مگر سوحان کی بات ماننا اس کی مجبوری تھی۔ سوحان نے بتایا کہ اسے ہفتے والے دن ہر صورت میں اپنے والد کے پاس پہنچنا ہے۔ سارے دن زیمل شفٹنگ میں مصروف رہی۔ رات گئے وہ سوحان کے والد کی قیام گاہ پر پہنچ گئی۔ ہر طرف گہری تاریکی تھی۔ زیمل سارا دن کام کرکے تھک چکی تھی۔ پلنگ پر گر کر سونا چاہتی تھی۔

سوحان کا کمرہ اوپر والی منزل پر تھا۔ تکیے پر سر رکھتے ہی زیمل کو نیند آ گئی۔ صبح فجر کے وقت زیمل کی آنکھ کھلی تو مسجد سے اذان کی آواز آرہی تھی۔ سوحان بیڈ کے پاس کھڑا سر پر ٹوپی پہن رہا تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔

''تم نماز پڑھنے جارہے ہو؟'' زیمل نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ ایک چھوٹے سے اعتراف کا وقت آ گیا ہے۔ زیمل! جب میں نے اخبار پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے تمہارا اشتہار دیکھا تھا تو مجھے صرف تجسس ہوا تھا۔ میں نے خالہ سے ذکر کیا بقول ان کے مجھے اشتہار میں بتائی گئی لڑکی سے ملاقات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے لیے لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ میں نے خالہ سے کہا لڑکی کو دیکھنے میں برائی کیا ہے۔ آپ تو ویسے بھی میرے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ ہوسکتا ہے لڑکی کے گھر جانے پر ہمیں لڑکی اور اس کی فیملی پسند آجائے اور ہوا بھی یہی جیسے ہی میں نے تمہیں دیکھا مجھے تم سے محبت ہوگئی۔ میں نے تمہیں پانے کا ارادہ کرلیا اور جب ایمان داری سے یہ کام بنتا نظر نہ آیا تو میں نے ہر ہتھکنڈا استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اب تم سے یہ بات چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں کہ میرے والد مولانا ہیں۔ ان کی خواہش کے مطابق میں نے عالم دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ میں مدرسے میں بچوں کو فی الحال دینی تعلیم دے رہا ہوں۔''

یہ سنتے ہی زیمل بستر سے اتر کر آ گئی اور چلا کر بولی۔

''میں تمہیں ہرگز معاف نہیں کروں گی تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ تم نے میری مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دھوکے سے مجھ سے شادی کی میں سب کے سامنے تمہارا ایسا تماشا بناؤں گی تمہاری عزت دو کوڑی کی رہ جائے گی۔''

''زیمل! اپنے غصے کو کنٹرول کرو۔ تم میری بیوی ہو۔ دو ماہ سے تم میرے ساتھ رہ رہی ہو تم نے میری شخصیت میں کوئی برائی دیکھی ہے میں نے تم پر کوئی پابندی لگائی ہے یا سختی کی ہے جس کی بناء پر تم اپنے ابا کی شخصیت کا موازنہ مجھ سے کرو۔ دنیا طرح طرح کے افسانوں سے بھری پڑی ہے۔ تمام مذہبی لوگ سخت دل اور اپنی بات منوانے والے نہیں ہوتے۔ مذہب عورت اور مرد کو برابری کا درجہ دیتا ہے اور

میں بھی اس بات کا حامی ہوں۔ میں نے والد سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس گھر میں اوپر کا پورشن میرا ہوگا۔ نیچے میرے والد اور سوتیلی والدہ رہیں گے۔ یہ سب کچھ میں نے تمہاری وجہ سے کیا مگر تم ہو کہ میری غلطی کو نظر انداز کرنے کو تیار نہیں ہو۔''

''تم باہر جاؤ مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔'' زیمل نے یہ کہتے ہوئے سوحان کو دروازے سے باہر دھکیلا اور دروازہ لاک کر کے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی۔ سارا دن وہ کمرے میں بند رہی سوحان نے رات کے کھانے تک اپنی واپسی کا کوئی اشارہ نہیں دیا۔ مغرب کی نماز کے بعد سوحان کھانا لے کر دروازے تک آیا اور کہا۔

''زیمل! مجھے سزا دینے کے لیے تمہیں زندہ رہنا چاہیے اور زندہ رہنے کے لیے کھانا بہت ضروری ہے پلیز دروازہ کھولو۔'' سوحان کی بات سن کر زیمل نے اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کی مگر وہ صبح سے بھوکی تھی۔ اس نے نہ ناشتہ کیا تھا اور نہ دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ آخر بھوک اس پر غالب آ گئی۔ زیمل نے دروازہ کھول دیا۔ سوحان نے ٹرے اس کی طرف بڑھائی۔

زیمل نے ٹرے سوحان سے لے کر کھانا کھایا تھوڑی دیر میں اس نے بریانی کی پلیٹ صاف کر دی۔ سوحان خاموشی سے بیٹھا اسے کھانا کھاتے دیکھتا رہا۔ زیمل نے کھانا کھا کر پانی پیا اور سوحان سے مخاطب ہوئی۔

''تم نے میرے ساتھ جو دھوکا کیا ہے اس کی وجہ سے میں سوائے اشد ضرورت کے کبھی تم سے بات کرنا پسند نہیں کروں گی مگر میں یہ بات واضح کر دوں کہ مجھے تم سے کوئی محبت نہیں ہے۔ میں اپنے طور طریقوں سے زندگی گزاروں گی۔ مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا۔''

''سوچ لو، تم ایک جذباتی فیصلہ کر رہی ہو، ہو سکتا ہے تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑے۔'' سوحان نے زیمل کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کچھ سننے، سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''میں تمہاری طرح جذباتی نہیں ہوں تم بتاؤ، تم کہاں جانا چاہتی ہو میں تمہیں وہاں چھوڑ آؤں گا۔'' سوحان بولا۔

''فی الحال تو مجھے خود پتہ نہیں کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ ابا کے پاس میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے تم سوچ لو تمہیں کہاں جانا ہے۔ کل دوپہر کو امی نے گھر میں چھوٹی سی دعوت رکھی ہے اس دعوت کو تم ولیمے کا نام دے سکتی ہو۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں خاندان والوں سے متعارف کروایا جائے۔ امی سخت خفا ہو رہی تھیں کہ تم ان سے ملنے نیچے نہیں گئیں۔ میں نے بہانہ بنا دیا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم ان سے ملنے چلی جانا۔ ابو بھی پوچھ رہے تھے بلکہ تم ابھی ملنے چلو۔'' سوحان کی بات سن کر زیمل شش و پنج میں رہی کہ وہ انکار کرے یا نہ کرے آخر کچھ سوچ کر وہ اٹھ کر کپڑے بدلنے چلی گئی کہ سوحان کی سوتیلی امی سے ملاقات اس کے انتقامی منصوبے کا بہترین آغاز ہو سکتی ہے۔ زیمل کپڑے بدل کر تیار ہو گئی تو سوحان اسے ساتھ لے کر نیچے آ گیا۔

سوحان کی والدہ فرخندہ بیگم نے زیمل کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ سوحان اور اس کے درمیان معاملات ٹھیک نہیں چل رہے۔ فرخندہ بیگم کا کل وقتی مشغلہ لگائی بجھائی کرنا تھا۔ ان کی ایک بے حد معمولی شکل کی بھتیجی تھی جس کے لیے انہوں نے ایک مدت سے سوحان پر آنکھ رکھی ہوئی تھی۔ اب انہیں اطمینان ہوا کہ ان کی بھتیجی کا رشتہ ٹھکرا کر سوحان نے جس لڑکی سے شادی کی اس سے اس کی شادی چلتی نظر نہیں آ رہی۔

سوحان کی سوتیلی بہن حرا چائے بنا کر لے آئی۔ چائے کا کپ ختم ہونے سے پہلے زیمل کی ساس فرخندہ بیگم نے تھوڑی سی محنت سے زیمل سے سب کچھ اگلوا لیا اور بولیں۔

''سوحان نے تمہیں دھوکہ دیا ہے تم ٹھیک کر رہی ہو۔ اسے اپنی حقیقت بتانی چاہیے تھی۔'' فرخندہ بیگم کی بات سن کر زیمل نے سوچا وہ سوحان کے ساتھ جو کچھ کر رہی ہے۔ وہ درست ہے چائے سے فارغ ہو کر زیمل اس کمرے میں

آئی جہاں سوحان اپنے والد یوسف احمد سے باتوں میں مصروف تھا۔

زیمل نے یوسف احمد کے قریب جا کر زور سے سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اچٹتی ہوئی نظر زیمل پر ڈالی۔ گلے میں پڑا کامدار دوپٹہ دیکھ کر سوحان کے ابو بوکھلا گئے۔ ان کا یہ تصور کہ زیمل سر پر دوپٹہ لیے نظریں جھکائے ہوگی۔ خاک میں مل چکا تھا۔

''بیٹا! سوحان بتا رہا تھا تمہاری طبیعت صبح ٹھیک نہیں تھی۔ تم اوپر آرام کر رہی تھیں۔ اب کیسی ہے تمہاری طبیعت؟''

''میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے سوحان نے آپ سے غلط بیانی کی ہے کہ میں بیمار ہوں۔ صبح میرا سوحان سے جھگڑا ہوا تھا۔ اس جھگڑے کی وجہ کیا تھی آپ سوحان سے نہیں پوچھیں گے۔''

زیمل نے سخت لہجے میں کہا۔ یوسف احمد اپنی بہو کے تیور دیکھ کر حیران تھے۔

''بیٹا! تم ہی وجہ بتا دو۔ میاں، بیوی کے درمیان چھوٹے، موٹے اختلافات ہوتے رہتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ان اختلافات کو کمرے میں بیٹھ کر دور کر لیا جائے کسی تیسرے کا اس میں ذکر نہ کیا جائے۔'' یوسف احمد نے نرم لہجے میں کہا۔

''آپ کو بتانا میری مجبوری ہے وہ رشتے جن کی بنیاد جھوٹ پر رکھی جائے دیر پا نہیں ہوتے اور مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ آپ کا بیٹا دھوکے باز اور جھوٹا ہے۔ وہ میرا شوہر بننے کے لائق نہیں تھا۔''

''سوحان یہ میں کیا سن رہا ہوں یہ بچی کیا کہہ رہی ہے؟''

''ابو! زیمل بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہی ہے۔ اس نے میری عزت کا تماشا بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' سوحان نے غصے سے زیمل کو گھورا۔ یوسف احمد یہ سنتے ہی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''زیمل! تمہاری وجہ سے ابو ناراض ہو کر گئے ہیں تم انتہائی بے وقوف اور خود سر لڑکی ہو ایک دن تم بہت پچھتاؤ گی۔''

''پچھتاتو میں اب بھی رہی ہوں تم سے شادی کر کے اتنی جدوجہد کرنے کے بعد مجھے حاصل کیا ہوا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں شہر آنے کے بجائے اپنے ابا کے حکم پر سر جھکاتے ہوئے گاؤں کے کسی مرد سے شادی کر لیتی۔'' فرخندہ بیگم زیمل کی بات سن کر زیر لب مسکرا رہی تھیں۔ ان کو اس تماشے سے لطف آ رہا تھا۔

''زیمل تم اوپر اپنے کمرے میں جاؤ میں ابو سے بات کر کے آتا ہوں۔'' سوحان نے سخت لہجے میں کہا اور تیزی سے یوسف احمد کے کمرے میں چلا گیا۔ یوسف احمد پلنگ پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ سوحان خاموشی سے ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔ اپنے ابو کے پیروں کو تھام کر اس نے اپنا سر ان کے گھٹنے پر ٹکا دیا۔

یوسف احمد نے آنکھیں کھولیں اور سوحان سے تمام حقیقت دریافت کی۔ یہ بات تو وہ اچھی طرح سے جانتے تھے سوحان نیک دل اور شریف انسان ہے۔ سوحان کی حقیقت پسندی اور محبت بھری شخصیت کے وہ دل سے قائل تھے۔ سوحان کی زبانی زیمل کی ناراضگی کی وجہ جاننے کے بعد وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولے۔

''مجھے پتہ ہے کہ تم میری طرح ایک عالم کی زندگی گزارنا چاہتے تھے میں نے خود تمہیں کہا تھا کہ تمہیں کوئی ملازمت مل سکتی ہو تو تم کر لو۔ بی کام کرنے کے بعد تم نے کوشش بھی کی اور اب بھی کر رہے ہو۔ قسمت میں ہوا تو تمہیں نوکری مل جائے گی۔ میں نے ہی تمہیں کہا تھا کہ جب تک تمہیں نوکری نہیں ملتی تم مدرسے میں پڑھاؤ۔ تم اپنی بیوی کو سمجھا سکتے ہو تو سمجھا لو۔ میں نے قاری عبدالحمید سے ملتے ہی اس رشتے کی رضامندی دے دی تھی۔ شاید میں نے فیصلہ کرنے میں جلدی کی تھی۔ فی الحال تو تم زیمل کو سمجھاؤ اگر وہ تمہاری معافی کے باوجود تمہارے ساتھ رہنے

کے لیے تیار نہ ہو تو میں صرف ایک بات کہوں گا کہ تعلق کو روگ اور محبت کو بوجھ بننے سے پہلے توڑ دینا اچھا ہوتا ہے۔''

سوحان، ابو سے اجازت لے کر اوپر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

کمرے میں زیمل ہاتھوں کے ناخنوں پر نیل پالش لگا رہی تھی۔ اس نے سوحان کو سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

''زیمل! مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔''

''ہاں کہو'' وہ بے نیازی سے بولی۔

''میری اچھی بیوی!'' سوحان نے نرمی مگر کسی قدر غیر سنجیدگی سے کہا۔

''میری وجہ سے تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہو تو اس کے لیے میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ تمہاری خاطر میں نوکری کروں گا اور مزید تعلیم حاصل کروں گا۔ میں تمہیں ہر آسائش مہیا کروں گا جس کی تم خواہش مند ہو۔''

''تم مجھے کیا دے سکتے ہو ایک سسکتی ہوئی زندگی، جو میں ہرگز گزارنا نہیں چاہتی۔ تم سے شادی کرنے سے بہتر تھا کہ میں اپنے بل بوتے پر کچھ بننے کی کوشش کرتی۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ میں جتنی خوبصورت اور پرکشش ہوں مجھے تم سے بہتر مرد شادی کے لیے مل سکتا ہے۔ میں اپنے باپ کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گی۔ خود اپنے پیروں پر کھڑی ہوں گی تم دیکھنا میں تمہیں کچھ کر کے دکھاؤں گی۔'' زیمل نے نخوت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ تم اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کرنا چاہتی ہو وہ تمہیں سکون مہیا کر سکے گا۔ دنیا ایسے مردوں سے بھری پڑی ہے جو تم پر دل و جاں سے فریفتہ ہو جائیں گے مگر تم خود ایسے مردوں سے محبت نہیں کر سکتیں۔ جنہیں صرف تمہاری خوبصورتی سے دلچسپی ہو مگر تمہارے جذبات و احساسات کی پروا نہ ہو۔ یہ فیصلہ میں تم پر چھوڑتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے مگر تم جو بھی کرو اس کے لیے جوش کے بجائے ہوش کو استعمال کرو ابھی تم جذباتی ہو رہی ہو۔ میں کل کی دعوت کے بعد تمہیں رخسانہ آنٹی کے پاس چھوڑ دوں گا۔ تمہیں جو بھی فیصلہ کرنا ہو مجھے آگاہ کر دینا۔'' سوحان نے یہ کہہ کر تکیہ اٹھایا اور نیچے چادر بچھا کر لیٹ گیا۔

سوحان کے اندر خوابوں کا محل کانچ کی طرح ٹوٹا۔ جس کی مہلک کرچیوں سے اس کا بدن لہولہان ہو گیا تھا۔

دو دن بعد زیمل پھر سے رخسانہ ناز کے گھر پر موجود تھی۔ سوحان اسے گیٹ تک چھوڑنے کے بعد چلا گیا تھا۔ زیمل نے رخسانہ ناز کو شادی کے بعد کے تمام واقعات بتا دیئے تھے۔

''خالہ! آپ تو سوحان کی فیملی کے متعلق سب کچھ جانتی تھیں آپ نے مجھ سے کیوں چھپایا۔'' زیمل نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔

''اس لیے کہ سوحان مجھے پہلی ملاقات میں بہت اچھا لگا تھا۔ میری بعد میں بھی اس سے فون پر بات ہوئی تھی۔ اس کے خیالات تمہارے ابا سے یکسر مختلف تھے محض مولوی کا بیٹا ہونے کی بنیاد پر اسے ریجکٹ کرنا مناسب نہیں تھا۔ مجھے بہتر لگا کہ یہ بات تم سے چھپی رہے تو اچھا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تمہیں اچھی بیوی کی طرح سوحان کے پاس چلے جانا چاہیے۔''

''ہرگز نہیں میں کسی بھی قیمت پر سوحان کی اطاعت گزار بیوی نہیں بن سکتی۔ آپ نے مجھ پر اتنے احسان کیے ہیں۔ برائے مہربانی مجھ پر ایک احسان اور کیجئے مجھے کہیں ملازمت دلوا دیں۔ میں آپ کے پاس رہی تو ابا آپ کا جینا دوبھر کر دیں گے اور مجھ پر زور ڈالیں گے کہ میں سوحان کے پاس واپس چلی جاؤں۔''

''تم، سوحان کے پاس واپس نہیں جانا چاہتی ہو تو کیا تم اس سے طلاق لینا چاہتی ہو؟''

''ہرگز نہیں، ابھی مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس کی محبت میں گرفتار ہو کر میں سوحان سے طلاق لے لوں۔'' زیمل نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہیں پانی بھابی کے پاس کراچی بھیج دوں گی ان کا بوتیک ہے وہاں تم کام کرنا۔ وہ سلائی، کڑھائی

سیکھنے میں تمہاری مدد کریں گی۔'' رخسانہ ناز بولیں۔ چند دنوں کے اندر رخسانہ ناز نے اپنی بھابی سے بات کرلی۔

زیمل، رخسانہ ناز کے ہمراہ لاہور سے کراچی روانہ ہو گئی۔ کراچی میں اس کی رخسانہ ناز کی بھابی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اسے اپنے بوتیک میں ملازمت دینے کی حامی بھرلی۔ ساتھ ہی اپنے گھر میں رہائش دے دی۔

کراچی پہنچ کر زیمل نے سوحان سے ہر قسم کا رابطہ منقطع کرلیا۔ رخسانہ ناز کی بھابی کے لیے زیمل کاروباری اثاثہ ثابت ہوئی۔ جلد ہی ان پر یہ بات کھل گئی کہ زیمل میں ڈریس ڈیزائنر کی قدرتی صلاحیت ہے۔ زیمل نے تیزی سے اس شعبے میں ترقی کی پانچ برس کے عرصے میں وہ خاصی کمائی کرنے لگی۔

ایک دن اچانک اسے اپنے باپ کا غم ناک خط ملا۔ عبدالحمید بستر مرگ پر تھے انہوں نے زیمل کے نام خط میں لکھا تھا۔

''تم نے مجھے اور اپنے معزز خاوند کو بے حد دکھ دیا ہے۔ میں مرنے سے پہلے تمہارے اور اپنے بیچ موجود رنجش کو ختم کردینا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہیں حلف کیا مجھے بے حد خوشی ہوگی اگر تم تھوڑی دیر کے لیے سہی مجھ سے آکر ملالو۔ میری بے چین روح کو سکون مل جائے گا۔'' بوجھل دل لیے زیمل اپنے ابا سے ملنے پہنچی۔

قاری عبدالحمید شدید کمزوری کی حالت میں بستر پر پڑے تھے۔ زیمل کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''ابا! میں آگئی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو ذہنی اذیت دی اگر ہوسکے تو مجھے معاف کردیجئے گا۔''

''زیمل نے ابا کا ہاتھ تھامتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔'' عبدالحمید نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیں۔ زیمل کی ان سے ملاقات کے تیسرے روز ان کا انتقال ہوگیا۔ قاری عبدالحمید کی تدفین کے بعد زیمل رخسانہ ناز سے ملنے لاہور پہنچ گئی۔

رخسانہ ناز پہلے کی نسبت خاصی کمزور ہوگئی تھیں۔ انہوں نے زیمل کو بتایا کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کے پاس مستقل شفٹ ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ بہت اچھا فیصلہ کیا ہے آپ یہاں پر تنہا کب تک رہیں گی۔''

''بھائی عبدالحمید کی وفات کا سن کر بہت صدمہ ہوا اچھی بات ہے انہوں نے موت سے پہلے، تمہارے اور اپنے بیچ موجود رنجش کو ختم کردیا۔ تم اپنی سناؤ تمہیں اپنے لیے کوئی مناسب جیون ساتھی ملا۔'' زیمل نے ان کی بات سن کر نفی میں سر ہلادیا۔

''آپ کی بھابی کے بوتیک میں مجھے کئی لوگوں نے پسند کیا جب انہیں پتہ چلا کہ میری شادی ہوچکی ہے اور میں اپنے شوہر کے پاس صرف دو ماہ رہی ہوں تو وہ لوگ میری شخصیت میں عیب تلاش کرنے لگے کہ یقیناً غلطی میری ہے جو میں شوہر کو چھوڑ کر کسی غیر کے گھر پر پڑی ہوں۔ اب تو مجھے اس بات کا اندازہ ہوگیا ہے کہ کوئی شخص اگر مجھ سے شادی کرے گا تو یہ سوچ کر کہ میں کماؤ بیوی ہوں۔ مجھے سچی محبت کرنے والا نہیں ملے گا۔''

''یہ تو حقیقت ہے سوحان کی سچی محبت کو ٹھکرا کر تم ہمیشہ محبت کے لیے ترستی رہو گی۔ محبت ایسی چیز ہے جو دولت سے نہیں ملتی مجھے ہی دیکھ لو۔ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد، ان کی دولت کی وارث ہونے کے باوجود میں تمام زندگی شوہر کی محبت کے لیے ترستی رہی ہوں۔ آج میں تمہارے سامنے اپنے شوہر کی حقیقت اس لیے بیان کررہی ہوں کہ ہوسکتا ہے تم اپنے شوہر سے رابطہ کرلو۔

فصیح الدین میرے شوہر تھے۔ ہماری شادی ارینج میرج تھی۔ شادی کے بعد میں فصیح کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہی۔ ہر وقت وہ مجھ سے رقم کا مطالبہ کرتے رہتے۔ میں احتجاج کرتی تو ان کا ایک ہی جواب ہوتا۔ تمہارے بابا اگر تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں تو تمہاری خوشی کا احساس کرتے ہوئے رقم ضرور دیں گے۔ میں اپنے کاروبار کے لیے رقم نہیں مانگ رہا وہ جو رقم دے رہے ہیں تمہارے لیے دے رہے ہیں۔ لوگ مجھے خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ مجھے فصیح جیسے کامیاب کاروباری کی بیوی بننا

نصیب ہوا ہے۔ میں تنہائی میں سوچتی کہ میں واقعی خوش قسمت ہوں اور مجھے اس رشتے پر ناز کرنا چاہیے۔

فصیح ہر چیز کو روپے سے تولتا۔ اس کی نظر میں بڑا مکان، عمدہ فرنیچر، بھاری بینک بیلنس، خوشیاں ناپنے کے پیمانے تھے۔ فصیح کو رقم دے کر میرے بابا کو ہمیشہ خوشی ہوتی وہ سوچتے یہ سب کچھ وہ میرے لیے کر رہے ہیں۔ میں دو بیٹوں کی ماں بن گئی مگر فصیح کے دل میں جگہ نہ بنا سکی۔ مجھے فصیح سے صرف ایک چیز چاہیے تھی جس کی تمام انسانوں کو ضرورت ہوتی ہے اور وہ چیز ہے ''محبت'' فصیح کو اپنے آپ سے محبت نہیں تھی۔ وہ مجھ سے کیا محبت کرتا۔ اسے اولاد کی شکل میں بھی لڑکے چاہیے تھے۔ لڑکی نہیں۔ میرے اس سے خیالات کبھی نہیں ملے۔ میں نے کئی بار سوچا کہ میں فصیح سے علیحدگی اختیار کرلوں۔

گزرتے وقت کے ساتھ فصیح کی غیر عورتوں میں دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ میں اپنے دل کی بات کبھی اپنے بابا کو نہیں بتا سکی بظاہر خوش نظر آنے والی، اندر سے کس قدر دکھی تھی۔ فصیح امریکہ بزنس کے سلسلے میں گئے بعد میں وہ وہیں کے ہو گئے۔ انہوں نے وہاں شادی کرلی۔ انہوں نے مجھ سے بے وفائی کی زیمل تم خوش نصیب ہو۔ سوحان تمہارے بغیر تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ ایک آس کے سہارے کہ شاید تم کبھی اس کی زندگی میں واپس لوٹ آؤ۔

''خالہ! میں اب چلوں گی میری ٹرین کا ٹائم ہونے والا ہے۔'' زیمل نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

رخسانہ خالہ سے ملنے کے بعد زیمل ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئی۔ ٹرین کی جانب بڑھتے ہوئے اس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ سوحان پینٹ، شرٹ میں ملبوس فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سوار ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر زیمل کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''سوحان تم؟'' سوحان فوراً اس کی طرف چلا آیا۔

''سوحان تمہیں ان کپڑوں میں دیکھ کر یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم ہو۔''

''یہ میں ہی ہوں تمہارا شوہر، تم تو پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوگئی ہو یہاں کیسے؟''

''میں ابا سے ملنے آئی تھی۔ ان کا انتقال ہوگیا ہے۔ تدفین کے بعد مجھے کراچی اپنی جاب کے لیے جانا تھا، جاتے جاتے میں نے سوچا رخسانہ خالہ سے مل لوں۔ وہ اپنے بیٹوں کے پاس مستقل طور پر شفٹ ہو رہی ہیں۔ تم کیا کر رہے ہو؟''

''میں بھی جاب کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ میں نے ایم بی اے کرلیا ہے اور بہت اچھی کمپنی میں ملازمت کر رہا ہوں۔''

''ہاں، وہ تو دیکھنے سے لگ رہا ہے تم خاصے خوش حال نظر آ رہے ہو۔''

''اب تو تمہیں میرے شوہر ہونے پر اعتراض نہیں ہو گا۔ میں نے تم سے جو کہا تھا وہ سچ کر دکھایا، تم ہی بے وقوف تھیں۔ میری بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھیں۔''

''وقت نے مجھے احساس دلا دیا ہے کہ میں نے تمہاری محبت کو ٹھکرا کر غلطی کی ہے۔'' زیمل دھیمے لہجے میں بولی۔

''اس غلطی کا ازالہ ہوسکتا ہے تم میرا ہاتھ ایک بار پھر تھام لو۔'' یہ کہتے ہوئے سوحان نے اپنا ہاتھ زیمل کی طرف بڑھایا۔ زیمل نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''زیمل تمہیں آج کی تاریخ اچھی طرح یاد ہوگی آج سے پانچ سال پہلے تم میری بیوی بن کر میری زندگی میں شامل ہوئی تھیں۔ آج ہماری ویڈنگ اینورسری ہے۔ قدرت کی مہربانی سے کئی سالوں بعد آج ہی کے دن تم میری زندگی میں دوبارہ شامل ہو رہی ہو۔ بہتر ہوگا آج کا دن سفر میں گزارنے کے بجائے ہم گھومتے پھرتے ہوئے گزاریں۔''

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔'' زیمل نے اس کے خیال کی تائید کی دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ٹیکسی میں سوار ہونے کے لیے بڑھ گئے۔

☆☆☆

محبت ایک معجزہ

ممتاز احمد

جینے کی امنگ ہی زندگی کی علامت ہے
اور محبت زندگی کا بہت قیمتی سرمایہ ہے کیونکہ
سچی اور پاکیزہ محبت مقدر اور قسمت والوں کو نصیب ہوتی ہے

ایک لڑکے کا فسانہ جس کو اپنی محبت پر یقین تھا

کبھی تو روئے گا وہ بھی کسی کی بانہوں میں
کبھی تو اس کی ہنسی کو زوال ہونا ہے

جیسے ہی کھانا کھلنے کی آواز آئی حسب دستور سب مرد و زن کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے لاتعلق اپنی اپنی پلیٹوں میں قورمہ، روسٹ، بریانی، سلاد وغیرہ بھرنے میں مصروف تھا۔ خدا خدا کر کے مہمانوں کے شکم بھرے تو رفتہ رفتہ شادی ہال خالی ہونے لگا۔

اگلے پندرہ سے بیس منٹ میں مہمانوں کی اکثریت جا چکی تھی۔ اب صرف دولہا اور دلہن والوں کی

طرف سے چیدہ چیدہ لوگ موجود تھے۔ رنگ برنگے قیمتی ملبوسات میں ملبوس خواتین اور لڑکیوں کے جھرمٹ میں دولہا دلہن کو سٹیج پر بٹھا دیا گیا تھا۔ جہاں اب دودھ پلائی اور دیگر رسمیں ادا ہونی تھیں۔ میں کافی پیچھے ایک کرسی پر تنہا بیٹھا دولہا دلہن کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی جوڑی بہت جچ رہی تھی۔ وہ بہت خوش اور شاد ماں نظر آرہے تھے۔ میں دل ہی دل میں ان کی آنے والی ازدواجی زندگی میں خیر و برکت، ہمیشہ سلامتی اور خوش و خرم رہنے کی دعا کررہا تھا۔

دفعتاً میری آنکھوں کے آگے ایک نرم و نازک حنائی ہاتھ لہرایا اور ساتھ ہی ایک نسوانی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔

''اے مسٹر کیوں دلہن کو نظر لگانی ہے.....؟'' میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک شعلہ جوالا کومل سی شوخ و چنچل انتہائی حسین وجمیل لڑکی کھڑی تھی۔ میں اس کے حسن کے سحر میں کھو گیا۔

میں غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا جس کے رس بھرے لبوں پر مسکان رقصاں تھی۔ میں اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے میری آنکھوں کے آگے ہاتھ کر کے چٹکی بجائی میں ایک دم سٹپٹا گیا اور بے ساختہ میرے منہ سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔

''محترمہ دلہن میری بہن ہے اور کیا کوئی اپنی بہن کو نظر لگا سکتا ہے.....؟''

''واٹ ڈو یو مین.....؟''

نمرہ (دلہن کا نام) آپ کی بہن کیسے لگتی ہے اس کا تو ایک ہی بھائی ہے۔ وسیم یہ آپ اس کے دوسرے بھائی کہاں سے امپورٹ ہو گئے.....؟

جی وہ ایسے کہ وسیم میرا بچپن کا بہت گہرا اور پیارا دوست ہے تو اس ناطے سے نمرہ میری بھی بہن ہوئی ناں..... میری بات سن کر اس حسینہ قتالہ نے ایک لمبی سانس خارج کی اور اوہ اچھا کے الفاظ اس کے ہونٹوں سے ادا ہوئے۔

گفتگو کے دوران میری نظریں مسلسل اس کے سراپے کا جائزہ لینے میں مصروف رہیں تو وہ بولی لگتا ہے مجھے تو اب آپ نظر لگا کر ہی چھوڑیں گے؟

جی نہیں آپ کو میری نظر نہیں لگے گی کیونکہ میں تو دل میں سوبنے رب کی حمد و ثناء کر رہا ہوں جس نے یہ حسین شاہکار تخلیق کیا ہے۔ بقول شاعر

ہو گا عجب فنکار وہ رند
بت جس نے یہ تراشا ہو گا

اوہو اچھا تو آپ شاعری بھی فرماتے ہیں.....؟

جی نہیں میں شاعر نہیں ہوں مگر آپ کو دیکھ کر یہ شعر یاد آ گیا۔ بڑی تیز ہے آپ کی یادداشت..... جواب میں میں نے جی ہاں کہا۔

اس سے بیشتر وہ کوئی اور جملہ داغتی میں نے سوال کر دیا۔ بائی دا وے محترمہ آپ دولہا والوں کی طرف سے مہمان ہیں یا دلہن کی طرف سے.....؟

جی میں بھی آپ کی طرح دلہن والوں کی طرف سے مدعو ہوں اور دلہن کی بہت کلوز سہیلی ہوں.....

اچھا جی دلہن کی کلوز سہیلی صاحبہ آپ کا کوئی نام بھی ہو گا.....؟

وہ جھٹ سے بولی بندی کو عدیلہ کہتے ہیں اور آپ.....؟ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا جھکتے ہوئے کہا۔ بندے کو منیب کہتے ہیں۔ جس پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

عدیلہ صاحبہ میں نے کوئی لطیفہ تو نہیں سنایا صرف اپنا نام بتایا ہے تو وہ بولی آپ کا نام بہت پیارا ہے۔ مگر آپ کے نام بتانے کے انداز سے ہنسی آئی۔

میں نے کہا کیا صرف میرا نام ہی پیارا ہے یا.....؟ تو وہ ایک شوخ ادا سے بولی جی بس نام ہی.....

ہمارے درمیان چند منٹ اس طرح کی ہلکی پھلکی

Pakistanipoint
Waqar Azeem

باتیں ہوتی رہیں تو میں نے کہا یہ بہتر ہوگا آپ بھی اس کرسی پر تشریف رکھیں یہ کہہ کر میں نے ایک کرسی کھینچ کر اس کے آگے کی تو وہ بولی جی نہیں میں اب چلتی ہوں۔ ذرا دولہا دلہن کی خبر لوں۔

جب وہ جانے لگی تو میں نے کہا پلیز سنیے تو وہ پلٹ کر بولی جی فرمائیں.....؟ میں نے تھوڑا جھجکتے ہوئے کہا آپ اپنا موبائل نمبر دیں گی؟

اس نے ماتھے پر تیوری چڑھا کر پوچھا وہ کس لیے.....؟

میں نے کہا کال پر بتاؤں گا..... چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے اپنا موبائل نمبر بتایا تو میں نے فوراً اس کے نمبر پر مس بیل دی تو وہ کہنے لگی۔ اوکے جی آپ کی بیل آ گئی ہے۔ اب آپ کال نہ کیجئے گا۔ میں خود آپ سے رابطہ کروں گی یہ کہہ کر وہ وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئی۔ میں اس کی بل کھاتی پتلی کمر کو دیکھتا رہا۔

☆☆☆

میرے والدین کی چار اولادیں ہیں۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ سب سے بڑا بھائی ہے جو شادی شدہ ہے اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کینیڈا میں سیٹل ہے۔ اس سے چھوٹی دو بہنیں ہیں۔ ایک بہن کی شادی ہو چکی ہے وہ اپنے میاں کے ساتھ گوجرانوالہ میں رہتی ہے۔ میں اور میری ایک بہن غیر شادی شدہ ہیں۔ میرے والد صاحب کی شہر کی بڑی مارکیٹ میں اسپیئر پارٹس کی دوکان ہے۔ میں نے ایم بی اے کیا ہوا ہے اور کئی اداروں میں اپلائی کیا مگر کہیں جاب نہیں ملی۔

میری بے کاری کو دیکھتے ہوئے والد صاحب نے مجھے اپنے ساتھ دکان پر بٹھا لیا۔ دکان خوب چلتی تھی بہت منافع بخش کاروبار تھا۔

جہت خوشحالی تھی کسی قسم کی کوئی مالی پریشانی نہ تھی۔ اپنا کام تھا تو دیر سویر کی کوئی فکر نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بہت جلد میرا کاروبار میں دل لگ گیا۔ میں نے جاب کا خیال دل سے نکال دیا۔ دوسرا یہ کہ بقول والد صاحب کے یہ سب کچھ اب میرا ہی تھا اور میں نے ہی کاروبار کو چلانا تھا۔

ایک پوش علاقے میں والد صاحب نے عالیشان گھر تعمیر کروایا تھا۔ جس میں ہماری رہائش تھی۔ اللہ کا شکر ہے ہر طرح سے سکھ، چین، بے فکری اور خوشحالی تھی۔ میرا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ کلاس اول سے لے کر ایم بی اے تک کسی مضمون اور کسی امتحان میں فیل نہیں ہوا۔ نصابی سرگرمیوں کے علاوہ دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں ناول، کتب اور رسائل کا مطالعہ سرفہرست تھا۔

محبت کے بارے میں ایک جگہ میں نے پڑھا تھا کہ محبت ایک معجزہ ہے اور معجزہ ہر دل پر نہیں اترتا۔ اسی طرح ایک اور جگہ پڑھا تھا کہ محبت زندگی کا بہت بڑا اور قیمتی سرمایہ ہے سچی اور پاکیزہ محبت مقدر اور قسمت والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ میں محبت کے خوبصورت اور معطر جذبے سے بخوبی واقف تھا مگر ابھی تک نہ تو یہ معجزہ میرے دل پر اترا تھا اور نہ ہی یہ قیمتی سرمایہ ابھی تک میرے نصیب میں آیا تھا۔

ہاں انسانیت سے پیار اور احترام کرنا، رشتوں کے حقوق کی ادائیگی اور انسانی قدروں کی پاسداری اور احساس کرنا میری فطرت میں شامل تھا تو یہی وجہ تھی کہ خاندان، برادری، عزیز و اقارب، یار دوست ہر شخص مجھ سے خوش تھا۔ کبھی کسی کو میری ذات سے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہوا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود ابھی تک محبت کے لمس سے محروم اور نا آشنا تھا۔

وسیم سے میری دوستی بہت پرانی تھی۔ وسیم ایک انتہائی شریف النفس اور بھلا مانس لڑکا ہے۔ ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس کی ایک ہی بہن نمرہ ہے۔ جس کی آج شادی تھی۔ شادی

کے تمام معاملات اور کاموں میں وسیم کے ساتھ میں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اللہ کے فضل و کرم سے شام چھ بجے نمرہ کی رخصتی ہوئی تو اس کے ساتھ ہی سب مہمان رخصت ہو گئے۔ اس دوران دو یا تین بار عدیلہ مجھے نظر آئی۔ ہماری نگاہیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں مگر کوئی بات نہ ہو سکی تھی۔

عدیلہ بھی اپنے گھر جا چکی تھی۔ سارا شادی ہال خالی ہو چکا تھا۔ میں سات بجے تک وسیم کے ساتھ شادی ہال میں رہا تمام حساب کتاب اور واجبات ادا کر کے ہماری واپسی ہوئی۔ جس وقت میں گھر پہنچا اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

شادی کے ہنگاموں اور سارے دن کی بھاگ دوڑ کے نتیجے میں تھکان سے بے حال تھا۔ میرا پروگرام تھا کہ نہا دھو کر فوراً سو جاؤں گا۔ میرا سونے کا یہ پروگرام صرف پروگرام کی حد تک رہا جیسے ہی اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹا عدیلہ کا مکھڑا میری آنکھوں کے سامنے آ گیا.....

میں بیڈ پر لیٹا عدیلہ کے خیالوں میں گم رہا مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ محبت کا معجزہ میرے دل پر اتر آیا ہے۔ اس معجزے نے مجھے بے قرار کر کے رکھ دیا تھا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ خاندان، برادری، محلے میں بے شمار لڑکیاں تھیں اور یونیورسٹی میں بھی لڑکیوں کی کثیر تعداد میری کلاس فیلوز تھیں۔ ان سے تعلیمی اور دیگر بہت سارے موضوعات پر ڈھیروں باتیں ہوتی مگر کبھی بھی محبت کے جذبے نے میرے دل میں سر نہیں اٹھایا۔

عدیلہ کون تھی کہاں رہتی تھی؟ مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ مگر جیسے ہی میری پہلی نظر اس پر پڑی محبت کا بند دروازہ اگلے لمحے کھل گیا۔ یوں لگتا تھا کہ عدیلہ نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں کے آگے نہیں لہرایا بلکہ دل کے دروازے پر دستک دی تھی اور میں شاید اسی دستک کا منتظر تھا۔

میں موبائل ہاتھ میں پکڑے بڑی بے قراری سے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ بار بار موبائل کی طرف دیکھتا بڑی شدت سے عدیلہ کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔ کبھی خیال آتا کہ پتہ نہیں وہ کال کرتی بھی ہے کہ نہیں مگر ساتھ ہی دل گواہی دیتا کہ وہ ضرور رابطہ کرے گی اور یہ معتبر گواہی مجھے مطمئن کر دیتی۔

میں بڑی بے چینی سے کبھی کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتا اور کبھی صوفے پر بیٹھ جاتا، کبھی بستر پر لیٹ جاتا۔ ایک پل بھی چین نہیں مل رہا تھا۔ بالآخر کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے اور رات کے ساڑھے بارہ بجے عدیلہ نے کال می (Call me) کا میسج بھیجا۔

اگلے ہی لمحے میں نے کال ملا دی۔ پہلی بیل پر عدیلہ نے کال پک کر لی۔ سلام دعا کے فوراً بعد عدیلہ نے سوال کیا ہاں منیب صاحب! اب بتائیں آپ نے میرا موبائل نمبر کیوں لیا تھا.....؟

عدیلہ! آپ سے ڈھیر ساری باتیں کرنے کے لیے آپ کا نمبر لیا۔ اینڈ بنڈل آف تھینکس آپ نے اپنا نمبر دیا۔ میرا یہ جواب سن کر عدیلہ جھٹ سے بولی۔ اب تک کتنی لڑکیوں کے نمبر لے چکے ہیں۔ جن کے ساتھ آپ کی خوب باتیں ہوتی ہیں؟

میں نے کہا عدلیہ آپ پہلی واحد لڑکی ہو جس سے نمبر لیا ہے۔ آپ میرا موبائل چیک کر سکتی ہیں۔ بخدا آپ کے سوا کسی کا نمبر نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ ہر کسی سے بات کرنے کو دل بھی نہیں کرتا اور نہ ہی میرے پاس اتنا وقت ہوتا ہے۔ اس پر عدیلہ نے کہا کہ پھر میرے ساتھ ہی کیوں ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتے ہیں؟

بس عدیلہ میں آپ کو اپنی کیفیت کیسے بتاؤں جیسے ہی آپ کو دیکھا تو بقول شاعر

کام عنبر کر گئی بس ایک نظر

اک نظر سے ہم تو گھائل ہو گئے

ارے یہ عنبر کون ہے؟ عدیلہ نے مجھ سے پوچھا تو میں نے بتایا کہ یہ شیریں عنبر ہیں بہت اچھی اور معروف شاعرہ ہیں یہ انہی کا شعر ہے۔

اوہ اچھا تو آپ کو شعر و شاعری سے خاص لگاؤ ہے؟

جی عدیلہ آپ نے ٹھیک کہا مجھے اچھی شاعری اور ادب پڑھنے کا بہت شوق ہے اور میرے پاس کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ جیسے ہی میری بات مکمل ہوئی عدیلہ کہنے لگی۔

ویری نائس آپ تو بڑے باذوق انسان ہیں۔ اسی لیے آپ کو اشعار زبانی یاد ہیں۔

ہمارے درمیان اسی طرح ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تفصیلاً ایک دوسرے کا تعارف ہوا۔ پہلے دن ہماری تقریباً آدھ گھنٹہ بات ہوئی۔ کال کے آخر میں ہماری دوستی کی ابتداء شروع ہوگئی۔ اب ہمارا روزانہ کا معمول بن گیا۔ رات کو ہماری گھنٹوں کال پر باتیں ہوتیں۔

اگلے پندرہ سے بیس دنوں میں ہماری بے تکلفی بڑھی تو ہم گفتگو میں ایک دوسرے کو آپ کہنے سے تم پر آ گئے۔ میرے دل میں عدیلہ کی محبت کا چراغ تو اسی وقت جل گیا تھا جب پہلی بار اسے شادی ہال میں دیکھا تھا۔ جب میں نے عدیلہ سے اپنی محبت کا اظہار کیا تو اس نے بھی میری محبت کا اقرار کر لیا۔

عدیلہ کا اقرارِ محبت میرے من کی بنجر زمین پر بارش بن کر برسا تو میرے دل کے آنگن میں بہار آ گئی۔ چہار سو پھول کھل اٹھے۔ محبت کے پھول کھلنے سے میرا من مہک اٹھا۔ دنیا مجھے خوبصورت اور حسین لگنے لگی۔ ہماری محبت شب و روز پروان چڑھنے لگی۔

وسیم اور اس کی بہن نمرہ بھی ہماری اس محبت سے واقف ہو چکے تھے۔ اس دوران ہماری ملاقاتیں بھی ہوئیں یہ ملاقاتیں زیادہ تر نمرہ کے گھر میں ہوتیں۔ ایک دو بار ہم ریسٹورنٹ میں بھی ملے جہاں ہم نے لنچ کیا۔ ہم ایک دوسرے کی محبت پا کر خوشی سے سرشار تھے۔

میری بہن ارم ماسٹرز کر چکی تھی تو اس کے رشتے کی تلاش زور و شور سے جاری تھی میرے والدین کا پروگرام تھا کہ ہم دونوں بہن بھائی کی اکٹھی شادی کریں گے۔ اللہ نے کرم فرمایا اور بہت جلد ارم کا بہت اچھا اور موزوں رشتہ مل گیا۔ اب گھر والوں کی توجہ میری طرف ہوئی تو وسیم اور نمرہ کی معرفت میرے والدین میرا رشتہ مانگنے عدیلہ کے گھر گئے۔

جب دونوں گھرانوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا شروع ہوا۔ میری اور عدیلہ کی محبت آشکار ہو چکی تھی تو بخیر و خوبی اور خوش اسلوبی سے میرا اور عدیلہ کا رشتہ طے ہو گیا اور نہ صرف رشتہ طے ہو گیا بلکہ ٹھیک ایک ہفتے کے بعد خوب دھوم دھام سے منگنی کی رسم بھی ادا ہو گئی۔

طوطا چشمی

ایک دن طوطا مینا سے بولا۔ ''مجھے چھوڑ کر کبھی تم اڑ تو نہیں جاؤ گی؟''

مینا: ''اڑ جاؤں تو پکڑ لینا۔''

طوطا: ''میں تمہیں نہیں پکڑ سکتا۔''

مینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنے پنکھ توڑ دیئے اور بولی۔ ''اب تو ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔''

ایک دن بہت زور کا طوفان آیا۔ مینا بولی۔ ''تم اڑ جاؤ، میں تو اڑ نہیں سکتی۔''

طوطا: ''اپنا خیال رکھنا'' کہہ کر اڑ گیا۔

جب طوفان تھما اور وہ واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ مینا مر چکی تھی اور ایک ڈالی پر لکھا تھا۔

''کاش وہ ایک بار تو کہتا کہ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا تو شاید میں طوفان آنے سے پہلے نہیں مرتی۔''

(احمد سعید، کراچی)

میں اور عدیلہ خوشی سے نہال تھے۔

عدیلہ کے والد کا پانچ سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ وہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اس نے گریجویشن کے بعد تعلیم کو خیر آباد کہہ دیا تھا۔ عدیلہ کے دو بھائی یورپ کے کسی ملک میں مستقل طور پر سیٹل تھے۔

اس کا تیسرا بھائی ذوالفقار یہیں پاکستان میں ہی تھا وہ پراپرٹی کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا اس کے علاوہ وہ تین چار بندوں کو اپنے بھائیوں کے توسط سے باہر کے ملک بھجوا چکا تھا۔ والد کی وفات کے بعد اب گھر کا سربراہ وہی تھا۔

میں رات آٹھ بجے دکان بند کر کے گھر آتا کھانا کھا کر نماز عشاء ادا کر کے اپنے کمرے میں چلا جاتا اور فوراً کال ملاتا۔ عدیلہ بھی میری کال کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہوتی۔ پھر ہم دونوں دنیا سے بے نیاز ڈھیروں باتیں کرتے۔ مستقبل کے سہانے سپنوں میں کھو جاتے۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا اور اکثر رات کے بارہ ایک بج جاتے۔ ہماری یہ روٹین چلتی رہی۔

ارم کے سسرال والے شادی کی تاریخ مانگ رہے تھے تو میرے والدین نے میرے بڑے بھائی اور بھابی سے جو کہ کینیڈا میں سیٹل ہیں ان سے رابطہ کیا۔ کیونکہ ان کے بغیر تو شادیاں نہیں ہو سکتی تھیں۔

ان کی وہاں اپنی مصروفیات اور شیڈول تھا لہٰذا انہوں نے چار ماہ بعد آنے کا عندیہ دیا۔ اسی طرح سے عدیلہ کے دونوں بھائیوں کو بھی چار ماہ بعد آنے کا اس کی امی نے بول دیا کیونکہ میری اور ارم کی شادیاں ایک ساتھ ہوئی تھیں۔ اب تینوں گھروں میں ابھی سے شادیوں کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

جب میرے بڑے بھائی اور بھابی کے پاکستان آنے کی تاریخ کنفرم ہو گئی وہ یکم فروری کو پاکستان آ رہے تھے تو بھائی بھابی کے صلاح مشورے اور تینوں گھروں کی باہمی مشاورت سے شادیوں کی تاریخیں مقرر کر دی گئیں۔ جو اس طرح سے تھیں۔ پہلے میری بارات کا دن مقرر ہوا اور پھر ولیمہ اور اسی دن ارم کی بارات آئی تھی۔ اس کے بعد ارم کا ولیمہ ہونا تھا تو اب زور و شور سے تینوں اطراف سے تیاریاں زور پکڑ گئیں۔

مجھے ایک ضروری فنکشن میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں اصغر نامی ایک لڑکے سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں اسے معلوم ہوا کہ ذوالفقار کی بہن عدیلہ سے میری شادی ہونے والی ہے۔ معاملہ کچھ یوں تھا اصغر یورپ جانا چاہتا تھا تو اس سلسلہ میں اس کی ذوالفقار سے بات چیت چل رہی تھی۔

ذوالفقار نے اسے یورپ بھجوانے کے عوض پندرہ لاکھ روپے ڈیمانڈ کی تھی۔ اصغر نے اس معاملے کی بابت مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ میں نہ تو کوئی ذمہ داری لوں گا اور نہ ہی کچھ کہہ سکتا ہوں۔ کیونکہ میں ذوالفقار کو اتنا نہیں جانتا تو یہ بہتر ہو گا کہ مجھے اس بات میں ملوث نہ کریں اور خود ہی فائنل کریں۔

کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ نہ ہو جائے۔ ہماری بہت نازک رشتہ داری کی شروعات ہیں۔ تو اس طرح بات آئی گئی ہو گئی۔ اس بات کے تیسرے دن ذوالفقار آگ بگولہ بنا ہمارے گھر آیا اور آتے ہی اونچا اونچا بولنا شروع کر دیا اور مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

میں نے پوچھا ذوالفقار بھائی ہوا کیا ہے؟ تو وہ غصے سے کہنے لگا نیب تم نے اصغر کو کیا پٹی پڑھائی ہے؟ کیا میں فراڈیا ہوں، دھوکے باز ہوں؟

میں نے اپنی صفائی دی کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ اول تو میں اصغر کو جانتا ہی نہیں ہوں وہ تو اتفاق اس روز فنکشن میں اس سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ یورپ جانے اور پندرہ لاکھ کی پے منٹ کا ذکر کر رہا تو میں نے اس سے یہی کہا کہ تمہاری اور ذوالفقار کی کاروباری بات کے درمیان نہیں آؤں گا یہ بہتر ہو گا کہ

آپ دونوں خود ہی اپنے معاملات کو ڈیل کریں۔

میری بات سن کر ذوالفقار کہنے لگا تم جھوٹ بول رہے ہو تم نے اصغر کو کہا ہے کہ میں کوئی ذمہ داری نہیں لوں گا کل کلاں کو ذوالفقار تمہارے پیسے کھا جائے تو میں ذمہ دار نہیں ہوں گا وغیرہ وغیرہ۔

میں نے بڑے ضبط و تحمل سے کہا ذوالفقار بھائی میں نے ایسا کچھ نہیں کہا آپ کو اصغر نے غلط بتایا ہے۔ بھلا میں نے ایسا کیوں کہنا تھا کہ آپ اصغر کے پیسے کھا جائیں گے۔ بھائی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میری کسی بات کا اثر ذوالفقار پر نہیں ہو رہا تھا وہ مسلسل اونچی آواز میں بولتا رہا اور میری بے عزتی کرتا رہا۔ اسی دوران میرے والد صاحب اور والدہ بھی آ گئیں۔

میں نے ذوالفقار سے کہا آپ آرام سے بات کریں یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ جو آپ اس طرح سے بات کر رہے ہیں ہم شریف اور عزت دار لوگ ہیں۔ آپ کی آواز گھر سے باہر جا رہی ہے۔ ہمارے اڑوس پڑوس والے کیا سوچیں گے کہ ہمارے گھر میں اتنا ہنگامہ برپا ہے۔

میری بات سن کر وہ اور طیش میں آ گیا اور کہنے لگا اچھا تو آپ عزت دار اور شریف لوگ ہیں کیا ہم لوگ کنجر اور چورا چکے ہیں؟

میرے والد صاحب نے اسے سمجھانا چاہا دیکھو بیٹا تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اتنا جوش نہ دکھاؤ کیوں اتنا سیخ پا ہو رہے ہو جو بات منیب نے نہیں کہی تم کیوں اس سے منسوب کر رہے ہو؟

مگر وہ ہماری کسی بات پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ وہ بار بار کہنے لگا کہ منیب کی وجہ سے اس کا پندرہ لاکھ روپے کا نقصان ہوا ہے۔ شکر ہے ابھی عدیلہ سے اس کی شادی نہیں ہوئی اس کی ذہنیت اور اوقات کا ابھی سے پتہ چل گیا ہے۔ پھر اس نے غصے میں ایک دو گالیاں بھی دیں تو میں نے اسے خاموش ہونے کو کہا۔

ذوالفقار بس بہت ہو گئی۔ اب ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالنا تو اس پر وہ اکڑ کر میرے سامنے آ گیا اور کہنے لگا کیا کر لو گے تم میرا؟

جب میرے والد صاحب نے اسے روکنا چاہا تو اس نے ان کی بھی بے عزتی کر دی۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا تو میں نے ذوالفقار سے کہا کہ ابھی اور اسی وقت ہمارے گھر سے نکل جاؤ تو وہ گالیاں بکتا ہمارے گھر سے چلا گیا۔

ہمارے گھر کی فضا مکدر ہو گئی۔ ذوالفقار ہمارے ساتھ بہت زیادتی کر کے گیا تھا۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے اوپر کنٹرول کیا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا میرا ارادہ تھا کہ تھوڑی دیر بعد عدیلہ کو کال کر کے ساری صورتحال بتاؤں گا اور اسے کہوں گا کہ ذوالفقار کو سمجھائے اور ہماری اور بالخصوص میری طرف سے اپنا دل صاف کرے۔ مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی اور ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد ذوالفقار اپنی والدہ کے ساتھ دوبارہ ہمارے گھر آ گیا اور میرا اور عدیلہ کا رشتہ توڑنے کا اعلان کر دیا۔ ساتھ ہی ہماری دی ہوئی چیزیں کپڑے وغیرہ ہمارے منہ پر ماریں اور کہا کہ کل تک ہماری دی ہوئی چیزیں بھی ہمارے گھر پہنچا دیں۔

عدیلہ کی والدہ بھی غصے میں تھیں پتہ نہیں ذوالفقار نے انہیں کیا بتایا تھا۔ وہ بھی ہمارے خلاف بولتی رہیں اور دونوں ماں بیٹا واپس چلے گئے۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا عدیلہ کا موبائل مسلسل پاور آف جا رہا تھا۔ ہم سب گھر والے سخت پریشانی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔ بار بار عدیلہ کا نمبر ملاتا مگر ہر بار نمبر پاور آف ملتا۔ میری شادی کے دن رکھے جا چکے تھے۔ پوری برادری، خاندان اور سب رشتے داروں کو شادی کی تاریخ کا علم تھا۔ اس طرح اچانک رشتہ ٹوٹ جانا اور لڑکی والوں کی طرف سے ہمیں جواب دینا یہ ہمارے لیے بہت دکھ،

صدمے اور بے عزتی کی بات تھی۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ دو تین دن خاموشی اختیار کرتے ہیں جب ذوالفقار اور اس کی امی کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو ان کے گھر جا کر آرام سے بات کریں گے۔ ان کو سمجھائیں گے۔ ذوالفقار کی غلط فہمی دور کریں گے۔

چنانچہ تیسرے دن ہم عدیلہ کے گھر گئے مگر ذوالفقار اور اس کی امی نے ہماری کوئی بات نہ سنی انہوں نے بہت سخت لہجے میں بات کی ان کا بس ایک ہی مطالبہ تھا کہ منگنی پر دی گئیں چیزیں واپس کریں۔ اب یہ شادی نہیں ہوگی۔

ان تین دنوں میں میری ایک بار بھی عدیلہ سے بات نہ ہو سکی تھی کیونکہ اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ ہم نے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ رشتہ ختم نہ کریں۔ عدیلہ اور منیب ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ایک تیسرے بندے کی غلط بیانی اور جھوٹ بولنے کی وجہ سے دونوں بچوں کی زندگیاں برباد نہ کریں مگر ہماری کسی بات کا ان پر اثر نہ ہوا۔

ذوالفقار کی ایک ہی رٹ تھی کہ منیب بہت گھٹیا انسان ہے۔ لہٰذا ایک گھٹیا انسان کے ساتھ عدیلہ کی شادی نہیں ہو سکتی۔ ہمیں عدیلہ سے بھی ملنے نہیں دیا گیا۔ بالآخر ہمیں مجبوراً ناکام لوٹنا پڑا اور میرے والدین نے سب چیزیں واپس بھجوا دیں۔ میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خوبصورت ہینڈسم برسر روزگار نوجوان تھا۔ ہم کھاتے پیتے خوشحال خاندانی لوگ تھے۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ کئی رشتے موجود تھے مگر عدیلہ میری محبت، میرا پیار، میرا عشق تھا۔ میں نے عدیلہ کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ میں اپنی زندگی میں عدیلہ کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے یہ ساری صورتحال وسیم کو بتائی اور اس سے التجا کی کہ نمرہ کے ذریعے کسی طرح میری ایک ملاقات عدیلہ سے کروا دو۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد نمرہ کسی نہ کسی طرح سے تھوڑی دیر کے لیے عدیلہ کو اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو گئی۔ میں وسیم کے گھر ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ عدیلہ جیسے ہی روم میں آئی میں فوراً اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

عدیلہ دوڑ کر آئی اور میرے گلے لگ گئی۔ ہمارے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ ہم دونوں زاروقطار رو رہے تھے۔ ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری تھی۔ ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو تسلیاں دلاسے دیتے رہے۔ عدیلہ کی تو بہت بری حالت تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے اس کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں اور ان کے گرد گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ بار بار مجھ سے کہہ رہی تھی منیب میں تمہارے بغیر نہیں رہ پاؤں گی مر جاؤں گی۔

عدیلہ کیا میں تمہارے بغیر جی پاؤں گا نہ میری جان میں تو تم سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہم اس طرح کی جذباتی باتیں کرتے رہے۔ جب کچھ نارمل ہوئے تو عدیلہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ذوالفقار نے اس سے موبائل چھین لیا ہے گھر میں قید ہو کر رہ گئی ہوں۔ اس روز آپ لوگ گھر آئے تو میرے کمرے کے دروازے کو باہر سے لاک کر دیا گیا تھا۔ میں پنجرے میں بند پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی رہی۔ عدیلہ نے بتایا کہ ذوالفقار بہت لالچی اور بے حس انسان ہے۔ وہ صرف پیسے کو اہمیت دیتا ہے۔ اصغر کے علاوہ پانچ چھ اور بندوں سے بھی یورپ بھجوانے کی بابت ذوالفقار کی بات چل رہی تھی۔ اس نے مجموعی طور پر ان سات بندوں سے ایک کروڑ روپیہ وصول کرنا تھا۔ مگر تم سے اصغر کی ملاقات کے بعد انہوں نے پے منٹ روک لی۔ اصغر نے الٹی سیدھی جھوٹی باتیں ذوالفقار کو بتائیں تو وہ تم سے بدظن ہو گیا ہے۔

میں نے شروع سے آخر تک عدیلہ کو ایک ایک

بات سچ بتائی کہ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ عدیلہ کہنے لگی نیب میں تمہاری بات سمجھتی ہوں مگر ذوالفقار نہیں سمجھ رہا۔ پتہ نہیں وہ کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ ابو کی وفات کے بعد اسی نے سارا گھر سنبھالا ہے۔ وہی گھر چلا رہا ہے اور اسی ناطے سے وہ گھر کا سربراہ بھی ہے۔ امی اس کی ہر بات مانتی ہیں تو وہ اپنی باتیں منواتا ہے۔ عدیلہ بار بار رو رہی تھی۔ اسے حوصلہ تسلی دی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے آئی تھی جلدی اپنے گھر واپس چلی گئی۔

ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر بہت پریشان تھے۔ میں ہر نماز کے بعد رو رو کر رب کے حضور دعائیں مانگتا۔ مگر ایک پل بھی چین نہ ملتا۔ ہر دم عدیلہ کی یاد ستاتی میرا سب سکھ چین لٹ گیا تھا۔

میں ایک بار پھر خود چل کر ذوالفقار کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ اصغر کو میرے سامنے لاؤ تاکہ آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں ہوں اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو۔ میں ہر قسم اٹھانے کو تیار ہوں۔ میں نے تمہیں ہرگز دھوکے باز، فراڈیا نہیں کہا۔ صرف اتنا کہا تھا کہ ہماری نازک رشتہ داری کی شروعات ہیں۔ آپ اپنے معاملات خود ڈیل کریں۔ مجھے درمیان میں ملوث نہ کریں۔

میں نے مزید اس سے کہا ذوالفقار بھائی میں بے قصور ہونے کے باوجود ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں۔ خدارا یہ رشتہ جوڑ دو مگر ذوالفقار نے میری ہر بات سنی ان سنی کر دی اور کہنے لگا۔ تمہارے معافی مانگنے سے میرا جو ایک کروڑ روپے کا نقصان ہوا ہے وہ تو پورا نہیں ہو گا۔ تمہاری باتوں کی وجہ سے میری ساکھ خراب ہو گئی ہے۔ بس یہ رشتہ ختم کر دیا ہے تو ختم کیونکہ ہم تھوک کر چاٹنا نہیں چاہتے۔

قصہ مختصر میری کوئی آہ و فریاد نے اثر نہیں کیا۔ سب کوششیں بے کار گئیں۔ میں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر آ کر خوب رویا۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں سگریٹ پینے شروع کر دیئے۔ کوئی چیز کھانے کو دل نہ کرتا۔ دن بدن کمزور ہونا شروع ہو گیا۔

صحت خراب ہونی شروع ہو گئی۔ میری شادی تو ختم ہو چکی تھی اب طے شدہ شیڈول کے مطابق ارم کی شادی تو ہر حال میں کرنی تھی۔ اس کے کارڈ چھپ چکے تھے۔

کوزے میں دریا

☆ خیالات کی جنگ میں کتابیں ہتھیار کا کام کرتی ہیں۔

☆ کسی کو اپنا کہنے سے پہلے سوچ لو اپنائیت کا یہ عہد نبھا سکو گے۔

☆ علم ایسا خزانہ ہے، جس کی حفاظت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

☆ دولت کی حفاظت تم کرتے ہو جبکہ علم تمہاری حفاظت کرتا ہے۔

☆ علم ایسی دوستی ہے، جو بھٹکے ہوئے انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔

☆ جب دولت کی خواہش چھوڑ دو گے، دولت مند بن جاؤ گے۔

☆ کسی کے گرنے پر خوش نہ ہو، کل پتا نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہو جائے۔

☆ بڑا انسان وہ ہے جس کی محفل میں کوئی خود کو چھوٹا نہ سمجھے۔

☆ اگر تم کسی کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے تو یہ مت سمجھو کہ وہ انسان کتنا بے وقوف ہے بلکہ یہ سوچنا اس کو تم پر کتنا اعتبار ہے۔

☆ آدمی اپنے خیالات سے اپنی زندگی خراب کرتا ہے۔

☆ الفاظ جتنے بھی متاثر کن استعمال کرو، مخاطب پر اس کا اثر تب ہی ہو گا اگر ان میں خلوص اور سچائی ہو گی۔

(مقصود احمد بلوچ، میاں چنوں)

اسی اثناء میں بڑا بھائی، بھابی اور ان کے بچے بھی آ گئے۔ گھر میں رونق آ گئی تو میرا دل کچھ بہل گیا۔ برادری میں بہت سارے رشتے موجود تھے۔ میرے والدین بھائی، بھابی نے بہت زور دیا کہ اگر میں کہوں تو ارم کی شادی کے ساتھ ہی ابھی بھی میری شادی ہو سکتی ہے۔ مگر میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ میں شادی کر کے عدیلہ کو دکھی نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرا یہ کہ عدیلہ کے علاوہ کوئی بھی لڑکی میری زندگی میں نہیں آ سکتی تھی۔

چنانچہ گھر والے خاموش ہو گئے۔ مقررہ تاریخ کو ارم کی شادی ہو گئی اور وہ رخصت ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔ ارم کی شادی کے پندرہ دن بعد بڑا بھائی اور بھابی بھی واپس کینیڈا چلے گئے۔ گھر ایک دم خالی ہو گیا۔ دن بھر دکان میں مصروف رہتا مگر جیسے ہی گھر آتا تو میرا کمرہ مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ مجھے کچھ اچھا نہ لگتا ہر طرف ویرانی اور اداسی کا راج تھا۔

کچھ دن گزرے تو وسیم کی معرفت ایک خبر مجھ پر بجلی بن کر گری مجھے سخت شاک لگا اور میں گم صم ہو کر رہ گیا۔ خبر یہ تھی کہ عدیلہ کی شادی اصغر سے طے ہو گئی ہے اور دس دن بعد اصغر کی بارات آئے گی۔

یہ سن کر میں اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اف میرے اللہ یہ کیا ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دس تاریخ آ گئی۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے پتہ نہیں عدیلہ کے دل پر کیا بیت رہی تھی۔ عدیلہ کو اصغر کے ساتھ شادی کے لیے کیسے راضی کیا گیا تھا۔ پھر وہ ہو گیا جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

روتی بلکتی عدیلہ کو زندہ لاش کی طرح اصغر کے ساتھ رخصت کر دیا گیا تو وہ رات مجھ پر قیامت بن کر گزری۔ کئی بار کوشش کی کہ اپنی زندگی ختم کر لوں مگر کوئی انجانی طاقت مجھے روک دیتی۔ ساری رات جاگتے اور سگریٹ پھونکتے گزر گئی۔ آج میری عدیلہ کسی اور کی ہو گئی تھی۔ میری دنیا لٹ گئی تھی۔ دل اجڑ گیا تھا۔

صبح تک شدید بخار نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا مجھے نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ بخار ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ دن بدن حالت بگڑتی گئی۔ بالآخر مجھے ہسپتال داخل کروا دیا گیا۔ میری حالت دیکھ کر میرے والدین الگ پریشان تھے۔ ہسپتال میں مہنگا علاج شروع ہو گیا۔ مگر میری طبیعت سنبھل نہیں پا رہی تھی۔ مہنگی دوائیاں، ڈرپیں اور انجکشن کوئی اثر نہیں دکھا رہے تھے۔ ڈاکٹر سخت حیران تھے کہ کوئی بھی دوا کیوں اثر نہیں کر رہی جبکہ تمام لیبارٹری ٹیسٹ کلیئر تھے۔

مجھے ہسپتال میں داخل ہوئے پندرہ دن ہو چکے تھے میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔ امی ابو میری حالت دیکھ دیکھ کر روتے۔ دونوں بہنیں اور بہنوئی ہر وقت میرے پاس رہتے اور میری دلجوئی کرتے رہتے۔ پندرہ دن بعد میرے والد صاحب کسی کے مشورے سے ایک نورانی چہرے والے بزرگ کو لے کر آئے انہوں نے مجھے غور سے دیکھا اور کہنے لگے کہ یہ جسمانی بیماری نہیں ہے۔ بچے نے گہرا صدمہ لیا ہے روحانی بیماری ہے۔ اللہ نے چاہا تو بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔

انہوں نے میرے پاس کھڑے ہو کر پورے جسم بالخصوص سر اور سینے پر دم کیا۔ پانی دم کر کے دیا کہ بچے کو پلاتے رہیں۔ ان کے دم کرنے کی دیر تھی مجھے یوں لگا جیسے تپتے ہوئے صحرا سے نکل کر ٹھنڈی ٹھنڈی پھولوں کی سیج پر آ گیا ہوں۔ میرا اضطراب ختم ہو گیا۔ تین چار بار دم کیا ہوا پانی پیا تو قرار آ گیا اور میں پرسکون نیند سو گیا۔

صبح تک بخار ٹوٹ گیا۔ طبیعت کافی سنبھل گئی۔ اگلے روز وہ بزرگ پھر آئے اور دم کیا ہوا پانی پلایا تو شام تک مکمل طور پر بخار اتر گیا اور میں ہسپتال سے گھر آ گیا۔ وہ بزرگ سات دن لگاتار گھر آتے رہے۔ ان کے دم سے طبیعت بہت بہتر ہو گئی گو عدیلہ کو کسی پل نہ بھولتا وہ میرے دل کے نہاں خانے میں موجود تھی۔ مگر

دل میں جو کسک اٹھتی تھی وہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ اپنی سابقہ روٹین لائف کی طرف آہستہ آہستہ لوٹ رہا تھا۔ دکان پر جانا شروع کر دیا۔ اب پنج گانہ نماز کی ادائیگی کے ساتھ فجر کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت میرا معمول بن گیا۔

ایک دن شام کو وسیم ملنے آ گیا اس نے بتایا کہ ذوالفقار نے پتہ نہیں کیا چکر چلایا تھا کہ فوراً ہی اصغر کا رشتہ عدیلہ سے طے ہو گیا تھا۔ عدیلہ بہت روئی تھی اس نے بہت ترلے منتیں کیں کھانا پینا چھوڑ دیا تھا مگر اس کی کسی آہ و بکا کا اثر نہ ہوا تھا۔ نامعلوم کس طرح سے عدیلہ کو اس شادی کے لیے راضی کیا گیا تھا۔ وہ آخر وقت تک روتی بلکتی رہی مگر اسے بھیڑ بکریوں کی طرح اصغر کے ساتھ رخصت کر دیا گیا تھا۔ عدیلہ کے دونوں بھائی جو یورپ سے آئے تھے انہوں نے فوری بندوبست کیا ہے اب وہ عدیلہ اور اصغر کو اپنے ساتھ یورپ لے جا رہے تھے۔ دو دن کے بعد ان کی فلائٹ تھی یہ سن کر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ میں سناٹے میں آ گیا۔

اف میرے اللہ کیا اب عدیلہ اس شہر، اس ملک سے ہی جا رہی ہے۔ یہ شہر جس کی فضاؤں میں عدیلہ کے سانسوں کی خوشبو رچی بسی تھی۔ اب اس خوشبو سے بھی محروم ہو جاؤں گا۔ دو دن پھر پریشانی میں گزرے۔ عدیلہ کی فلائٹ شام چھ بجے تھی۔ میں اور وسیم چار بجے ہی ایئر پورٹ پر پہنچ گئے میں آخری بار عدیلہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اب پتہ نہیں زندگی میں پھر کبھی اپنی عدیلہ کو دیکھ پاؤں گا کہ نہیں۔ بس اس کا دیدار اور ایک جھلک دیکھنے کی خواہش لیے ایئر پورٹ کے ایک ایسے گوشے میں کھڑے ہو گئے جہاں میں عدیلہ کو دیکھ سکتا تھا۔

پندرہ منٹ کے بعد وہ سب لوگ آ گئے میری نظریں تو صرف عدیلہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ جب عدیلہ کو دیکھا تو میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ عدیلہ بہت لاغر، کمزور، تھکی تھکی صدیوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ رنگ روپ کملا گیا تھا۔ یقیناً وہ مجھ سے بھی زیادہ ذہنی، جسمانی اذیت میں مبتلا تھی۔ اس کا یہ روپ دیکھ کر میں اپنے حواس کھو بیٹھا۔ عدیلہ اور دوسرے سب لوگ ایئر پورٹ کے ڈیپارچر لاؤنج میں چلے گئے۔ وسیم بڑی مشکل سے مجھے سہارا دے کر کار تک لایا میں کار کی پچھلی سیٹ پر ڈھے گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

ہم چھ بجے تک ایئر پورٹ پر ہی رہے۔ جب چھ بجے جہاز فضا میں بلند ہوا تو ایسے لگا میری روح بھی جہاز کے ساتھ پرواز کر گئی ہے۔ میں بڑی حسرت سے جہاز کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ آج میرا شہر ویران اور سنسان ہو گیا تھا۔

اگلے کئی دن تڑپتے اور اذیت میں گزرے میں بے خودی کے عالم میں اس گلی کے بار بار چکر لگاتا جس میں عدیلہ رہتی تھی۔ میرا دل چاہتا کہ اس گلی کی زمین کو چومتا رہوں جس پر میری عدیلہ چلتی تھی۔ اب تو میری یہ حالت تھی کہ میں دیوانگی کے عالم میں گلیوں کی خاک چھانتا رہتا۔ اس سے پہلے کہ میری حالت پھر بگڑ جاتی والد صاحب ان بزرگ کو پھر لے کر آ گئے۔ انہوں نے والد صاحب سے کہا بچے کی روح زخمی ہو گئی ہے وہ سارا معاملہ سمجھ چکے تھے کہنے لگے بچے نے جدائی کا صدمہ بہت گہرا لیا ہے اللہ کرم فرمائے گا یہ ٹھیک ہو جائے گا مگر تھوڑا ٹائم لگے گا۔ وہ روزانہ آ کر میرے پاس بیٹھتے ڈھیر ساری باتیں کرتے مجھے دم کرتے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے۔ مجھے ان کی باتوں سے بڑا سکون ملتا۔

رفتہ رفتہ مجھے قرار آنے لگا۔ کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہے اور یہ زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ مگر میری روح پر لگا زخم ٹھیک نہیں ہو رہا تھا مگر بہتری ہو رہی تھی۔ دکان پر آنا جانا بھی رہتا۔ اب میں اکثر ان

بزرگ کے پاس خود چل کر جاتا ان کی صحبت میں مجھے بڑا سکون ملتا۔ اب مزید فائدہ یہ ہوا کہ نماز پنج گانہ، تلاوت کلام پاک کے ساتھ ساتھ نماز تہجد کی ادائیگی بھی میرا معمول بن گیا۔ امی ابو شادی کے لیے بہت زور دینے لگے۔ مگر میں مسلسل انکار اور ٹال مٹول کرتا رہا اور ایک سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا۔

امی اکثر رو پڑتیں کہ اب سائیں سائیں کرتا خالی گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے وہ کہتیں کہ ان کا بہت دل کرتا ہے کہ بہو گھر آئے اور وہ پوتے پوتیاں سے کھیلیں مگر میں شادی کی حامی نہیں بھر رہا تھا۔

والد صاحب صبح سویرے دکان پر چلے جاتے تھے جبکہ میں دس گیارہ بجے جاتا تھا۔ اسی طرح وہ عصر کی نماز ادا کر کے گھر چلے جاتے تو میں شام سات بجے دکان بند کر کے گھر آتا۔

ایک شام گھر آیا تو دیکھا بہت رونق لگی ہوئی تھی۔ میری دونوں بہنیں، بہنوئی بچے وسیم اور نمرہ گھر میں موجود تھے۔ سب کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ رات کے کھانے کے بعد سب لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئے تو مجھے بتایا گیا کہ اب میری کوئی بات نہ سنی جائے گی نہ مانی جائے گی کیونکہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ دو ماہ کے اندر اندر میری شادی کر دی جائے گی۔

میری بڑی بہن جو گوجرانوالہ میں بیاہی ہوئی ہے۔ اس کی نند عائشہ کا رشتہ مانگ لیا گیا ہے اور انہوں نے ہاں کر دی ہے۔ میں نے اس فیصلے سے بغاوت کرنی چاہی مگر میری بغاوت کو سختی سے کچل دیا گیا۔ سب نے فیصلہ سنا دیا تھا بقول سب کے مجھے بھی سہارے کی ضرورت تھی اور امی کو بھی کیونکہ وہ اب بیمار رہنے لگی تھیں۔ ان سے اب تنہائی نہیں کاٹی جاتی تھی۔ چاروناچار سب رشتوں کا پاس رکھتے ہوئے میں نے شادی کے لیے اپنی رضا مندی ظاہر کر دی تو سب کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ادھر میری ہاں کرنے کی دیر تھی ادھر جھٹ سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے بیت گیا اور عائشہ میری دلہن بن کر آ گئی۔ جہاں عدیلہ کو ہونا چاہیے تھا وہاں عائشہ کو دیکھ کر مجھے تکلیف تو بہت ہوئی مگر عائشہ کا تو کوئی قصور نہ تھا۔ عائشہ نے میری جی جان سے خدمت کرنا شروع کر دی مجھے ہر طرح سے سنبھالا، سہارا دیا۔ بہت جلد یہ راز بھی کھل گیا کہ عائشہ کئی سال سے میری محبت میں مبتلا تھی بلکہ مجھ سے عشق کرتی تھی۔ وہ دن رات مجھے پانے کی دعائیں کرتی تھی اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں تھی اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنی محبت پا لے گی اور اس نے پا لی تھی۔ اس کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔

اگر میں اپنی محبت نہیں پا سکا تھا تو یہ میری قسمت تھی بہر حال عائشہ کی محبت جیت گئی تھی۔ عائشہ نے اپنی بے پناہ محبت اور چاہت سے میرا دل تو جیت لیا تھا مگر جو یادیں عدیلہ کی تھی وہ نہ کھرچ سکی۔ عائشہ میرے ساتھ بہت خوش تھی۔ اسی ہنسی خوشی میں دو سال کا عرصہ بیت گیا۔

اسی دوران ہم نے اپنی دکان کو وسیع کر لیا تھا اور اب ہول سیل کا کام پچھلے ڈیڑھ سال سے شروع کر دیا تھا گو کہ اسپیئر پارٹس کی پرچون فروخت بھی جاری تھی۔ مگر ہول سیل کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔ میرے والد صاحب کا اصول تھا کہ منافع جائز حد تک لو تو یہی وجہ تھی کہ ہماری دکان بہت چلتی تھی۔ سارا دن گاہکوں کا رش لگا رہتا تھا۔ ہم زیادہ پارٹس جو سیل کرتے تھے وہ جرمنی کی ایک مشہور و معروف کمپنی کے تیار کردہ بہت معیاری اور دیرپا تھے تو یہی وجہ تھی کہ ان کی ڈیمانڈ بھی زیادہ تھی۔

مذکورہ کمپنی ہر سال اپنے ہول سیل ڈیلروں کو سیل کا ایک ٹارگٹ دیتی تھی مطلوبہ ٹارگٹ Win کرنے پر آئندہ سال کے لیے ہول سیل ڈیلر کو ڈبل منافع دیتے تھے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہم نے ٹارگٹ نہ صرف

دن کیا تھا بلکہ ٹارگٹ سے بڑھ کر ہماری سیل ہوئی تھی تو اس پر کمپنی ٹارگٹ حاصل کرنے والے ڈیلروں کو اپنے خرچ پر پندرہ دن کے لیے کمپنی کے وزٹ کے ساتھ سیر و سیاحت کے لیے بلا رہی تھی۔

چنانچہ میرا نام بھی جرمنی وزٹ کے لیے منتخب ہو گیا۔ پاسپورٹ بنوا لیا گیا۔ ویزہ اور ریٹرن ٹکٹ آ چکا تھا سب تیاریاں مکمل تھیں۔ ارم اور عائشہ دونوں ہی ماں بننے والی تھیں۔ اب ایسا اتفاق ہوا دونوں کی ڈلیوری میں ایک آدھ دن کا فرق تھا۔ انہیں ایک ساتھ ہسپتال لے جایا گیا۔ ارم کی ڈلیوری کا کیس نارمل تھا اس نے بیٹے کو جنم دیا مگر عین وقت پر عائشہ کے کیس میں بہت پیچیدگی پیدا ہو گئی اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تو ڈاکٹر کو آپریشن کرنا پڑا مگر عائشہ کی جان نہ بچ سکی۔ وہ اپنے پیار کی نشانی ایک خوبصورت بیٹی کی صورت میں دے کر اگلے جہاں سدھار گئی۔ یہ مجھ پر دوسرا بڑا صدمہ تھا۔ میں بہت رویا اور خدا سے شکوہ کیا کہ مجھے خوشیاں کیوں راس نہیں ہیں۔ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

مگر خدا کے کاموں کے آگے کس کا بس چلتا ہے۔ میں ایک بار پھر ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ عائشہ کو منوں مٹی کے نیچے دفنا دیا گیا۔ میری بیٹی بینش کو ارم نے فوراً اپنا دودھ پلانا شروع کر دیا۔ میری حالت پھر دگرگوں ہو گئی۔ تسلیاں دلاسے دینے والے سب رشتہ دار، دوست احباب تھے۔ ہر کوئی میری دلجوئی کر رہا تھا جس سے بڑا سہارا مل رہا تھا۔ جرمنی جانے کا ارادہ میں نے ترک کر دیا تھا مگر دوستوں اور کاروباری احباب نے سمجھایا کہ یہ چانس ضائع نہ کرو۔ ایک طرف کاروبار کو مزید وسعت ملے گی۔ دوسرا تمہاری طبیعت بھی بہل جائے گی۔

چنانچہ سب کے سمجھانے پر میں جرمنی پہنچ گیا۔ ہمیں فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا کمپنی کی بہت بڑی فیکٹری تھی جس میں تیار کرنے والے اسپیئر پارٹس کے

مسنگ یو

مالکن نے نوکرانی سے پوچھا۔ ''تم تین دن سے کام پر نہیں آئیں اور بتایا بھی نہیں؟''

''باجی میں نے فیس بک پر اسٹیٹس اپ ڈیٹ کر دیا تھا کہ ''آئی ایم گوئنگ ٹو گاؤں فور تھری ڈیز۔'' صاحب جی نے تو کمنٹ بھی کیا تھا۔ ''مسنگ یور ضیا!''

(مرزا بیگ، خانیوال)

ہر شعبے کا وزٹ کروایا گیا۔ ساتھ ساتھ سیر و تفریح بھی جاری تھی۔ ایک علاقے کی سیاحت کے لئے گئے تو ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ قریبی ایک اسلامی کمیونٹی سنٹر کی مسجد میں نماز ادا کی پھر کمیونٹی سنٹر کو اندر جا کر دیکھنے لگا جب لائبریری میں پہنچا تو بہت ساری مسلم خواتین لائبریری سے باہر جا رہی تھیں تو میں ایک سائیڈ پر رک گیا۔ جب وہ سب چلی گئیں تو میں جیسے ہی اندر داخل ہوا تو ایک دم ٹھٹک گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا میرے سامنے گاؤن اور حجاب میں ملبوس عدیلہ کھڑی تھی۔ ہم دونوں دم بخود ایک دوسرے کو یک ٹک دیکھے جا رہے تھے۔

عدیلہ کے چہرے پر ایک تقدس تھا، نور تھا، طمانیت اور سکون تھا۔ پھر عدیلہ نے مجھے آواز دی آپ منیب ہو ناں.....؟

میں محویت کے عالم سے باہر نکلا اور کہا ہاں عدیلہ میں منیب ہوں پھر غیر ارادی طور پر ہم دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ قریب ہی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم وہاں بیٹھ گئے۔ عدیلہ نے پوچھا کہ جرمنی کب اور کس سلسلہ میں آئے؟ تو اسے تفصل سے اپنی آمد کا بتایا اسی طرح باتوں کا سلسلہ چل پڑا تو میں نے اپنی پوری داستان الم سنا دی۔

عدیلہ نے اپنے اوپر بیتے حالات کچھ اس طرح بتائے کہ اصغر سے شادی کے لیے اس کی والدہ نے اپنا

دوپٹہ عدیلہ کے قدموں میں رکھ کر ہاتھ جوڑے تھے۔ تو وہ ماں اور بھائیوں کی عزت پر قربان ہوگئی پھر بھائیوں اور اپنے شوہر اصغر کے ساتھ یہاں جرمنی آ گئے بعد میں اپنی والدہ اور ذوالفقار کو بھی یہیں بلا لیا گیا۔ اصغر اچھا انسان اور شوہر ثابت نہ ہوا۔ وہ ذہنی طور پر سازشی اور گھناؤنے کردار کا انسان تھا۔

اس نے ذوالفقار کو گمراہ کر کے اپنی لائن سیدھی کی اپنے جرمنی آنے کا سارا خرچہ میرے بھائیوں پر ڈالا اور مفت میں یہاں آ گیا مگر یہاں آ کر بھی اپنی بد فطرتی سے باز نہ آیا اور ہر وقت مجھ پر شک کرتا اور تمہارا نام لے لے کر مجھے طعنے دیتا تھا۔ میں اس کے ساتھ ایک دن بھی خوش نہیں رہی۔ میری زندگی کو انتہائی اذیت ناک بنا دیا تھا۔

پورا ایک سال کرب میں گزرا پھر اس نے دولت کے حصول کے لیے کوئی غیر قانونی لمبا ہاتھ مارا مگر پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس پر مقدمہ بنا اور کیس چلا تو عدالت کی طرف سے اسے بیس سال کی جیل ہوگئی۔ بعد میں میرے گھر والے بہت پچھتائے کہ مجھے ٹھکرا کر اصغر سے عدیلہ کی شادی کر دی تھی۔ تھوڑی سوچ و بچار اور صلاح و مشورہ کے بعد اصغر سے مجھے طلاق دلوا دی گئی۔

میں نے عدت پوری کی اس کے بعد یہ اسلامی کمیونٹی سنٹر جوائن کر لیا۔ میں نے اپنا دھیان اللہ کی طرف کر لیا۔ میرے معمولات میں نماز پنجگانہ کی ادائیگی، تلاوت کلام کے ساتھ دین کا علم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اللہ سے لو لگا لی ہے میں روزانہ یہاں کلاس اٹینڈ کرنے آتی ہوں میرا عالمہ کا کورس مکمل ہو گیا ہے۔

میں نے عدیلہ کو یاد دلایا کہ ہماری شادی کی تاریخ بیس فروری مقرر ہوئی تھی تو دیکھو آج بیس فروری ہے گو تین سال کا عرصہ بیت گیا ہے۔ عدیلہ کہنے لگی ہاں مذہب میں کیسے بھول سکتی ہوں۔

پھر عدیلہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئی تو اس کی والدہ، بھائی، بھابیاں بالخصوص ذوالفقار مجھے دیکھ کر حیران پریشان رہ گئے۔ اصغر کی حقیقت کھل چکی تھی۔ ذوالفقار اپنے کیے پر بہت شرمندہ اور نادم تھا۔ اس نے مجھ سے معافی مانگی تو میں نے کہا کہ ایک شرط پر معافی ملے گی۔

ذوالفقار نے پوچھا وہ کیا.....؟

تو میں نے کہا کہ آج سے تین سال پہلے ہماری شادی کی تاریخ بیس فروری طے ہوئی تھی تو آج بیس فروری ہے۔ اسی طے کی ہوئی تاریخ کے مطابق آج ہی اگر میرا اور عدیلہ کا نکاح ہو جائے تو معافی دوں گا۔ میرے سارے حالات وہ سن چکے تھے اب کسی کو نہ تو کوئی اعتراض تھا اور نہ ہی اعتراض کی گنجائش۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی والے محاورے کے مصداق اسی دن نماز عشاء کے بعد میرا عدیلہ سے نکاح ہو گیا۔

آج میں نے اپنی محبت پا لی تھی۔ اپنے گھر والوں کو خوشخبری سنا دی تو سب بہت خوش ہوئے۔ جب میں پاکستان واپس آ رہا تھا تو اکیلا نہیں تھا۔ میری محبت، میرا پیار، میرا عشق، میری عزیز از جان میری بیوی عدیلہ میرے ہمراہ تھی۔ ایئر پورٹ پر ہمارے سب رشتے داروں نے ہمارا شاندار استقبال کیا۔ ہمیں پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ جب گھر پہنچے تو میرے کمرے میں سیج سجی ہوئی تھی۔ کمرہ گلاب کے تازہ پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ عدیلہ کو حجلہ عروسی میں بٹھا دیا گیا۔ تو ارم نے بینش کو عدیلہ کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا لو اپنی ماں کی گود میں جاؤ تو عدیلہ نے محبت سے بینش کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بے اختیار چومنے لگی۔

آج مجھے یقین ہو گیا کہ محبت واقعی ایک معجزہ ہے۔

☆☆☆

مجھے تم سے محبت ہے

طیبہ عنصر مغل

زندگی میں جہاں محبت اور چاہت کی اہمیت ہے
وہیں اظہار کے بغیر محبت کا تصور بھی ممکن نہیں.....
اس لیے ضروری نہیں کہ ہمیشہ وہی ہو جو ہم چاہتے ہیں
کبھی کبھی قدرت نے جو ہمارے لیے لکھا ہوتا ہے وہی بہتر ہوتا ہے

محبت کی دھیمی آنچ میں سلگتی ایک پُر اثر تحریر

بدل لیا ہے مجھے اس نے پیراہن کی طرح
وہ آدمی تھا ہمیشہ سے خوش لباس بہت

ممی میں اپنے لیے کس طرح کے ڈریسز کا انتخاب کروں۔ثمن نے اپنی پیکنگ کو کوئی دسویں مرتبہ کھولا اور نہ سمجھ میں آنے پہ بے زاری سے ماں کی طرف دیکھا۔

شیریں بیگم نے اس کا لٹکا ہوا منہ دیکھا تو اپنی پیکنگ چھوڑ کر اس کے کپڑوں کا تنقیدی انداز میں جائزہ لینے لگیں۔فل سلیوز کرتے، ٹائٹس اور مفلر نما دوپٹے۔ انہیں لگا کہ یہ سب ناکافی ہے۔

''کل تیار رہنا ثمن پاکستانی بوتیک سے کچھ شاپنگ تمہیں کروا دوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے پیار سے ثمن کی پیشانی چوم لی۔

ثمن نے ماں کے گلے میں بچوں کی طرح بازو حمائل کر لیے۔شیریں بیگم کی نظر کلاک پہ پڑی تو وہ چونک کر ثمن کو الگ کر کے اٹھیں۔

''چلو باقی پھر سمیٹ لینا پہلے نماز پڑھ لو عصر کا وقت نکل رہا ہے۔ثمن بغیر کسی بحث کے جلدی سے وضو کرنے واش روم کی طرف چل دی۔

☆☆☆

دالان میں آرے ترچھے پڑے ہوئے وجود، ادھر ادھر بکھرے ہوئے میگزین اور پلیٹوں میں آدھی کھائی آدھی بچی چیزیں ان سب چیزوں سے ہو کر مہتاب بانو کی نظر ٹی وی پر چلتے بے ہنگم غیر ملکی ڈرامے پہ پڑی۔ ان کے ماتھے پہ ناگواری سے شکنیں ابھر آئیں۔

''لالی'' مہتاب بانو کی آواز پہ کارپٹ پہ ڈھیر وجودوں کے درمیان سے لالی بیگم ہڑبڑا کر برآمد ہوئیں تو مہتاب بانو کا دل چاہا کہ سب کا غصہ اسی پہ نکال دیں اور خوب ٹھکائی لگائیں اس کی۔

نماز، روزہ کسی بات کی پروا بھی ہے تم لوگوں کو۔ اوپر سے یہ پھیلاوا۔کم از کم اسی کو سمیٹ دیا کرو لیکن سب ہی یہاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور یہ لالی بیگم ان کو بھی چسکے لگ گئے ہیں ڈراموں کے تم تو چلو کچن میں تمہاری تو میں خبر لیتی ہوں۔ اللہ معاف کرے مجھے اماں جان کے کمرے میں تھوڑی دیر کیا ہوئی تم لوگوں کو تو بس آزادی مل گئی اپنی سی کرنے کی۔

بڑے دالان میں موجود سب لڑکیوں کی پلٹن نے خاموشی سے مختلف دروازوں سے کھسک جانے میں عافیت جانی۔لیکن طوبیٰ اور رمشہ جو کانوں میں ہینڈ فری گھسیڑے فون پہ چلتے گانوں پہ سر دھن رہی تھیں۔ان کو عائزہ کی کاٹی چٹکیاں ہوش میں لائیں تب تک مہتاب بانو ان کے سر پر پہنچ چکی تھیں ان کے ہاتھوں سے فون لیتے ہوئے قہر برساتی نظروں نے دونوں کے ہاتھوں کے کوے، طوطے سب اڑا دیئے۔اب کم از کم ایک گھنٹہ ان کو مہتاب بانو کی کھری کھری سننی تھیں۔ لیکن معجزانہ طور پر (بقول طوبیٰ کے) ڈرائنگ روم سے آنے والے بے ہنگم میوزک کی آواز پہ مہتاب بانو کی توجہ ادھر ہوئی اور وہ اپنی بات کو نامکمل چھوڑ کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔جہاں اب لڑکوں کو اپنی خیر منانی تھی۔ازلی بیر کے باوجود عائزہ کو اس وقت بلکہ لڑکوں کی طرف سے آنے والی اس نادانستہ مدد پہ ان کا شکر گزار ہونا پڑا۔

☆☆☆

مغل منزل ''جدید اور قدیم'' تعمیر کا ایک شاہکار حویلی تھی۔ بہت بڑے رقبے پہ تعمیر یہ حویلی اگرچہ اندر سے کچھ پورشنز میں تقسیم ہو چکی تھی لیکن اس کی شان و شوکت ایک مغلیہ محل سے کچھ کم نہ تھی۔دور سے ہی سفید گنبدوں والی یہ عمارت دل کو کھینچ لیتی تھی۔آگے پیچھے گول ستونوں والے برآمدے اور باغ جیسے لان ان کے درمیان چلتے فوارے، سفید ماربل پہ شفاف پانی گرتا تو دل اور آنکھیں عجیب سی کیفیت کا شکار ہو جاتی تھیں۔تمام جدید سہولتوں سے آراستہ اس محل جیسے گھر میں چھوٹے دالان، بڑے دالان، مردانے اور زنانہ نشست گاہیں بھی موجود تھیں۔ڈرائنگ روم بہت ہی جدید انداز میں آراستہ تھے۔وہیں نشست گاہوں میں

تخت بھی گاؤ تکیوں اور جھالروں سے مزین ریشمی غلافوں سے ڈھکے رہتے۔ اونچی اونچی گول کھڑکیوں پہ ریشمی سرسراتے پردے اور بجلی کے فانوس کے ساتھ قدیم اشکال کے شمع دان عجب بہار دکھاتے تھے۔

کچھ سالوں پہلے عالم مغل (بابا جان) کی حیات تک اس گھر کی روایات بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ لیکن عالم مغل صاحب کی وفات کے بعد ان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ نسل اپنی مرضی سے جینے کے راستے تلاشنے لگی۔

مہتاب بانو جو عالم مغل صاحب کے بڑے صاحبزادے جہانگیر مغل کی دلہن بن کر اس گھر میں تشریف لائیں جو عالم مغل صاحب کی بھانجی بھی تھیں اور وہ کسی حد تک حویلی کی روایات پہ کاربند رہنے کا عمل ان ہی کی مرہون منت تھا۔ جہانگیر مغل ایک بیورو کریٹ تھے۔ گھر کے معاملات سے زیادہ ان کا وقت اپنی وائٹ کالر جاب کی نظر ہوتا تھا۔ جبکہ عالم مغل صاحب کی باقی دونوں بہوئیں تانیہ بیگم اور آسیہ بیگم کا تو بس چلتا تو وہ اب تک گھر کو یورپ کا نقشہ بنا چکی ہوتیں۔

وہ تو مقام شکر کہ اماں بی ابھی حیات تھیں اور مہتاب بانو کے لیے ان کا دم غنیمت تھا۔ جہانگیر، ہمایوں اور بابر مغل تینوں ہی بیٹے ان کے حکم اور احترام کو ملحوظ خاطر رکھے ہوئے تھے۔

ہمایوں مغل اور بابر مشترکہ طور پر بہت بڑے بزنس کو چلاتے تھے۔ اماں بی مطمئن تھیں بس ایک اکلوتی بیٹی کا غم اس گھرانے کی خوشیوں کو گرہن کی طرح لگا تھا جو شادی کے پانچ سال بعد بیوہ ہو کر واپس مغل منزل آ گئی تھیں اپنے دو بچوں کے ہمراہ۔

☆☆☆

ہوا اس کے بالوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی اور وہ اپنے سونا گھلے سنہری بالوں کو لپیٹ کر بمشکل جوڑا بنا پائی تھی کہ ایک دم اس کے بالوں کے جوڑے کو ہاتھ مار کر رمیز نے پھیلا دیا تھا۔ یوں لگا جیسے ریشم کے سنہری لچھے اس کی کمر پر آبشار بن کے گرے ہوں۔

''رمیز تم ناں.....!''

''کیا تم تک چڑھی۔'' رمیز نے اس کی بات ٹوک دی۔ لیکن وہ بھی طوبیٰ تھی۔ تم ایک دم بدتمیز انسان ہو۔ اللہ کرے تمہیں ایک عدد بدصورت چڑیل بیوی کی صورت میں ملے۔

طوبیٰ نے غصے سے کھولتے ہوئے اس کو تیز نظروں سے گھورا۔

''جہاں تک میرا خیال ہے چڑیل بدصورت ہی ہوتی ہے۔ تبھی اس کو چڑیل کہتے ہیں اور کیا پتہ وہ چڑیل اس گھر میں ہی ہو۔ مثلاً.....!''

تم یہاں سے دفع ہو جاؤ سارے موڈ کا ستیاناس کر دیا۔ وہ روہانسی ہوئی۔ وہ آج کل امتحانات کی تیاری کر رہی تھی اور اس ارادے سے صبح صبح باغ میں آئی تھی کہ کچھ دیر سکون سے پڑھ لے گی لیکن رمیز نے سارے موڈ کا ستیاناس کر ڈالا تھا۔ یہ سنہری رنگت اور سنہرے بالوں والی باربی ڈول جیسی لڑکی مہتاب بانو اور جہانگیر مغل کی لاڈلی بیٹی تھی۔ طوبیٰ کے علاوہ عائزہ اور سکندر بھی مہتاب اور جہانگیر کے بچے تھے۔ جبکہ رمیز، عنبر، گوہر اور بہروز تانیہ اور ہمایوں کے نور نظر تھے۔ ارم، عظمیٰ اور ہادی آسیہ بیگم اور بابر کی اولاد تھے۔ سب بچے ہی مغلیہ حسن و وجاہت میں اپنی مثال آپ تھے لیکن طوبیٰ کی بے نیازی اور حسن میں ایک الگ رنگ تھا۔

کچھ بچے تو بچپن سے ہی آپس میں منسوب تھے جیسے سکندر، عنبر بچپن سے منسوب تھے اور دل سے بھی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ ہادی پھپھو کی بیٹی ایمن کے لیے موزوں ٹھہرایا گیا تھا۔ بہروز اور عظمیٰ بچپن کے منگیتر بھی تھے اور نسبت پہ مسرور بھی تھے۔ عائزہ، ارم، گوہر اور طوبیٰ میں سے کس کے لیے رمیز کو چنا جانا تھا یہ فیصلہ ابھی محفوظ تھا کیونکہ ابھی ایک اور ہستی

بھی تو باقی ہیں جن کے بغیر پورا مغل گھرانہ بغیر چاند کا آسمان تھا۔

☆☆☆

یار مجھے تو لگتا ہے کہ ہم ابھی تک اکیڈمی کے وہی گدھے ہیں۔ اشعر نے بے زاری سے بوٹوں پہ لگی مٹی جھاڑی۔ ایک ماہ سے لگے ہیں اس اجاڑ جگہ پہ دھڑا دھڑ جنگ اور حالت یہ ہے کہ بیمار پڑ جائیں تو بھی کیمپ میں نہیں بھجوایا جاتا اور جب تک دوا یا ایمبولینس آتی ہے تب تک ہم بغیر بندوق کی گولی اور بغیر ڈاکٹر کی گولی کھائے شہادت کا درجہ پا سکتے ہیں۔ وہ سانس بھرنے کو رکا۔

تمہاری بکواس اگر ختم ہو چکی ہے۔ کیپٹن فاریور کائنڈ انفارمیشن کہ گدھے ہوگے تم..... ہم تو مغلیہ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ حمزہ مغل نے ایک قاتل مسکراہٹ (بقول اشعر) اچھالتے ہوئے کہا۔

او مغل شہنشاہ اپنی کسی کنیز کو بلاؤ اور مجھے تھوڑا پانی پلوا دیں۔

ظل الٰہی۔ ہم پہلے سے مر گئے تو لوگ آپ کی حکومت پہ صدحیف بھیج دیں گے۔ اشعر نے مسخرے انداز میں کہا۔

''آہ کنیز''

سدھر جایئے جوان! ہم یہاں قوم کے لیے لڑنے مرنے آئے ہیں اور آپ اگر کنیزوں کے خواب دیکھتے رہے تو شہادت ایسے نہ ہو کہ حوروں سے بھی محروم رہ جائیں اور ہمارے ہاتھوں ہی قتل ہو جائیں۔ حمزہ نے اشعر کے کندھے پہ زوردار دھپ رسید کی۔

اشعر ہی سی کر کے اپنا کندھا دبانے لگا۔

''یار میرا خیال ہے اشعر تجھے ایک دو اپنی طرف سے ٹھونک دوں تو واپس بھیج دیئے جاؤ کیمپ میں.....!

حمزہ نے بندوق کا بٹ اس کو مارنے کے انداز میں اٹھایا تو اشعر کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ جس میں حمزہ مغل کے بھرپور قہقہے نے شامل ہو کر زندگی دوڑا دی۔ لیکن اس وقت ان کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ جب میجر بھٹی کی آواز کانوں میں پڑی۔

جوانو! اگر آپ کے لطیفہ بازی کا شغل ختم ہو چکا ہو تو ہم آگے بڑھیں۔

بیک وقت دونوں کے بوٹ اور لیس سرکی آواز ہم آہنگ ہو گئی اور دونوں کے چہروں پہ گہری سنجیدگی چھا گئی۔

☆☆☆

اماں! رقیہ جو بہت دیر سے ماں کے چہرے پہ بہتے آنسوؤں کو برداشت کر رہی تھیں جونہی جہاں آراء بیگم نے دعا مانگ کے ہاتھ منہ پر پھیرے۔ فوراً بول پڑیں۔

اماں آپ اس کے لیے اتنی دعائیں مانگتی ہیں تو اس کو ایک بار کہہ کیوں نہیں دیتی ہیں کہ لوٹ آئے اور اگر ایسا نہیں کہہ سکتی ہیں تو پھر بھول جائیں اس کو۔ مت دعائیں مانگا کریں اس کے لیے۔ بددعا کیا کریں اس بدنصیب کے لیے۔ رقیہ بیگم تلخ ہوتی چلی گئیں۔

بس کر دو رقیہ وہ بھی میری اولاد ہے کیسے بددعا دوں میری نظروں کے سامنے نہیں ہے تو زیادہ دعاؤں کا حقدار ہے۔ اماں بی نے بیٹی کو دیکھا۔

تو اماں یہ کیسا دوغلا پن ہے کہ اس پہ گھر کے دروازے بند ہیں اور دعاؤں میں اس کے لیے دن رات روتی ہیں۔ رقیہ کے لہجے میں حزن اتر آیا۔ مہتاب بانو جو چوکھٹ پہ کھڑی سن رہی تھیں آگے بڑھ کے اماں کے قریب تخت پر بیٹھ گئی اور اماں بی کے کندھوں پہ پیار سے ہاتھ رکھ دیئے اور دھیرے سے بولیں۔

''اماں بی..... اب معاف کر دیں تیمور کو۔ مانا کہ پسند کی شادی کی ہے لیکن کسی فرنگن سے تو نہیں کی۔ یہ جرم اتنا بڑا نہیں ہے کہ اس کو یوں زندگی سے نکال دیا جائے۔''

''بہو بیگم! ہم نہیں جانتے کہ جس عورت سے اس

نے شادی کی ہے اس کی عادات کیسی ہیں۔ وہ ہماری روایات کے مطابق چل سکے گی۔ اس کی اولاد آدھی فرنگی ہو گی۔ اور پھر تمہارے بابا جان نے اس کو تعلیم حاصل کرنے بھیجا تھا صاحبزادے شادی رچا کر بیٹھ گئے۔

''اماں شادی بھی تو اس کو اس لیے کرنا پڑی کہ بابا جان نے اس کی درخواست کو رد کر دیا تھا یہ کہہ کر'' وہ کسی ایسی لڑکی سے اس کی شادی نہیں کریں گے جو شادی سے پہلے محبت کا سبق پڑھے اور پڑھائے۔'' اب کے رقیہ نے قدرے تلخی سے کہا۔

ہاں تو جس کو آپ کے بابا جان نے قبول نہ کیا اور پھر بابا جان کی اسے اتنی بھی پروا نہ تھی کہ جب وہ اس جہاں سے رخصت ہوئے تو وہ اس وقت کیوں نہ چلا آیا۔ اماں بی پھر سے رو دیں تھیں۔

یہ آپ بھی جانتی ہیں اماں کیسے کیسے نہ تڑپا تھا وہ یہاں آنے کو کس کس کی منت نہیں کی اس نے۔ لیکن اس وقت آپ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ بس کر دیں اب! مرے ہوئے رشتوں کے لیے زندہ لوگوں کو موت جیسی زندگی نہ دیں۔ تیمور اب بیمار رہنے لگا ہے میرا پیارا بھائی! رقیہ رونے لگی۔

تیمور بیمار رہنے لگا ہے اور مجھے کسی نے بتایا بھی نہیں۔ مہتاب جہانگیر سے کہو'' تیمور کے لیے در کھول دے'' اولاد چیز ہی ایسی ہے پتھر بھی پگھل جائے مہتاب بانو کھلے ہوئے چہرے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہیں جلد جہانگیر کو بتانا تھا کہ تیمور کو سب کے درمیان لانا تھا۔ گھر کی پہلی شادی تھی نئی پیڑھی میں سکندر کے لیے تیمور چچا کا ہونا بہت ضروری تھا۔

اور پھر اماں بی کو بیٹے کی جلد واپسی کی خبر ملی وہ بھی اس طرح کہ وہ ہمیشہ کے لیے پاکستان میں منتقل ہو رہے ہیں۔ ماں کی منتظر نظر ابھی سے چوکھٹ کو چوم رہی تھی۔

سنہرے موتی

☆ حضورؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے فرمایا'' حرام باتوں سے بچو سب سے بڑے ''عابد'' بن جاؤ گے۔''

☆ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تمہاری قسمت میں ہے اس پر راضی ہو جاؤ سب سے بڑی ''غنی'' بن جاؤ گے۔

☆ زیادہ نہ ہنسا کرو اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔

☆ تم سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔

☆ اپنے والدین سے حسن سلوک کرو تمہاری اولاد تم سے حسن سلوک کرے گی۔

☆ جو لوگ میانہ روی اختیار کرتے ہیں وہ کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔

☆ چلتے ہوئے خیال رکھو کہ تمہارے قدموں کی دھول سے کسی کی منزل گم نہ ہو۔

☆ ہر قہقہے کے پیچھے ''آنسو'' اور آنسوؤں کے پیچھے زخموں اور آہوں کی جلن ہوتی ہے۔

☆ جہاں جاؤ وہاں اپنی خوشبو چھوڑ کر آؤ تاکہ لوگ آپ کو اچھے الفاظ میں یاد کریں۔

☆ کسی کو اتنا نہ چاہو کہ اس کی جدائی برداشت نہ ہو سکے۔

☆ ساری بات تو ''تعلق'' کی ہوتی ہے اگر ''تعلق'' ہی ٹوٹ جائے تو شکایتیں کیسی؟

☆ زندگی کے جس چاک کو عقل نہیں سی سکتی ''محبت'' تاگے اور سوئی کے بغیر سی سکتی ہے۔

☆ اگر تم چاہو تو اپنے خیالات کو بدل کر زندگی کو بہتر بنا سکتے ہو۔

☆ وہ ''محبت'' یقیناً عظیم ہوتی ہے جو ایک دوسرے کی عزت پر مبنی ہو۔

☆ حقیقی خوبصورتی کا چشمہ دل ہے اگر یہ ''سیاہ'' ہو تو آنکھیں کچھ کام نہیں دیتیں۔

﴿مسز نگہت غفار، کراچی﴾

عنبر نے قمیص کا گولا بنا کر عائزہ کو دے مارا اور عائزہ تو پہلے سے بھری بیٹھی تھی۔

اف! مصیبتو اب کیا ہوا؟ دس چکر میرے ٹیلر کے پاس بھی لگ گئے اور اوپر سے تم سب فتنیاں مجھے بازاروں میں لے کے لورلور گھوم رہی ہو کہ جیسے قیامت آرہی ہو۔ سلائی کر کے میری اپنی کمر بھی دکھ گئی ہے۔ آخر ایسا بھی کیا ہے کہ تیمور چاچو کے آنے پہ تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مرگئی میں تو تم لوگوں نے تو اچھے بھلے نئے کپڑوں کی قمیصوں کو بالشت بالشت بھر کروا دیا اور بازوؤں سے تو معذور ہی کر دیا شرٹس کو۔

اللہ توبہ آپا اتنا تو جھوٹ نہ بولو۔ میری قمیص تو بالکل بھی معذور نہیں ہے۔ طوبیٰ نے جھٹ سے عذر تراشا۔

جی بالکل! آپ بھی کچھ کم نہیں ہو۔ بس سمارٹ ہو۔ ورنہ سلائیاں لگوا کر قمیصوں کو اتنا تنگ کروا دیا ہے کہ سب کی چھوٹی بڑی توندوں کا راز فاش ہو گیا ہے۔

او بی بی! وہ لندن سے آرہے ہیں ٹوبہ ٹیک سنگھ سے نہیں اور ان کے دو عدد جوان بچی اور بچہ بھی ہیں۔ ہمیں ان کے سامنے پینڈو نظر نہیں آنا ہے۔ گوہر نے تلملا کر جواب دیا۔

اپیا ذرا جا کے اپنے کمرے میں باقی سب کو دیکھو کہ کیا نقشہ بن رہا ہے۔ ایمن جو سب سے چھوٹی تھی۔ عائزہ کو اطلاع دینے پہنچی۔

یا میرے اللہ! عائزہ نے اپنے کمرے کو بیوٹی پارلر بنا دیکھا تو نفاست پسند عائزہ دھم سے کارپٹ پہ ڈھیر ہو گئی۔

اب مہتاب بانو پہ بہت سی ذمہ داریاں آ گئی تھیں۔ تانیہ اور آسیہ بیگم بھی مدد کرتی تھیں لیکن مہتاب بانو کی طرح سے وہ پورے طور گھر کے نظام کو سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھیں۔ تیمور کا آنا اور گھر میں دو شادیاں اکٹھی انجام پا رہی تھیں۔ سکندر اور عنبر کی شادی کے ساتھ ساتھ بہروز اور عظمیٰ کی شادی بھی نبٹانے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ اسی تیاری میں مہتاب بیگم کی نظر لڑکیوں پہ کم ہو گئی تھی۔

☆☆☆

یار! اب تو گھر والوں نے پہچان لیا تو شاید گھر میں گھسنے بھی دے دیں ورنہ ہمارا تو یہ عالم ہے کہ اب کوئی گورا کرنے والی کریم استعمال کرنا پڑ جائے گی تب کوئی گوری مل پائے گی۔ اشعر نے آئینہ دیکھتے ہوئے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

بالکل جی! پہلے تو آپ بڑے فواد خان لگتے تھے جو اب آپ افریقہ سے آئی ہوئی مخلوق لگ رہے ہو۔ شکر کریں خدا خدا کر کے گھر کو جا رہے ہیں۔ حمزہ نے اشعر کو چھیڑا۔

لیکن یہ اور بات تھی کہ اشعر کے لفظ ''گوری'' پہ چھم سے وہ گوری اس کے دل و دماغ پہ کسی وحی کی طرح اتر آئی۔

تم یہ کافی اس قدر کیوں پیتی ہو۔ رنگ جل جاتا ہے محترمہ وہ اس سے کافی کی پیالی جو آدھی وہ پی چکی تھی چھین کر پینے لگا۔

''تو میں کالی ہوں گی اس میں آپ کا کیا نقصان ہے۔'' طوبیٰ چڑ کر بولی۔

واپس کریں میرا کپ۔ وہ اس سے کپ چھیننے لگی۔

میرا نقصان ہو بھی سکتا ہے۔ وہ ذومعنی انداز میں بولا۔

اگر یہ کپ مجھے واپس نہ ملا تو آپ کا نقصان پکا ہے۔ یہ جو وائٹ شرٹ چڑھا کے بیٹھے ہیں ناں یہ وائٹ نہیں رہنی اور پھر واقعی اس چھینا جھپٹی میں کافی جو کپ میں باقی تھی وہ حمزہ کی شرٹ کو رنگین کر گئی۔

طوبیٰ گھبرا کر پیچھے ہٹی تو رمیز سے ٹکرا گئی جو جانے کب سے تند نظروں سے ان دونوں کو گھور رہا تھا۔

☆☆☆

میرا خیال ہے کہ ہمیں آزادی کا عارضی پروانہ مل چکا ہے۔

سر! آپ اپنے تخت بابری سے اٹھیں تو آپ کی سواری باد بہاری سے مستفید ہو کر ہم بھی عازم سفر ہوں۔ اشعر نے حمزہ کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو کیپٹن حمزہ نے خیالات کو جھٹک کر قدم باہر کی طرف بڑھا دیئے۔

زیر لب گنگناتا ہوا وہ جیپ اسٹارٹ کرنے لگا۔

اندر باہر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ جہانگیر مغل تو سرکاری دورے پہ تھے اور ہمایوں تیمور کو لینے ایئر پورٹ گئے ہوئے تھے۔ اماں تو صبح سے اپنا سفید سوٹ سونے کے بٹنوں سمیت پہن کر چھوٹے دالان میں تخت پر براجمان تھیں۔ تانیہ اور آسیہ بیگم بھی موقع ملتے ہی پارلر سے مستفید ہو لی تھیں۔ جبکہ مہتاب اور رقیہ دونوں انتظامات میں بری طرح مگن تھیں۔ لڑکیاں اپنی تیاری کو بار بار ناقدانہ نظروں سے چیک کر رہی تھیں۔ طوبیٰ تو ہمیشہ کی بے نیاز پھر بھی منفرد لگ رہی تھی۔ جبکہ عائزہ اپنی ہمیشہ کی نفیس اور اعتدال پسند طبیعت کے مطابق پر سکون تھی۔

اللہ آپیو! چاچو آ گئے معصوم سی ایمن نے جوش سے بتایا۔

ڈونٹ کال می آپی ایمن اور تمہارے وہ ماموں ہیں گھامڑ۔ گوہر نے ایمن کے سر پر چپت لگائی اور سب نیچے جانے والی سڑھیوں کی طرف بڑھیں۔

او پرٹی کبوتر یو! اماں بی نے تم لوگوں کے یہ نئے اسٹائل کے بازوؤں والے کپڑے دیکھے تو چاچو کو اِن کر کے تم سب کو آؤٹ کر دیں گی۔ عائزہ نے ان کی سلیویس شرٹس کی طرف اشارہ کیا۔

اوئی ماں! پھر کیا کریں؟ ارم منمنائی۔

تم لوگ تاک جھانک کرو۔ میں اور ایمن نیچے جا رہے ہیں۔ عائزہ نے زبان دکھائی اور ایمن کا ہاتھ پکڑ کر نیچے کی طرف چل دی۔

اماں بی کے تمام خدشات ہوا ہو گئے تھے۔ تیمور کی بیوی شیریں بیگم تو ان کی بہو تانیہ اور آسیہ سے بھی بڑھ کر مہذب تھیں۔ خوبصورت سے حجاب اور بڑے سے دوپٹوں میں ملفوف بہو اور پوتی کو دیکھ کر اماں بی نے فخر سے آسیہ اور تانیہ کو دیکھا جن کے دوپٹے کندھوں پہ جھول رہے تھے۔ دونوں نے کھسیا کر دوپٹوں کو سر پر اوڑھ لیا۔ جو نیچے تھے سب ان سے مل لیے۔ تیمور نے اماں بی کو بازوؤں میں لے کر تخت پر بیٹھے تو گویا دنیا بھول گئے۔ لیکن جب لڑکوں کے جھرمٹ میں تیمور کا بیٹا خرم کمرے میں داخل ہوا تو سیڑھیوں میں سے ہلکی پھلکی چیخوں کی آواز پہ سب ادھر متوجہ ہوئے یا نہیں لیکن عائزہ اور ایمن سمجھ گئی تھیں کہ تاکا جھانکی کے چکر میں چڑیلیں اپنے سر ٹکرا بیٹھی ہیں۔

تھوڑی دیر بعد جب کھانا لگانے کا وقت آیا تو تیمور چاچو کی فرمائش پہ کھانا ٹیبل کے بجائے دسترخوان پہ لگایا گیا اور اماں بی کو عالم مغل کی یاد نے گھیر لیا وہ بھی تو کھانا دسترخوان پہ لگوایا کرتے تھے۔ انہوں نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔ تیمور شاید عالم منزل کی روایات واپس لوٹا دے گا۔

اماں بی کے آرام کے لیے جاتے ہی لڑکیاں جلدی جلدی نیچے آئیں لیکن نیچے آ کر انہیں دھچکا ہی لگا۔ چچی اور ثمن کے ڈھیلے ڈھالے لباس اور دوپٹے میں ملفوف چہرے کو دیکھ کر وہ اپنے دوپٹوں کو پھیلا کر اوڑھنے لگیں۔

سب گپ شپ میں مصروف تھے۔ طوبیٰ نماز ادا کر کے باہر نکل آئی اس پہ بے طرح اداسی چھائی ہوئی تھی۔ یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل کب تک جاری رہے گا۔ سب کے مہمان تو آ چکے میرے دل کا مہمان کب آئے گا۔ اس بار وہ آئے گا تو میں اس کو اپنے دل کا حال کھل کے

بتا دوں گی لیکن پندار نسوانیت کو یہ بھی تو منظور نہیں۔ آخر آنکھوں کی زبان بھی تو کوئی چیز ہے کیوں نہیں سمجھتا ہے وہ؟ لیکن وہ سمجھے بھی کیسے؟ میں بھی تو ہر وقت صرف لڑتی رہتی ہوں مگر مجھے کیوں لگتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں میرے پیار کا جہان آباد ہے۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ کب اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ قیمتی موتی کس خوشی میں ضائع کیے جا رہے ہیں۔ رمیز نے آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو اپنی پوروں پہ سمیٹنا چاہا۔ گیٹ میں جیپ داخل کرنے کے بجائے سرپرائز کے لیے پیدل اندر داخل ہوتے کیپٹن حمزہ نے دور سے یہ منظر حیرت سے دیکھا تو قدم سست ہو گئے اور ستون کے پیچھے کھڑی ارم نے رمیز کی پشت پہ حسرت بھری نظر ڈالی اور آنسوؤں کو پیتی ہوئی اندر کی طرف چل پڑی۔

آپ چائے بہت اچھی بناتی ہیں۔ خرم کچن کی چوکھٹ پہ سینے پہ دونوں بازو باندھے کھڑا تھا۔ عائزہ نے پلٹ کے اس کی طرف دیکھا۔ آج اس کو سمجھ آ رہا تھا کہ رائٹرز یونانی دیوتا کی مثال کیوں دیتی ہیں۔ شاید خرم ویسا ہی تھا۔ وہ سوچ میں ہی گم رہتی لیکن خرم نے اس کا انہماک توڑ دیا۔ مجھے پتہ ہے کہ ماشاء اللہ میں بہت وجیہہ ہوں لیکن اتنا بھی محترمہ کہ آپ میری بات کا جواب دینا بھول جائیں۔

اب ایسا بھی نہیں ہے۔ عائزہ نے لہجے میں گھلی کھسیاہٹ کو چھپاتے ہوئے جواب دیا۔ اگر آپ کو دوبارہ چائے کی طلب کچن میں کھینچ لائی ہے تو یہ کام میں بغیر تعریف وصول کیے بھی انجام دے سکتی ہوں۔

چلیے آپ اگر یہ سمجھتی ہیں تو ایک کپ چائے بنا ہی دیں۔ یہ کہتے ہوئے خرم کچن ٹیبل کی کرسی کھینچ کر اس پہ بیٹھنے لگا۔

ارے ارے..... ! یہاں کیوں بیٹھ رہے ہیں آپ..... باہر چلیے میں وہیں آپ کی چائے لاتی ہوں۔ عائزہ نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔

کیوں یہاں بیٹھنے میں کیا کریفو ہے۔ خرم نے مسکراہٹ کو اپنے بھرے بھرے لبوں میں دباتے ہوئے کہا۔

''نہیں اصل میں کچن میں آپ کو گرمی لگے گی۔ اس لیے میں اس خیال سے کہہ رہی تھی۔'' عائزہ کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کو کس بہانے مطمئن کرے کیونکہ خرم کی نظروں کی تپش اس کے جذبات کو پگھلا رہی تھی۔

ارے آپ یہاں بیٹھے ہیں اور ہم آپ کو باہر ڈھونڈ رہے تھے۔ گوہر نے کچن میں انٹری دیتے ہوئے فوراً کہا جبکہ طوبیٰ کے علاوہ باقی سب بھی اس کے ساتھ تھیں۔

''کیوں خیریت مجھے کیوں تلاش کیا جا رہا تھا۔'' خرم نے حیرت سے جواب دیا۔

خرم بھائی! ہمارے حمزہ بھائی تشریف لے آ ہیں اور اب آپ کو سب سے زیادہ مزہ آنے والا ہے۔ ہمارے فوجی بھائی مشکل سے ہی کسی کو بور ہونے دیتے ہیں۔ ایمن نے جلدی جلدی خرم کو بتایا۔

تو گڑیا حمزہ مغل یعنی ہماری پھوپھو کے فرزند ارجمند تشریف لے آئے۔ خرم نے گاڑھی اردو بول کر ان کو حیران کر دیا۔

تیمور چاچو یورپ سے ہی آئے ہیں ناں یا لکھنو سے یورپ کہہ بیٹھے ہیں۔ عنبر نے برجستہ کہا سب زور سے ہنس پڑے۔

اماں بی تیمور کی بیوی اور پوتے پوتی کو دیکھ دیکھ نہال ہو رہی تھیں۔ انتہائی نفیس سی شیریں بیگم بہت سب میں گھل مل گئی تھیں اور اماں کو شیریں اور بچوں باقاعدہ اور بروقت نماز کی ادائیگی اور انداز نشست برخاست میں بے ساختگی اور آداب بہت اچھے لگے اور اس کا انہوں نے برملا اظہار بھی کیا تانیہ اور آم

بھی احساس ہوا کہ وہ یورپ میں رہ کر بھی مہتاب بانو کی طرح مہذب اور سادہ سی خاتون تھیں۔

رات کے کھانے کے بعد جب تیمور اپنے پرانے کمرے میں آرام کرنے آئے تو تب تک شیریں اپنی پیکنگ کھول کر الماری سیٹ کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ تیمور نے محبت بھری نظر سے اپنی بیوی کو دیکھا اور ان کے قریب آ کر پیار سے ان کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ دیئے۔

''آپ کا بہت شکریہ شیریں جو آپ نے مجھے آج مکمل کر دیا۔'' شیریں نے دھیرے سے سر اٹھا کر ان کو دیکھا اور آہستگی سے بولیں۔ آخر ایسا کیا انوکھا کر دیا میں نے کہ آپ کو شکریہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

آپ کا شکریہ کہ آپ میری زندگی میں آئیں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے دو پیارے پیارے بچوں کا والد بنایا اور سب سے بڑھ کر نوازش کہ آپ نے اپنے میں رہ کر بھی میرے گھر کو ایک چھوٹا سا عالم ولاء بنا کر رکھا وہ تمام تہذیب میرے بچوں میں منتقل کی۔ اس کی وجہ سے مجھے کسی کے سامنے بھی شرمندہ نہ ہونا پڑا۔

بس اب بس کریں میں نے جو کیا اس کی توفیق اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی اور جو کیا وہ میرا فرض تھا۔ آپ کا شکریہ کہ آج میں اس فیملی میں آ کر اس کا حصہ بن کر بہت ہی خوشی محسوس کر رہی ہوں۔ میری ادھوری خوشیاں آج مکمل ہو گئی ہیں۔ یہ دیکھیں شیریں نے اپنی دونوں خوبصورت کلائیاں تیمور مغل کے سامنے کر دیں۔ ان کی کلائیوں میں اماں بی کے دیئے خاندانی کنگن جگمگا رہے تھے۔ تیمور نے جھک کر ان کی حسین کلائیوں پہ لب رکھ دیئے۔

اب تو مہتاب بانو کو بھی پورے سکون سے عبادت کا موقع مل گیا تھا کیونکہ شیریں نے جب ان کا بھرپور ساتھ سے ہاتھ بٹایا تو ان کی دیکھا دیکھی تانیہ بیگم اور

خزاں

میں وہ خزاں ہوں
کہ نارسائی کے دشت میں
جس نے چلتے چلتے
تھکن سے بے حال ہو کے
جس بھی شجر کے سائے میں دم لیا تو
اسی کے پتے بکھر گئے ہیں
(انتخاب: حمیرا وحید، واہ کینٹ)

آسیہ بیگم نے بھی خوش اسلوبی سے ذمہ داریاں بانٹ لیں اور لڑکیوں نے بھی ثمن کی دیکھا دیکھی تمام کام کرنے شروع کر دیئے۔ عبادت بھی بڑے دالان میں سب خواتین اکٹھے ہو کر خشوع و خضوع سے ادا کرنے لگیں۔ وہ بے ترتیبی جو ان کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی اب اس کا کہیں شائبہ تک نہ رہا۔ جب ان کے لندن پلٹ کزن اتنے اچھے طریقے سے اپنی مذہبی روایات پہ قائم تھے تو ان کی تو پیدائش ہی عالم منزل کی تھی۔ دو شادیاں جو عید کے تیسرے دن ہونا قرار پائی تھیں ان کی تیاری بھی تقریباً مکمل تھی۔

سب کچھ بہت اچھے انداز میں چل رہا تھا۔ خوشیوں کی تو گویا برسات تھی جو عالم منزل پہ برس رہی تھی۔ اماں بی کو لگا ان خوشیوں میں چار چاند لگا دیں تاکہ تیمور جو اتنا عرصہ اکیلے کاٹتے رہے تو اب کچھ ایسا کریں کہ ان کی جدائی کے دنوں کی بھی تلافی ہو پائے۔ لیکن اس تلافی نے کچھ اور دلوں کی کہاں حق تلفی کر دینی تھیں ان کو اندازہ بھی نہ تھا۔ اور ہوتا بھی تو کیسے جن کی حق تلفی ہوئی تھی وہ تو خود بھی خاموش رہ کر اس کی وجہ بن گئے تھے۔

☆☆☆

وہ روئے جا رہی تھی اور عائزہ اس کو خاموش کروا کروا کے تھک چکی تھی۔

''طوبیٰ بس کرو ابھی تو سب کزن کالج، یونیورسٹی

میں ہیں اگر تم نے یہ تماشا یوں ہی جاری رکھا تو بہت ممکن ہے کہ یہ بات سب کو پتہ چل جائے۔''

تو چل جائے پتہ! یہ میری زندگی ہے اور مجھے رمیز سے شادی نہیں کرنی ہے وہ بزنس مین کبھی بھی میری پسند نہیں رہا۔ طوبیٰ نے روتے روتے عائزہ کے ہاتھ پکڑ لیے۔ ایک لمحے کو عائزہ کا دل چاہا کہ اپنی اس پیاری سی بہن کے سارے دکھوں کا تدارک کر دے لیکن وہ مہتاب بانو کی بیٹی تھی۔ روایات شکن کیسے بن جاتی۔

''طوبیٰ یہ فیصلہ اماں بی کا ہے کہ تمہاری اور رمیز کی اور ثمن اور حمزہ کی نسبت طے کی جائے اور تم جانتی ہو تیمور چاچو نے اپنی مرضی سے شادی کی تو ان کو کس قدر تکلیف دہ حالات سے گزرنا پڑا۔ یہ ایک وقتی جذبہ ہے جو تم حمزہ کے لیے محسوس کر رہی ہو۔ بعد میں سب ایڈجسٹ ہو جاتے ہیں اور ثمن کے لیے تو رقیہ پھوپھو نے خود اماں بی کو کہا ہے۔ تم جانتی ہو کہ تیمور چاچو رقیہ پھوپھو کو بہت پیارے ہیں۔

سب کی تکلیف، سب کے حق ہر چیز تمہیں نظر آئی۔ لیکن میں، میرا کیا؟ یہ وقتی جذبہ نہیں ہے میں بچپن سے حمزہ سے متاثر ہوں۔ بہت پیار ہے مجھے اس سے۔ اب طوبیٰ کے لہجے میں بے چارگی در آئی تھی۔

''کیا حمزہ نے کبھی تمہیں پرپوز کیا یا تمہیں کچھ ایسا کہا جس سے تمہیں لگا ہو کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔'' عائزہ نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ تو طوبیٰ کیا کہتی کہ ''اس کی آنکھوں میں محبت کا سمندر دیکھا ہے'' لیکن کوئی ایک جملہ بھی ایسا تو نہ تھا اس کے پاس جو وہ جواز بناتی۔ سو وہ خاموش ہو کر آنسو بہاتی رہی۔

''ہم بہت آزاد لوگ اپنی روایات کے قیدی ہیں طوبیٰ اور ہمیں اپنی روایات سمیت ہی قدر و قیمت سے رہنا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہمیشہ وہی ہو جو ہم چاہتے ہیں کبھی کبھی قدرت نے جو ہمارے لیے لکھا ہوتا ہے وہ ہی ہمارے لیے بہتر ہوتا ہے۔ عائزہ نے پیار سے اس کا سر تھپتھپایا۔

☆☆☆

اماں! آپ نے ثمن کے لیے حمزہ کو چن کر مجھے سرخرو کر دیا۔ حمزہ میرا بھانجا ہے اور سب بچوں میں مجھے سب سے پیارا لگا لیکن خود اپنے منہ سے کہنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ لیکن آپ نے یہ فیصلہ کر کے میری عمر بھر کی تھکن کا خاتمہ کر دیا۔ اب آپ میرے خرم کے لیے بھی عائزہ کو جہانگیر بھائی سے مانگ لیں۔ یہ میری ایک خواہش ہے جو ضد سے نہیں التجا سے منوانا چاہتا ہوں اور اماں بی تو پہلے سے یہ سوچے بیٹھی تھیں۔ تیمور جو بچوں کی طرح ان کی گود میں سر رکھے لیٹے تھے اور اماں بی ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

ان کے چہرے پہ پھیلے اطمینان کو دیکھ کر حمزہ نے دروازے کی چوکھٹ سے قدم واپس موڑ لیے۔ وہ سارے الفاظ جو وہ خود اماں بی سے کہنے کو ترتیب دے کر لایا تھا۔ وہ سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔

☆☆☆

دو دو شادیاں ہیں گھر پہ اور پھر اس کے بعد تمہاری اور رمیز کی منگنی بھی ایک ہی دن کرنی ہے اور تم ہو کہ پھر سے ڈیوٹی پہ چل دیئے۔ رقیہ بیگم نے جھنجھلا کر حمزہ کو لتاڑا۔ وہ جو جلدی جلدی اپنی چیزیں سمیٹ کر بیگ میں ڈال رہا تھا۔ ایک لمحے کو رک کر ماں کو دیکھا۔

''آپ ایک سولجر کی ماں ہیں آپ کو اس بات کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ آپ کھانے پہ میرا انتظار کر رہی ہیں اور وہ کھانا میرے نصیب میں ہی نہ ہو کسی گولی پہ میرا کب نام لکھا ہو کچھ پتہ نہیں اس لیے میری روٹین دوسروں جیسی نہیں ہو سکتی۔ ہم ایک گھر کے لیے نہیں پورے وطن کے لیے جیتے ہیں اور مرتے.....!

حمزہ میرے ساتھ اس طرح کی باتیں مت کرو۔

بھری جوانی میں بیوگی جھیلی ہے میں نے۔ اب مجھ میں سکت نہیں ہے کسی غم کو جھیلنے کی۔ رقیہ نے دہل کر سینے پہ ہاتھ رکھ لیا تھا۔

''حمزہ پیکنگ چھوڑ کر ماں کو ساتھ لگا کر بیٹھ گیا۔''

امی اب فوجی ہوں تو یہ حقیقت تو ہر وقت ساتھ چلتی رہے گی۔ ہم عام لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں تو ہمارے گھر والے بھی اتنے ہی حوصلہ مند ہونا چاہئیں۔

رقیہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے حمزہ کو دیکھا۔

حمزہ تو شادی پہ بھی نہ آنے کا ارادہ لے کر رخصت ہوگیا۔

عید پہ عالم منزل دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ اندر باہر رونق تھی۔ عنبر اور عظمیٰ کو مایوں بٹھایا گیا دونوں پہ ٹوٹ کے روپ آیا تھا۔ سکندر اور بہروز بھی وائٹ کرتا پاجامہ اور پیلے مفلر کے ساتھ بہت جچ رہے تھے۔ سارا اہتمام لان میں کیا گیا تھا۔ باقی لڑکیاں بھی کمال کی تیاری میں تھیں۔ ایک ہی رنگ کے پیلے ڈریسز مختلف انداز میں پہنے سب حوریں لگ رہی تھیں۔ کسی کا لہنگا چولی تھا تو کسی کا غرارہ سوٹ۔ کسی نے چوڑی دار کے ساتھ لانگ شرٹ پہنی تھی۔ لیکن سب سے حسین طوبیٰ لگ رہی تھی۔ پورا مغلیہ لباس زیب تن کیے انارکلی لگ رہی تھی۔ سنہری بالوں کی لمبی چٹیا پہ گیندے اور موتیے کے پھول عائزہ نے بطور خاص اس کو تیار کیا تھا۔

سب کے قریبی دوست بلوائے گئے تھے تو اشعر کی موجودگی بھی لازمی تھی۔ اس بار حمزہ کو تو بلایا گیا تھا لیکن اشعر یہیں تھا اور حتی الامکان حمزہ کی جگہ پوری کرنے کے لیے تندہی سے مصروف تھا اور اسی مصروفیت کا شاخسانہ تھا کہ مٹھائی کے ڈھیروں ٹوکرے اٹھا کر لاتے وہ گوہر کے غرارے سے یوں الجھا کہ خود تو گرا ساتھ میں گوہر بی بی کو بھی زمین بوس کر دیا۔ لیکن یہ غلطی ایک خوبصورت انجام سے دوچار ہونے والی تھی یہ ان دونوں کو اسی لمحے محسوس ہوگیا تھا اور رمیز کو تو پہلی نظر کے عشق نے ایسا گھیرا کہ وہ اسی وقت محفل میں موجود اپنی والدہ کے گوش گزار کر بیٹھا اور ان کی والدہ کو تو اس سے بھی زیادہ جلدی تھی۔ سو موقع ملتے ہی اماں بی کے کان میں بات ڈال کے رہیں۔ اماں بی کو کیا اعتراض ہونا تھا ان کے سامنے پلا بڑھا بچہ تھا۔ یوں گوہر بی بی بھی ٹھکانے لگنے کو تھیں۔

طوبیٰ کو سخت ٹینشن ہو رہی تھی۔ وہ اداس آنکھوں کا ملال گہرے میک اپ میں بھی چھپا نہیں پائی تھی اور رمیز تھا کہ اس کے پیچھے پیچھے پھر رہا تھا۔ ذومعنی جملے پھینکتا تو اس کے چہرے پہ نہ حیا کا رنگ اترتا نہ ہی شرمیلی مسکراہٹ وہ تو پتھر کا مجسمہ لگ رہی تھی۔

تم نے یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی؟ تائی اماں کیسے بتاتی اپنے منہ سے کہ مجھے رمیز اچھا لگتا ہے۔ مہتاب بانو جو کسی کام سے اوپر آئیں تھیں۔ ہچکیوں کی آواز پہ رک کے ارم کے کمرے کو دیکھا اور پھر دروازہ کھولا تو ارم اجاڑ حلیے میں بیڈ پہ لیٹی رو رہی تھی اور اب وجہ پتہ چلنے پہ ان کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔ وہ ارم کو گلے سے لگائے خود بھی رو رہی تھیں۔ اکٹھے رہنے والے کزن کس طرح ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے ہیں یہ تو یقینی عمل ہے لیکن ان کی محبت کا رخ کس سمت ہے یہ تعین قسمت کرتی ہے۔ وہ اس کا حل سوچنا چاہتی تھیں لیکن اس وقت یہ مناسب نہیں تھا۔

رمیز کو طوبیٰ کی بے رخی کھٹک رہی تھی تو ادھر ثمن کو بھی لگا تھا کہ حمزہ جب تک یہاں رہا تو نسبت کے بعد بھی اس کی آنکھوں میں ثمن نے اپنے لیے کچھ خاص محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ ایک پریکٹیکل سوچ کی مالک تھی۔ محبت اس کے لیے معنی نہیں رکھتی تھی۔

مایوں کی رسم شروع ہو چکی تھی۔ پورا لان سجا ہوا تھا۔ سفید اور پیلے پھولوں کی سجاوٹ اور لائٹنگ نے خوبصورت سماں باندھا ہوا تھا۔ سب چہروں پہ خوشی تھی۔ ارم نارمل سا تیار ہو کے آ تو گئی تھی لیکن اس کی شکایت

بھری نظریں بار بار رمیز کی نظروں سے ٹکراتیں تو رمیز کو کچھ غلط ہونے کا احساس جاگ اٹھتا۔

وہ جذبے جو وہ طوبیٰ کی آنکھوں میں تلاش کر رہا تھا وہ ارم کی نظروں میں جھلک رہے تھے۔ کوئی احساس زیاں رمیز کے دل میں کیوں اٹھ رہا تھا وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

مایوں کی رسم تقریباً تمام ہو چکی تھی کہ جہانگیر مغل جو سٹیج سے اتر رہے تھے۔ موبائل فون پہ آنے والی کال کو سنتے ہوئے لڑکھڑا گئے۔ ہمایوں نے ان کو سنبھالنا چاہا تو ان کے پیلے پڑتے چہرے کے رنگ دیکھ کر جلدی سے موبائل فون ان سے لے لیا۔ لیکن دوسری طرف کی بات تحمل سے سن کر صرف اتنا کہا ''ہم آتے ہیں'' ان کے فون بند کرنے پہ سب ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے کیونکہ جہانگیر مغل تو لگتا تھا سکتے میں چلے گئے ہوں۔

ہمایوں جو ہمیشہ سے نڈر رہے تھے۔ بلا جھجک سب کو بتانے لگے ''ہمیں جانا ہو گا حمزہ کو سی۔ ایم۔ ایس میں لایا گیا ہے۔''

''کیوں؟ کس لیے...... کیا ہوا؟'' کی آوازوں سے سارا لان گونج رہا تھا۔ رقیہ نے فوراً کلیجہ تھام لیا۔

''ہم وطن کے لیے جیتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔'' اس کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔ لیکن اس کے بعد جو ہوا وہ توقع میں بھی نہ تھا۔

''چاچو وہ زندہ ہے ناں......! وہ کیسے مر سکتا ہے جب میں زندہ ہوں میری دھڑکنیں چل رہی ہیں تو اسے کچھ کیوں؟'' طوبیٰ ہمایوں کا گریبان پکڑے ان کے پیروں میں ڈھیر ہو گئی۔ سب حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہے تھے تیمور نے آگے بڑھ کر طوبیٰ کو اٹھایا اور گاڑی میں ڈال کر ہمایوں کے ساتھ سی ایم ایچ کی طرف گاڑی کو موڑ دیا۔

رمیز کو اپنی الجھنوں کا سرا مل گیا تھا۔ مہتاب بانو نے بھی اماں بی کو ساری حقیقتوں کا بتا دیا تھا۔ عائزہ نے طوبیٰ کے دل کا احوال ماں کو بتا دیا تھا اور اب سب حمزہ کی عافیت کی دعا مانگ رہے تھے۔

☆☆☆

بہت دیر سے بے جگری سے جنگ لڑتے ہوئے ایک سنسناتی ہوئی گولی حمزہ مغل کے کندھے سے آر پار ہو گئی۔ وہ تین دن سے بھوکے پیاسے جنگ لڑ رہے تھے۔ خون کا ایک فوارہ حمزہ کے جسم کو بھگو رہا تھا اور پھر بند ہوتی آنکھوں میں طوبیٰ کی تصویر لے کر اس کے حواس نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تم اپنے دل کا راز جو میرے سامنے بھی نہیں کھولتی تھی وہ بھری محفل میں کھول دو گی تو میں بہت پہلے گولی کا نشانہ بن جاتا۔ یار کیا ڈرامائی انداز بنایا تم نے۔ بہانے سے ہاسپٹل بھی پہنچ گئی کیا محبت ہے۔ حمزہ بازو باندھے تقریباً دولہے کے لباس میں پہلو میں دلہن کی طرح تیار طوبیٰ کو چھیڑ رہا تھا جواباً طوبیٰ نے زور سے چٹکی کاٹی تو حمزہ کے بازو ہلنے سے اس کے منہ سے ''سی'' نکل گئی۔ سب نے پریشانی سے حمزہ کو دیکھا لیکن پاس ہی دو عدد اور نکاح شدہ جوڑوں کے منہ پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔

جی ہاں ارم اور رمیز اور عائزہ اور خرم کی بھی نکاح طے شدہ دن پہ منعقد ہو رہا تھا۔ جبکہ شادی شدہ جوڑے الگ سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ تیمور مغل نے پیار بھری نظر ان پر ڈال کر ثمن کے چہرے کو دیکھا اور مطمئن مسکراہٹ دیکھ کر بازو کے گھیرے میں لے لیا۔ اماں بی مطمئن تھیں کہ اس بار کسی کی حق تلفی نہیں ہوئی تھی۔ شیریں جانتی تھیں کہ ثمن کا جوڑ کسی اور کے ساتھ لکھا ہے یقیناً۔ ''کیونکہ جوڑے تو آسمان پر طے ہوتے ہیں'' اور دل کا دروازہ ہر دستک پہ نہیں کھلتا۔

''مجھے تم سے محبت ہے'' حمزہ کی یہ سرگوشی صرف طوبیٰ کی سماعت نے سنی تھی اور شرما کر سر جھکا لیا تھا۔ یہ اس کا اقرار تھا کہ ''مجھے تم سے محبت ہے۔''

☆☆☆

کفارہ

ایم حسن نظامی

شدید سردی رگوں میں لہو منجمد کیے دے رہی تھی۔ دھند اور کہر نے ہر سو دھواں دار سفیدی کی دبیز چادر پھیلا رکھی تھی۔ گاؤں میں سرِشام ہی رات کا گمان ہو رہا تھا۔ لوگ وقت سے پہلے ہی گرم لحافوں میں دبکنے لگے تھے۔ فضا میں گہری خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔

فاطمہ بیگم دن بھر کی بھاگ دوڑ اور تھکن کے بعد سونے کے لیے بستر پر آئیں تو انہیں اچانک خیال آیا کہ باہر کا دروازہ کھلا ہے۔ وہ فوراً ہی اٹھیں اور تالا ہاتھ میں تھامے دروازے تک پہنچیں۔ ابھی وہ دروازہ بند کر ہی رہی تھیں کہ گلی میں رکشہ رکنے کی آواز پر وہ ٹھٹک گئیں۔ آٹو رکشہ ان کے دروازے پر ہی رکا تھا۔

یا اللہ خیر..... اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔

مینا رکشے سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ دیکھ کر فاطمہ بیگم تڑپ اٹھیں اور بے قراری سے اسے گلے لگالیا۔

کیا ہوا میری گڑیا.....؟ گھر میں سب خیریت ہے ناں..... بیکراں سوچوں اور اندیشوں نے اسے لرزا دیا۔

امی جان! میں گھر چھوڑ کر آ گئی ہوں۔ مینا نے سسکیوں میں کہا۔ اب میں مزید اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ اس کا پورا وجود جیسے تھرتھرا رہا تھا۔

مگر کیوں میری جان.....؟ ماں نے تجسس اور حیرانگی سے پوچھا۔

امی! زیادتی کی حد ہوتی ہے۔ امی اور حمزہ کی بہن نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ ہر بات پر اعتراض، ہر بات پر طنز۔ امی میں اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے بار بار طنز کیا جاتا ہے کہ مجھے بیاہ کر انہوں نے بہت بڑا احسان کیا ہے۔ طلاق یافتہ ماں کی بیٹی کو کون اپناتا ہے۔ امی میں

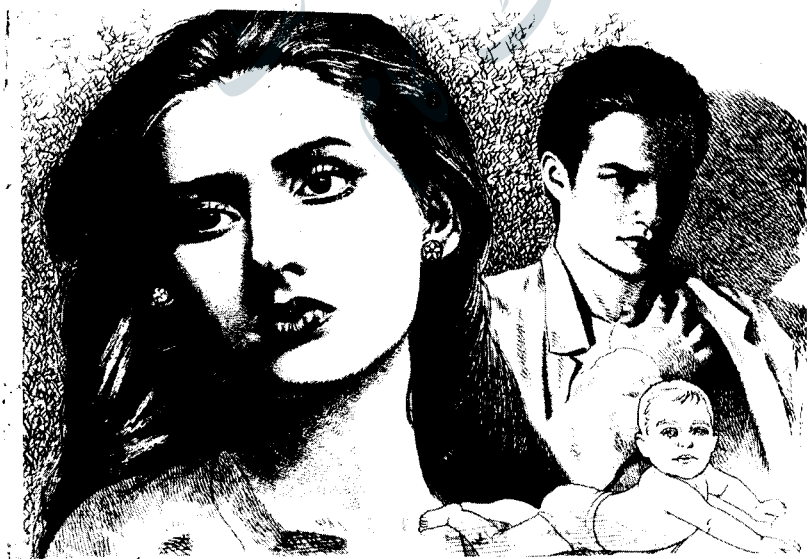

ان کی جلی کٹی مزید برداشت نہیں کرسکتی۔ اس لیے وہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی آئی ہوں۔ بتائیں امی کیا میں نے غلط کیا ہے.....؟

پتہ نہیں بیٹا.....تو نے غلط کیا ہے یا صحیح۔ فاطمہ بیگم نے سرد آہ بھری۔ مگر تو میری بچی ہے۔ تیرے لیے میں سب کچھ کرسکتی ہوں۔ ہر قربانی دے سکتی ہوں تو پریشان مت ہو۔ بس امی میں یہ سوچ کر آ گئی ہوں پھر اس گھر میں کسی صورت نہیں جاؤں گی۔

آؤ اندر میری بچی.....رکشے سے اس کا سامان اتروا کر کرایہ دے کر فارغ کیا۔ وہ ماں کے ساتھ ہی لان میں صوفے پہ آ کر بیٹھ گئی۔ مینا اسے آہستہ آہستہ بتانے لگی کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا تھا۔

کھانے پینے پر روک ٹھوک، ذرا دیر سے اٹھنے پہ باتیں، کام کی ذمہ داریاں، شوہر کے ساتھ باہر جانے پر بھی کو اعتراض، کوئی نہ کوئی بولنے لگتا تھا۔ ماں کے گھر جانے کا بولے تو ساس نندوں کے منہ بن جاتے۔

ماں خاموشی سے سنتی رہی۔ مینا کی ساری باتیں وہی تھیں جو آج کل متوسط گھرانوں میں بہوؤں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ انہیں تنگ کیا جاتا ہے یا ان کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا۔ اس میں قصور حمزہ یا اس کے گھر والوں کا نہیں۔ اس معاشرتی نفسیات کا ہے جس نے ساس، نندوں اور بہوؤں کے کردار کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے اور یہ نفسیات روز بروز پختہ ہوتی جا رہی ہیں۔ اب کسی گھر میں ان کرداروں کے درمیان محبت اور خوشگواری ہو تو لوگ اسے غیر فطری سمجھتے ہیں۔ اس پہ تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔

مینا نے کوئی نئی بات نہیں کی تھی۔ آج سے سولہ سال قبل فاطمہ بیگم بھی ان ہی حالات سے گزر چکی تھی۔ ماں، بہن اور بیوی کی کش مکش میں نقصان بیوی ہی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ مرد سے اس کا رشتہ محض قانونی اور چند الفاظ کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر شوہر کا جھکاؤ بیوی کی طرف ہو تو ماں، بہنوں سے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ان سے رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا اور یہی چیز شاید محبت کرنے والے میاں بیوی کے درمیان جدائی کا باعث بن جاتی ہے۔ اس کے باوجود عورتیں اس نفسیاتی گرداب سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ گھروں میں اپنی حیثیت کا تعین وہ زور بازو سے کرنا چاہتی ہیں۔ مرد کو اپنا بنانے کے لیے آپس میں زور آزمائی کرتی ہیں۔ سازشیں ہوتی ہیں اور جس میں صلاحیت زیادہ ہوتی ہے وہ مرد کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس جنگ میں بیوی کا نقصان ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نئی آتی ہے مزاج شناس نہیں ہوتی اور اس کا مقابلہ ایک سے زیادہ افراد سے ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ سمجھتی ہے اگر کسی عورت کو طلاق ہوتی ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ عورت خود ہوتی ہے۔

☆☆☆

گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے رحمان نے اس سے کہا تھا۔ فاطمہ.....اگر تم نے اس گھر میں عزت اور سکون سے رہنا ہے اور میرے دل میں گھر کرنا ہے تو سب سے پہلے میرے ماں باپ کی عزت کرنا ہوگی اور ان کی خدمت اپنے ماں باپ سے بڑھ کر کرنا ہوگی۔

جی! فاطمہ نے مختصر سا کہا۔

سچی بات تو یہ تھی کہ وہ اس فقرے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ تو اس وقت پیار بھرے کسی رومانی جملے کی منتظر تھی۔ اس لیے اسے ناگوار گزرا مگر وہ ان لمحوں میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی شاید۔ رحمان اسے فاطمہ کی توجہ سمجھے اور انہوں نے خاصی دیر تک اس موضوع پر لیکچر دے دیا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسے اپنی ساس، سسر، نند اور جیٹھوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا ہے اور اس معاملے میں کسی کوتاہی کا مطلب رحمان کی ناراضگی ہوگا۔ فاطمہ اندر ہی اندر سلگتی رہی اور ان کی باتیں سنتی رہی۔

خاصی دیر بعد رحمان کو یاد آیا کہ فاطمہ ان کی بیوی ہے اور آج ہماری سہاگ رات ہے۔ جب انہوں نے پیش

قدمی کی تو فاطمہ کا دل بجھ چکا تھا مگر اس نے بے دلی سے اپنے آپ کو رحمان کے حوالے کر دیا۔

اگلے روز صبح آٹھ بجے تھے کسی نے دروازہ بجانا شروع کر دیا۔ حالانکہ وہ چند گھنٹے پہلے ہی سوئے تھے۔ ابھی فاطمہ کا حلیہ بھی درست نہیں تھا۔ اسے درست کرنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ دروازہ کھلتے ہی اس کی ساس تیزی سے اندر آئیں۔ فاطمہ نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے جواب دینے کی بجائے سخت انداز میں رحمان سے پوچھا۔

اتنی دیر سے دروازہ بجا رہی تھی کھولا کیوں نہیں.....؟

سوری امی..... رحمان نے معذرت کی۔ آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ فاطمہ کو عجیب سا لگا کہ انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ میاں بیوی ہیں اور یہ ان کی پہلی صبح ہے۔ اول تو کوئی اتنی صبح اٹھاتا نہیں اور اگر اٹھاتے بھی تو ان سے سوال نہیں کرتا تھا۔ کچی نیند سے اٹھائے جانے پر فاطمہ کی آنکھیں جل رہی تھیں اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سو جائے مگر ساس حکم دے کر چلی گئیں۔

اب اٹھ جاؤ۔ ہمارے ہاں دلہنیں اتنی دیر تک نہیں سوتیں۔ ابھی محلے والیاں بھی دیکھنے کے لیے آئیں گی۔

بھئی! کیا مصیبت ہے۔ ساس کے جانے کے بعد اس نے ذرا ناز بھرے انداز میں کہا۔ ابھی تو آنکھ لگی ہی تھی۔ اٹھ جاؤ..... امی بول کر گئیں ہیں۔ اگر دیر ہو گئی تو انہیں غصہ آئے گا۔

رحمان خشک لہجے میں بولتے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھ گئے اور وہ چپ سی رہ گئی۔ اس واقعہ سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس گھر میں اس کی زندگی آسان نہیں ہو گی۔ جب تک رحمان نہا کر آئے فاطمہ ان کی کزنوں میں گھری رہی۔ اس کی نند نے کمرے میں آنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ اس سے ہنسی مذاق کرتی رہی اور فاطمہ مسکراتی اور شرماتی رہی۔

اچانک اس کی نند شائستہ نے کمرے میں جھانکا اور کرخت لہجے میں بولی۔ بس کر دیہ چاؤ چونچلے، ناشتہ لگنے والا ہے۔

ناشتے کی میز پر خاصی سرد مہری سے اس کا استقبال ہوا۔ سسر نے سر کی ہلکی سی جنبش سے سلام کا جواب دیا۔ مگر ساس نے ایسی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ اس کی نند عمر میں بے شک اس کے برابر سہی لیکن رشتے میں اس سے چھوٹی تھی۔ اسے فاطمہ کو سلام کرنا چاہیے تھا مگر اس نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور توس پہ جام لگاتی رہی۔

فاطمہ کو سب سے تعجب اس بات پر ہوا کہ انہوں نے اس کا انتظار کیے بغیر ہی ناشتہ شروع کر دیا تھا۔ بلکہ اب تو ختم ہونے کے قریب تھا۔ رحمان نے بھی اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور ناشتہ جاری رکھا۔ وہ خاموشی سے ان کے بیچ گھس گئی اور بچ جانے والے ٹھنڈے ناشتہ کو بے دلی سے گلے میں اتارنے لگی۔

بہو بیگم صحیح سے کھاؤ..... ورنہ سمدھن طعنہ دیں گی کہ ان کی بیٹی کو پہلا کھانا ٹھیک سے نہیں ملا۔

اگر شب بھر رحمان اسے طویل لیکچر نہ دے چکے ہوتے تو شاید اس کے منہ سے نکل ہی جاتا کہ امی کہتیں بھی تو کیا غلط کہتیں۔ ایک دن کی دلہن کا ناشتے پر اس طرح پر تپاک استقبال ہوتا ہے مگر وہ ان کا طنز برداشت کرنے پہ مجبور تھی۔ ان کی بات سن کر اس کی رہی سہی بھوک بھی مر گئی۔ اس نے خاموشی سے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

بس امی..... بھوک نہیں ہے۔

کیوں بھئی رات کو کہیں تکے کباب وغیرہ تو نہیں لے گئے۔ شائستہ نے طنزیہ انداز سے بھائی کی طرف دیکھا۔

ارے نہیں..... میں تکے کیوں لے جانے لگا۔ رحمان نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ وہ اندر ہی اندر جل کر خاکستر ہو گئی۔

فاطمہ پہلے دن اپنے گھر جانا چاہتی تھی مگر ساس نے یہ کہہ کر روک دیا کہ ان کے ہاں اس کا رواج نہیں، اگرچہ یہ بات درست تھی مگر اسے اتنی کوفت محسوس ہوئی کہ کمرے میں آ کر تڑپ کر رو دی۔

اسے امی، ابو، بھائی اور چھوٹی گڑیا بہت شدت سے یاد آرہے تھے۔ ناشتے کے دوران بھی وہ اس خیال کو دہرا رہی تھی اور اپنے آپ کو بہلا رہی تھی کہ وہ اس گھٹن زدہ ماحول سے نکل کر کچھ دیر میں اپنے گھر سکون کرے گی اور اپنے پیارے خوش ہوں گے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بے چین سی ہوگئی اور رحمان سے کہا۔ میرا امی ابو سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔ کیا آپ مجھے جانے کی اجازت نہیں دیں گے.....؟

یہ سنتے ہی رحمان کی بے قراری سرد مہری میں بدل گئی۔ جب ماں جی نے ہمارے گھر کا رواج بتا دیا ہے تو پھر اصرار کیوں کررہی ہو۔ ابھی تمہارے گھر والے آئیں گے ان سے مل لینا۔

رحمان! مجھے امی ابو سے ملنا ہے۔ وہ تو نہیں آئیں گے۔ بھئی یہ ممکن نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے ہاں تو لڑکی شادی کے گیارہویں دن اپنی امی کے پاس جاتی ہے۔

گیارہ دن بعد..... فاطمہ کا دل ڈوبنے لگا۔ لیکن یہ تو زیادتی ہے سرتاج۔ اس نے گویا التجا کی.....

کوئی زیادتی نہیں۔ تم بائیس سال ان کے پاس رہ کر آئی ہو اور ابھی سے ان کی یاد ستانے لگی۔ فاطمہ..... تمہیں ابھی ایک دن ہوا ہے۔

سرتاج! آپ نہیں سمجھتے۔ ماں باپ، بہن بھائیوں سے بچھڑ کر ان کی یاد کتنی شدت سے آتی ہے اور یہ رشتے کس قدر اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ پلیز..... آپ امی سے مجھے اجازت دلوا دیں۔ فاطمہ نے بے قراری میں جیسے رحمان کی منت کی۔

ابھی ممکن نہیں..... اگر چہ چند روز بعد تمہیں لے جاؤں گا۔ وہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد فاطمہ کا بھائی اور چھوٹی بہن اسے لینے کے لیے آئے۔ سبھی نے انہیں اچھے اور پرخلوص انداز سے ویلکم کیا۔ مگر سبھی ایک دوسرے سے کبھی کہیں اور کبھی کسی کمرے میں جا کر چہ مگوئیاں کرنے لگے۔ تبھی اس کے بھائی نے سبھی کچھ محسوس کرلیا پھر فاطمہ سے مخاطب ہو کر بولے۔

بے بی تمہارا کیا خیال ہے.....؟ بھائی آپ نے مجھے ہمیشہ کے لیے اس گھر سے منسوب کر دیا ہے اور اب..... جو یہ چاہیں گے وہی میری خوشی ہے۔ آپ چلے جائیں۔ میں اور رحمان ملنے آئیں گے اور وہ مایوسی کے عالم میں واپس لوٹ گئے۔

بس یہیں سے ان لوگوں کو اس قدر چھوٹ ملی کہ فاطمہ بدنصیبی کی راہیں پر چل پڑی اور پھر یہاں تک کہ ناشتے میں چائے تک نصیب نہ ہوتی۔ سر میں درد ہو تو گولی تک نہ ملتی۔ اگر وہ رحمان سے اس کا ذکر کرتی تو خدا بہتر کرے گا۔ کہہ کر ٹال دیتے۔

اگر کبھی کبھار وہ فاطمہ کو میکے لے جاتے تو کئی کئی روز تک ان کا موڈ آف رہتا۔ جیسے رحمان کو میکے جانے سے الرجی ہو۔

جب کبھی فاطمہ کی ماں یا بہن بھائی ملنے آتے تو بھی ان کا ناروا سلوک اسے اندر تک گھائل کرنے لگتا۔ اس روز بھی اس کی ماں ملنے آئیں تو وہ اپنے آنسوؤں پر ضبط نہ کر سکی۔ ماں آخر ماں ہوتی ہے پریشان ہوگئی۔

کیا ہوا بیٹی.....! تو ٹھیک ہے ناں..... تیرے ساتھ سبھی کچھ.....؟

جی امی! سبھی ٹھیک ہے۔ آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔ رحمان رات وہ آئے تو اس کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ ماں کے جانے پر ساس صاحبہ نے اپنے بیٹے سے گویا شکایت کی۔ فاطمہ.....! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تم اپنے ماں اور بہن کے سامنے دکھڑے سناتے رو رہی تھیں۔ ایسا کیا ہو رہا ہے تمہارے ساتھ.....؟

نہیں..... کچھ..... کچھ بھی تو نہیں وہ جیسے ڈر کر سہم گئی تھی۔ میں تو امی سے مل کر اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی۔ اس لیے بلا اختیار آنسو پلکوں سے باہر پھسل آئے۔

تمہاری ماں کا خیال ہے کہ ہم تم پر ظلم کررہے ہیں۔ وہ کیوں پوچھ رہی تھی۔ رحمان شاید جذباتی ہو رہا تھا۔

نہیں جی..... امی نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ صرف اتنا پوچھا تھا کہ تم ٹھیک ہو۔ آپ لوگوں کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ میرے گھر والے میری خیریت کیوں پوچھتے ہیں۔ اس بار فاطمہ بھی خاموش نہ رہ سکی۔

تمہاری کس بات پر اعتراض ہوا ہے وہ پھر بولے۔

اپنے ایمان سے بتایئے.....؟ رحمان! جو کچھ یہاں میرے ساتھ ہو رہا ہے ایسا ہی اگر آپ کی بہن کے سسرال والے اس کے ساتھ کریں تو آپ کو کیسا لگے گا۔ فاطمہ نے کہا تو ان سے کچھ نہ بن پڑا اور وہ کھسیا گئے۔

اب تمہارے ساتھ ایسا بھی ناروا سلوک نہیں ہو رہا۔ وہ جیسے بحث پہ اتر آئے۔ تب میری دعا ہے شائستہ کے ساتھ اس کے سسرال میں ایسا ہی سلوک کریں۔ فاطمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا آنچل پھیلا کر طنزیہ کہا تو وہ تلملا گیا۔

بددعا دے رہی ہو میری بہن کو.....؟ اب آپ بخوبی واضح کر رہے ہیں کہ میرے ساتھ کیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات ظاہر کر رہے تھے کہ وہ شرمندہ ہیں۔ مگر جو ماؤں کے بیٹے ہوا کرتے ہیں ناں انہیں اس سے قطعی غرض نہیں ہوتی شاید.....

بیٹیاں، والدین کے لیے رحمت کا درجہ رکھتی ہیں مگر.....ان کے نصیب اگر خداوند کریم ماں باپ کے ہاتھ میں دے دیتا تو وہ اپنے سکھ چین اور خوشیوں کو بیٹوں کے نصیب اور مقدر پر ترجیح دیتے۔ خود بیکراں دکھ تکلیفیں جھیل کر بھی اولاد کو سدا سکھی ہی دیکھتے اور اپنی جان تک اولاد پر قربان کرنے سے ذرا دریغ نہ کرتے۔

کس قدر ہیں صابر شاکر وہ بیٹیاں جو سبھی ظلم و ستم سہہ کر بھی والدین کے سامنے کبھی کچھ عیاں نہیں کرتیں۔ بس قسمت اور تقدیر کا لکھا اپنے دامن میں ڈال کر چپکے چپکے آنسو بہا لیا کرتی ہیں کہ ہمارے اپنوں کو دکھ درد نہ ہو۔

فاطمہ بھی سبھی کچھ برداشت کرتے ہوئے خاموش رہی مگر سسرال کے ظلم و ستم کم ہونے کی بجائے بڑھتے ہی چلے گئے۔ رفتہ رفتہ رحمان بھی ماں کا حمایتی بن کر بولنے لگا تھا اور جن خوابوں کو من میں سجائے وہ پیا گھر آئی تھی سبھی چکنا چور ہو گئے۔ سکھ کی نیند اور مسرتوں کی امیدیں دم توڑنے لگیں۔ اس کے ہر ہر کام اور ہر ایک فعل میں کیڑے نکالے جانے لگے اور پھر سسر کی اچانک وفات پر اس پہ جیسے نفرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ رحمان اور ساس صاحبہ سسر ہی کی وجہ سے چپ تھے۔ ہر وقت طعن و تشنیع، ہر وقت لڑائی جھگڑا۔ اس کے لیے مسرتیں شاید باقی نہ رہی تھیں۔ آنکھیں اشکوں کی سوغات سے بھیگی رہتیں۔ وہ کولہو کے بیل کی طرح دن بھر کام میں جتی رہتی اور جیسے ہی کمر سیدھی کرنے کے لیے بستر پر آتی۔ آواز جیسے تعاقب میں ہوتی۔

اے فاطمہ.....دیکھو ذرا وہ کام نہیں ہوا۔ وہ کام کس نے کرنا تھا۔ تم نے ہی ایسے سر چڑھا رکھا ہے ماں۔ رحمان کی جلی کٹی ماں کی آواز کے ساتھ شامل ہو کر اسے بے چین و بے قرار کر جاتیں۔

کسی وقت فاطمہ کچھ کہہ دیتی تو گھر میں لڑائی جھگڑے کا محاذ کھل جاتا۔ جورات گئے بحث مباحثے کی صورت پڑوسیوں تک سنا جانے لگا۔ بالآخر فاطمہ ہی کو اشک بہاتے ہوئے خاموش ہونا پڑتا۔ صبح کوئی ہمسایہ رحمان کو سمجھانے کی کوشش کرتا تو اس کا بھی الزام فاطمہ ہی پر آتا۔ کہ یہ ہمارے گلے شکوے پڑوسیوں سے کرتی ہے۔

آئے روز کے لڑائی جھگڑے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ساس صاحبہ کو دل پہ اٹیک ہوا ہر وقت ڈاکٹر کے پاس پہنچنے پر وہ سنبھل تو گئیں مگر انہیں ہر طرح کے کام و کاج سے روک دیا گیا۔

نند صاحبہ نے اس بات کا الزام بھی فاطمہ پر ہی لگایا اور کہا کہ یہ اس کلموہی کی بددعاؤں سے بھی کچھ ہوا ہے۔ مگر وہ ایسے موقع پر خاموش نگاہوں کے اشک اندر ہی اندر اپنے من میں اتارتی رہی۔

رحمان ایسی صورت میں خاموشی سے سنتے رہتے یا پھر چپکے سے باہر نکل جاتے۔ مگر نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ فاطمہ

سے بولنا کم کر دیتے اور فاطمہ اس کی اس چپ اور خاموشی سے چڑ جاتی۔

جب کسی معاملے میں میرا قصور نہ ہو تو مجھ سے منہ کیوں پھلا لیتے ہو۔

بھئی میں منہ نہیں پھلاتا۔ بس میرا بات کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ تمہیں معلوم ہے میں کسی سے بھی بات نہیں کرتا۔ مجھے مت چھیڑا کرو۔ میرا موڈ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ بولے تو اسے بھی خاموش ہونا پڑا۔

رفتہ رفتہ فاطمہ پہ گھر کی ذمہ داریاں بڑھتی چلی گئیں۔ صبح کا ناشتہ، رات کا کھانا، برتن دھونا، صفائی ستھرائی، مہمانوں کے لیے پکون۔ وہ صبح سے رات گئے تک کام میں جتی رہتی اور ذرا بھر سکون نصیب نہ ہوتا اور کبھی کبھار اس کی زبان پر اپنی نند کا نام آ جاتا تو ساس صاحبہ پورا گھر اپنے سر پر اٹھا لیتیں اور پھر رحمان تک یہ شکایت جاتی تو وہ بھی اسے مورد الزام ٹھہراتے۔

کچھ دنوں سے فاطمہ کی طبیعت بوجھل اور خراب ہونے لگی تھی۔ رحمان اسے سرکاری ہسپتال لے گئے۔ کیونکہ مہینے کے آخر میں ان کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاتے۔ وہاں لیڈی ڈاکٹر نے چیک اپ کر کے خوشخبری سنائی کہ فاطمہ ماں بننے والی ہے۔ وہ میاں بیوی یہ سن کر خوش ہو گئے۔ دوائیاں لے کر ڈاکٹر نے ہدایت کی کہ انہیں آرام کی بہت ضرورت ہے۔

جب وہ گھر پہنچے اور یہ خبر ساس صاحبہ تک پہنچی تو انہوں نے پہلا فقرہ یہی کہا۔

اے بی! ہمیں لڑکا چاہیے.....؟ بھئی ہمارے ہاں سبھی کا پہلا بچہ لڑکا ہوتا ہے۔

امی! یہ سب خدا کی مرضی پہ منحصر ہے۔ رحمان نے بہت ہی آہستگی سے کہا۔

مگر وہ منہ بنائے خاموش رہیں۔ خداوند کریم کے کام میں دخل اندازی دراصل کفر کا مرتکب ہونے کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر ایک پتا بھی ہل نہیں سکتا اور نہ ہی کوئی شے متحرک رہ سکتی ہے۔

ایسی باتیں تو اب جاہل گھرانوں میں بھی نہیں ہوتیں۔ فاطمہ چپ نہ رہ سکی۔ شاید تبھی لبوں پہ آئی سیدھی بات نکل آئی۔

فاطمہ زبان سنبھال کر بات کرو۔ تم میری ماں کو جاہل اور گنوار کہہ رہی ہو۔ رحمان بگڑ کر بولے۔

میں نے تمہاری ماں کو کیا کہا ہے۔ بات تو جاہل گھرانوں کی کر رہی ہوں۔

بک بک مت کرو یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ ادھر سے نند صاحبہ وارد ہو گئیں اور تنک کر بولیں۔

آپ کا گھرانہ بڑا سلیقہ شعار اور پڑھا لکھا ہے۔

خبردار جو میرے گھرانے کو کچھ کہا تو..... فاطمہ نے انگلی اٹھا کر کہا۔

ہاں..... ہاں ہمارا ہی گھر تمہیں جاہل اور اجڑ ملا ہے۔ یہ تمہارا قصور نہیں ہے۔ تمہارے سر پر سرخاب کے پر نکل رہے ہیں۔ اتنی دیر میں رحمان لوٹ آئے۔

دیکھ لو..... تمہاری ماں مجھے اور میرے کنبے کو غلط کہہ رہی ہیں۔ فاطمہ کے آنسو نکل آئے اور وہ زار و قطار رونے لگیں۔

ہاں..... ہاں لگا دو شکایتیں اپنے شوہر کو۔ ہم ماں بیٹی تمہیں اب بری لگنے لگی ہیں ناں..... اس کی بہن نے فقرہ کسا اور پھر ماں بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔

رکھ لے بیٹا اس خان زادی کو..... ہمیں اس گھر سے نکال دے۔

رحمان نے ماں اور بہن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

ہاں جی! اب تم بھی ہمیں نئے سبق سکھانے لگے ہو۔

خدا کے لیے فاطمہ زبان بند کر لو۔

ہاں..... ہاں میں ہی بری ہوں اس گھر میں۔ تمہاری ماں اور بہن تو زبان سے سدا خاموش رہتی ہیں۔

ماں بہن اور بیوی کی تکرار سن کر رحمان سر پکڑے بیڈ پر یوں گر گیا جیسے اس کی زبان گنگ ہو گئی ہو۔ زمانے بھر کی

سوچیں اس کے اعصاب پر سوار ہوگئیں۔ اگر ماں اور بہن کو خاموش کراتا تو بیوی بولنے لگتی اور اگر بیوی خاموش ہوتی تو بہن دو ہاتھ آگے نکل جاتی۔

آخر کار فاطمہ ہی کو خاموشی کی چادر اوڑھنی پڑی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہی ان سبھی باتوں کی قصور وار ہے وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور پھر جی بھر کر اندر کے سبھی کرب، سارے دکھ آنسوؤں کے راستے باہر نکال دیئے۔

اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اب یہی آنسو ہی اس کے دکھوں اور غموں کے ساتھی تھے۔

☆☆☆

ابتدائی دنوں میں اس کی طبیعت خاصی بوجھل رہی مگر گھر کے کاموں کی ذمہ داری ذرا بھی کم نہ ہوئی۔ صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، برتن دھونے، کپڑے دھو کر استری کرنا اور جب کبھی خرابی صحت کی وجہ سے کوئی کام رہ جاتا۔ ساس صاحبہ اتنی سناتیں کہ اس کے چودہ طبق روشن ہو جاتے۔ اکثر سر چکرانے کی وجہ سے اسے کھڑا ہونا اور چلنا پھرنا محال ہونے لگا اور ایسی صورت میں وہ کام اپنی نند کو کہتی تو وہ بھی بگڑ کر منہ سے طرح طرح کے فول بکنے لگتی اور فاطمہ اس ناانصافی پہ کڑھنے لگتی۔

پھر وقت ذرا آگے سرکا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے اسے کام کرنے سے روکا۔ دو تین دن اس کی نند نے سبھی کام سنبھالے مگر..... ساس صاحبہ سے یہ برداشت نہ ہوسکا اور تیسرے روز جل کر بولیں۔ ہمارے وقتوں میں کام کاج بھی کرتے رہتے تھے اور بچے بھی اچھے خاصے گھر ہی میں پیدا ہوتے تھے۔ اب کام بھی نہ کرو اور بچے بھی ہسپتال اور میڈیسن بھی ساتھ ساتھ کھاؤ کیا وقت آ گیا ہے۔

جس سے وہ اٹھ کر پھر سے کام کاج میں جت گئی۔ مگر اب اس سے کام درست نہیں ہوتا تھا یا پھر آدھا چھوڑ کر بیڈ پہ کمر سیدھی کرنے لگتی۔ جس سے پھر سے بات وہیں سے شروع ہو جاتی اور گھر کے در و دیوار اونچی آوازوں اور گالی گلوچ سے لرزنے لگتے۔ وہ رحمان سے اس کا ذکر کرتی تو وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہتے۔

میں کیا کروں یہ سبھی تمہارا عورتوں کا معاملہ ہے۔ خود ہی نبٹا لیا کرو۔ مجھے خواہ مخواہ اس میں ملوث نہ کیا کرو۔

خاوند بیوی کا اصولی مالک ہوتا ہے اور ہر طرح کے دکھ سکھ کا سانجھا بھی اگر وہ اپنے دکھ، غم اور من کا کرب اسے نہ شیئر کرے تو اور بھلا کس سے فریاد کرے کون سننے والا ہوتا ہے اور دکھ بانٹنے والا بھلا کہاں سے لائے اور اگر خاوند ہی نکھٹو اور اجڈ بن جائے تو اس گھر میں بیوی کی حیثیت ایک نوکرانی کی سی رہ جاتی ہے۔ اس سے سبھی رشتے ناطے چھین لیے جاتے ہیں۔ نوکرانی بھی ہر ماہ کے آخر پر سبھی نفرتوں، کدورتوں اور جلی کٹی کے عوض تنخواہ لے کر خوش ہو جاتی ہے۔ مگر..... فاطمہ وہ تو اس گھر کا ایک فرد تھی۔ مالک کی ملکیت کی حصہ دار اور ہر طرح کی ساتھی مگر اس سے سبھی حقوق اور سبھی رشتے چھینے جا رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہوئے بے پناہ دکھ، کرب اور اذیتیں محسوس کر رہی تھی۔

آخری دنوں تک اس کی ذمہ داریوں کا سلسلہ جاری رہا۔ دو تین بار اس کی طبیعت شدت سے خراب ہوئی اسے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا اور ہر بار لیڈی ڈاکٹر نے یہی کہا کہ اسے آرام کی اشد ضرورت ہے۔ ورنہ کیس میں پیچیدگی بھی ہوسکتی ہے۔

رحمان اس کی کوئی بھی بات سننے کو تیار نہ تھے اور فاطمہ کے بقیہ سسرال والوں میں وہ حس ہی نہیں تھی کہ اس کی تکلیف کو محسوس کرتے۔

ایک رات اس کی طبیعت خاصی خراب تھی اور وہ کھانا نہ بنا سکی۔ اس پر ساس صاحبہ نے وہ سنائیں کہ وہ کمرے کے کونے میں سر دے کر ڈھیروں روئی۔ اسی اثناء میں رحمان آئے اور انہوں نے اپنی ماں کو بولتے سن لیا مگر ان کے آنے پر ساس جی خاموش ہوگئیں۔ رحمان نے کپڑے تبدیل کیے اور اس کے پاس آ کر کہا۔

فاطمہ تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں تمہاری ماں کے پاس چھوڑ آؤں۔

میں نہیں جاؤں گی۔ یہیں کام کر کر کے مرنا چاہتی ہوں۔ نہیں چاہیے مجھے ایسی زندگی، اس کی آواز میں زمانے بھر کی تلخیاں نمایاں تھیں۔

فاطمہ! آنٹی کئی بار مجھ سے کہہ چکی ہیں کہ میں تمہیں آخری دنوں میں ان کے پاس چھوڑ دوں گھر کے حالات جیسے ہیں تمہارا چلے جانا ہی بہتر ہے۔ اس کی آواز میں نرمی تھی۔ تبھی وہ تیار ہوگئی۔ جب باہر آئے تو رحمان ٹیکسی لینے چلے گئے۔ کیونکہ گھر والوں نے گاڑی پہ جانے سے منع کر دیا تھا۔

ساس بولیں کہاں جارہی ہو بہو بیگم.....

امی کے گھر..... اس نے بھی رکھائی سے کہا۔ کچھ دن آرام کروں گی۔

یہاں تم سے کون سا بیگار لیا جاتا ہے وہ بولیں تو فاطمہ کا صبر جیسے جواب دے گیا۔

نہیں ماں جی! مجھ جیسا سسرال شاید ہی کسی لڑکی کو ملا ہوا تنا خیال رکھنے والا۔ خدا کرے آپ کی بیٹی شائستہ کو بھی ایسا ہی سسرال ملے..... اس کا سسرال بھی اس کا اتنا ہی خیال رکھے۔

میری بچی کو بددعا دیتی ہے کلموہی، منحوس وہ بلبلا گئی تھی اور وہ مسکرا کر باہر نکل گئی۔

اے اللہ۔ اس دنیا میں لوگ کیسا دھرا معیار رکھتے ہیں۔ دوسروں سے سلوک روا رکھتے ہوئے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہی کچھ کل کلاں کو ہماری بیٹیوں کے نصیب میں لکھا جائے۔ اور انہیں بھی ایسی ہی ساس اور نندوں سے واسطہ پڑے۔

☆☆☆

رحمان اسے ماں کے پاس چھوڑ آئے اور پھر لوٹ کر اس کی خبر ہی نہ لی اور پھر وقت آیا اور فاطمہ ہسپتال پہنچی۔ رحمان کو اس کی اطلاع ملی تو خاموشی سے چلے آئے۔ مگر ان کے گھر سے کوئی نہ آیا۔ مگر اس نے اس بات کو اپنے دل پر نہ لیا۔

کامیاب آپریشن کے بعد اسے ہوش آئی تو ماں اس کے سرہانے تھی۔

کیسا ہے میرا بچہ..... فاطمہ نے دھڑکتے دل سے پوچھا اور ادھر ادھر جھانکا۔

یہ دیکھو اپنے برابر میں..... خدا نے کتنی پیاری بیٹی دی ہے۔ ماں بولی۔

بیٹی..... اس کے اندر جیسے کسی چیز کی چبھن ہوئی۔ مگر جب اس نے بیٹی کی طرف دیکھا تو اسے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ وہ دنیا سے بے گانہ ہو کر اسے چومنے لگی۔ اسے ایسا ٹوٹ کر پیار آیا کہ وہ خود حیران رہ گئی۔ پھر اسے رحمان کا خیال آیا۔

اس کے ابو کہاں ہیں ماں..... وہ بھی یہیں ہیں بیٹی..... ماں نے گویا اسے دلاسہ دیا۔ مگر فاطمہ کی آنکھوں نے اسے کہیں نہ دیکھا۔ چند روز بعد اسے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا اور ماں اسے گھر لے آئی۔

کس قدر بے حس ہیں وہ لوگ جو بیٹی جیسی سات نعمتوں سے منہ موڑے اپنی خواہشوں اور امیدوں کی تکمیل میں زندگی گزار رہے ہیں۔ کیا انہوں نے بیٹیاں پیدا نہیں ہونے دیں۔ ہمیشہ ویسا نہیں ہوتا جو لوگ چاہتے ہیں کبھی کبھی جاگتی آنکھوں دیکھے سپنے بھی سراب ثابت ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں انسان اندر سے ٹوٹ جاتا ہے مگر خدا کے کسی کام میں دخل اندازی اس کے بس کی بات ہرگز نہیں۔ ماں کی سوچ اشکوؤں اور آہوں پہ آ کر دم توڑ گئی اور فاطمہ کے وجود کی سبھی رگیں پھڑکتی ہوئی جلترنگ سے بجانے لگیں۔

ماں..... تم ہی تو میرا واحد سرمایہ ہو۔ تم بھی ہمت ہارنے لگیں۔

نہیں بیٹی..... میں تو سوچ رہی تھی کہ تیرے سسرال سے تیری خبر گیری کو کوئی بھی نہیں آیا۔ ماں نے نگاہوں

میں آئے اشکوں کو دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

بہت دن بعد رحمان اسے لینے آئے تو جیسے اس کے من کے غنچے کھل اٹھے مگر اگلے ہی لمحے اس کی نگاہوں میں دھوئیں کے بادل چھا گئے۔ فاطمہ اس گھر میں تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ جہاں تمہیں بیٹا پیدا کرنے کی وارننگ دی گئی تھی اور اگر انہوں نے اسے قبول نہ کیا تو.....

جا بیٹا! پریشان نہ ہو رحمان سبھی کچھ سنبھال لے گا۔ ممتا کی آواز پہ وہ چونکی اور پھر نئے جذبے، نئی امنگ اور نئے خواب سجائے وہ رحمان کے ساتھ پھر سے اسی گھر میں چلی آئی۔ جو بزرگوں نے ہمیشہ کے لیے اس کا مسکن سونپا تھا۔ مگر چند روز کی دوری پر یہاں سبھی انداز بدلے بدلے سے تھے۔

بیٹی کی پیدائش پہ کوئی بھی خوش نہ تھا۔ ساس صاحبہ نے کمرے کی طرف جاتے روک کر بچی کو دیکھا اور سرسری انداز میں بولیں۔ بیٹی اچھی تو ہے مگر..... مگر کیا ماں۔ فاطمہ جیسے کانپ اٹھی۔

ہمیں تو بیٹا چاہیے تھا۔ اب فاطمہ کی زبان خاموش نہ رہ سکی۔

معاف کیجئے گا امی..... آپ نے شائستہ کی جگہ بیٹا کیوں نہیں پیدا کر لیا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگیں اور ساتھ ساتھ چلانے بھی لگیں۔ جیسے اپنے بیٹے کو شکایت کر رہی ہو۔ باہر رحمان بھی اونچا اونچا بول رہے تھے اور پھر وہ اندر آئے تو غصے میں کانپ رہے تھے۔ تمہیں کیا ضرورت تھی ماں جی سے اس طرح کی بات کرنے کی۔

رحمان! انہیں کیا ضرورت ہے میری بیٹی کے بارے میں ایسی بات کرنے کی۔ اگر انہیں اپنی بیٹی عزیز ہے تو مجھے بھی اپنی بیٹی پیاری ہے۔ فاطمہ نے بھی بلند آواز سے کہا۔ مجھ سے روز روز اس کلموہی کی تکرار نہیں سنی جاتی۔ اسے گھر سے نکال باہر کرو یا پھر ہم ماں بیٹی ہمیشہ کے لیے اس کٹھن زدہ ماحول میں نہیں رہ سکتیں۔

ماں..... سوچو! اب وہ اکیلی نہیں ہے میری بیٹی بھی ساتھ ہے۔

بیٹی..... اسے بھی ساتھ جاتا کرو۔ میں بیٹے کی پھر سے دھوم دھام سے شادی کروں گی۔

مگر..... ماں۔

اگر مگر کچھ نہیں رحمان اب تمہیں فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ اب اس کی زبان لمبی ہو چلی ہے۔ جو میرے قابو سے باہر ہے۔

فاطمہ سبھی باتیں دروازے کی اوٹ سے سن رہی تھی۔ اس کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا.....

آپ ہمیں ماں بیٹی کو نکال باہر کیوں نہیں کرتے اب دوسری بیوی ہی لانا۔ جس کی زبان دراز نہ ہو اور جو آپ کو بیٹے ہی پیدا کر کے دے۔ وہ جو ماں کو سمجھاتے ہوئے تھک چکا تھا۔ طیش میں آ کر فاطمہ کی طرف لپکا اور دو تین تھپڑ اس کے منہ پہ جڑ دیئے۔

تم اپنی بکواس بند نہیں کر سکتی۔ ابھی اور اسی وقت گھر سے نکل جاؤ۔ میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس نے اپنی بیٹی مینا کو اٹھایا اور ان ہی کپڑوں میں دھیرے دھیرے اپنے قدم باہر کی طرف بڑھا دیئے۔

آج واحد سہارا جسے مجازی خدا کا درجہ حاصل تھا وہ بھی اس سے چھن چکا تھا۔ پھر بھلا وہ کس کے سہارے ٹھہرتی۔ یوں روتی بلبلاتی وہ اپنی بیٹی کو سینے سے لگائے اسی دہلیز پر چلی آئی۔ جہاں اس کا بچپن اور پھر شباب کی سرگوشیاں ابھری تھیں۔ ماں وقتی طور پر تو اس کے گلے لگ کر دھاڑیں مارتے ہوئے اسے دلاسے دلا رہی تھی۔ مگر چند روز بعد ہی وہ اسی بات کو من میں بسائے جیسے صدیوں کی مریضہ بن گئیں اور پھر ایک روز اسے تنہا چھوڑ کر ابدی نیند جا سوئیں۔

اس کے لیے پوری دنیا اندھیر نگری بن گئی۔ مگر اس

نے ہمت نہ ہارتے ہوئے سبھی باتوں کو بالائے طاق رکھا اور اپنی قابلیت سے فائدہ اٹھا کر ایک نجی سکول میں ملازمت کر لی۔ اس کے سسرال سے ایک دو بار رحمان آئے مگر اب وہ اس گھٹن زدہ ماحول میں جانے کو ہرگز تیار نہ ہوئی۔ جہاں اس کی ذرا بھر بھی عزت نہ تھی اور پھر ایک روز طلاق کے کاغذات اس کا مقدر بن گئے۔ اس روز وہ ڈھیروں روئی مگر کاتب تقدیر اپنا قلم چلا چکا تھا اور اب سوائے صبر کے کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

آج جب مینا روکر اس کے پاس پہنچی تھی تو اس کی بوڑھی نگاہوں کے سامنے عمر بھر کی لکھی بپتا لہرانے لگی تھی۔ مگر ممتا کے ناطے وہ اسے بروقت کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اب اس کے اندر کی سوئی عورت جاگ اٹھی فاطمہ بیگم..... خود تو زندگی زمانے کے تھپیڑوں سے الجھتے ہوئے گزار چکی ہو۔ اس حرماں نصیب کی زیست تو تاریک ہونے سے بچا لو۔ اس رسم کو توڑ دو۔ یہ نہ ہو کہ آنے والے لمحوں میں میناں بھی طلاق یافتہ ماں کی طلاق یافتہ بیٹی کہلائے۔ اس وقت بیٹی کا جیون تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی ڈگمگاتی کشتی کو سنبھال بھی سکتی ہو اور اپنے ہاتھوں ڈبو بھی.....

یاد رکھو..... انسان کو بعض اوقات ناکردہ گناہوں کی سزا بھی بھگتنا پڑتی ہے۔ اسے خدا کی طرف سے آزمائش سمجھ کر صبر سے فیصلہ کرنا کہ وہ اپنے بندوں سے بہت محبت اور پیار کرتا ہے۔ تمہاری بیٹی کی راہ میں ہزاروں طوفان سہی مگر منزل تو ہے اور کس قدر بدنصیب ہیں وہ لوگ جو عمر بھر منزل کی تلاش میں پرخار اور اندھیری راہوں میں بھٹکتے ہوئے زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں۔

☆☆☆

وہ ایک نئے جذبے سے اٹھی اور مینا سے کہا..... بیٹی تیار ہو جاؤ..... ہم تمہارے گھر جا رہے ہیں۔ اس کے اندر کی سوئی ہوئی عورت جاگ اٹھی جسے اس نے عمر بھر تھپکیاں دے کر امیدوں اور خواہشوں کے سہارے سلایا تھا۔

امی ..... میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ بیٹی نے گویا احتجاج کیا۔

مگر فاطمہ نے لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر کہا۔ نہیں بیٹی..... ماں کو ایسا نہیں کہتے۔ اب میں ہوں نا..... تمہارے ساتھ..... ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔

وہ اس کا بازو تھامے اس کے اصل گھر تک لے آئی۔ سمدھن اور حمزہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہیں عزت سے بٹھایا۔ مینا کی ساس نے کچھ دیر منہ بنا کر طنزیہ گفتگو کی مگر فاطمہ بیگم کے سیدھے سادھے انداز نے انہیں بھی نرم لہجہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

چائے پانی کے بعد فاطمہ نے کہا.....!

بہن! میں نے اپنا سسرال چھوڑ کر کس قدر تنگدستی اور پسماندگی کی زندگی گزاری ہے۔ مگر..... میں اپنی بیٹی کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ آج احساس ہوا ہے۔ اگر غلطی ان لوگوں سے ہوئی تھی تو میں نے بھی غلطی کی تھی۔ اگر انہوں نے رشتے ناطے نہیں نبھائے تو میں نے بھی بیوی ہونے کا حق ادا نہیں کیا اور آج اس مقام پر پہنچی ہوں.....

بہن..... میں اپنی بیٹی کو اپنی والی غلطی ہرگز نہیں دہرانے دوں گی۔ اس لیے میں اسے یہاں تک لے آئی ہوں۔ یہ آپ کی بیٹی اور امانت ہے۔ اسے سنبھالنا آپ کا کام ہے۔ چند لمحے ماحول گھمبیر سا ہو گیا اور پھر فاطمہ بیگم آنسوؤں میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

نہیں بہن..... اب آپ ایسے ہرگز نہیں جائیں گی۔ اس کی سمدھن نے اس کا بازو تھام کر اسے گلے لگا لیا۔ آپ واقعی ایک اچھی اور سمجھدار خاتون ہیں۔ میں کوشش کروں گی کہ وہ غلطی ہرگز نہ دہراؤں جو آپ کی ساس نے کی تھی۔ میں تمہاری بیٹی کو عمر بھر اپنی بیٹی سمجھوں گی۔

فاطمہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر دیا۔

☆☆☆

محبت نہیں دھوکہ ہے

ریما نور رضوان

محبت کا دوسرا رخ خوبصورت حسین دھوکہ ہے جو آپ کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی ہے اور کبھی آپ کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے ہونے کا اتنا گہرا احساس دلاتی ہے کہ انسان کو لگتا ہے کہ وہ اپنی مٹھی میں سمندر کو قید کر سکتا ہے

تیری یاد نا آئے کچھ ایسا بتا دے مجھے
یا میرے درد کی کوئی دوا لا دے مجھے
فرہاد کا ہو جنوں یا مجنوں کا پاگل پن
سب ہوگا کوئی اپنا تو نظر آئے مجھے
میں اس طرح نہ مرتا تو اور کیا کرتا
جان چاہیے تھی جن کو بہت عزیز تھے مجھے
ہو سکتا ہے عبور پتا ہوا سحر ہو کہ جوان دریا
اس پار سے کوئی بلائے تو سہی مجھے
ہے مقدر کی ستم ظریفی یا میرا قصور ہے
جدھر وہ جس قدر بھاگا اماں کہیں نہ ملی مجھے
ارمان برسوں سے خفا ہیں ایک دوسرے سے ہم
ترس کھا کے کوئی میری نیند سے ملا دے مجھے

مزنہ! تو کیوں اس فضول محبت نامی شے پر اپنا وقت برباد کر رہی ہے۔ کیوں خاردار راہوں کی مسافر بن رہی ہے فائنل سمسٹر ہونے والے ہیں پڑھائی پر دھیان دے تو اپنی کلاس کی سب سے ہونہار ذہین طلبہ ہے۔

ارینہ مزنہ کو میسج کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور بے اختیار اسے لتاڑ بھی رہی تھی۔

ارینہ! تیری زندگی تو روکھی پھیکی ہے بے رنگ گزر رہی ہے۔ تو کیوں میری رنگین زندگی دیکھ کے جل رہی

ہے۔مزنہ تلخی سے بولی تھی۔

مزنہ افسوس ہے کہ تو اپنی بیسٹ فرینڈ پہ شک کر رہی ہے۔میں کیوں تیری خوشیوں سے جلوں گی۔حقیقی خوشی وہی ہے جو سیدھے راستوں پر چل کر حاصل ہوتی ہے غلط راستوں پر چل کر جو خوشی حاصل ہو وہ دیر پا نہیں ہوتی۔ ارینہ تاسف سے بولی۔

ارینہ!اذہان سچ کہتا ہے تو ساتھ نبھانے والی دوست نہیں ہے تجھے ہماری محبت نظر نہیں آتی بس لیکچر دیتی رہتی ہے۔ہم ایک دوسرے سے بے حد، بے پناہ، بے حساب محبت کرتے ہیں۔

مزنہ احساس تفخر میں گھری بول رہی تھی۔

محبت معتبر معصوم پاکیزہ جذبہ ہے۔گلی کوچے سڑکوں پر جن محبتوں کا سر عام اقرار کیا جاتا ہے۔وہی محبتیں ذلتوں، بدنامیوں، رسوائیوں کا سبب بنتی ہیں۔لڑکیوں کی عزت کی چادر بے داغ اجلی صاف شفاف ہونی چاہیے۔ وقت آنے پر محبت نامی ستارے خود ہی لڑکیوں کے آنچل پر آ کے جھلملانے لگتے ہیں۔

ارینہ تضحیک آمیز لہجے میں بولی تھی۔

ارینہ!ہم کوئی انوکھے نہیں کر رہے ہیں ساری دنیا ہی محبت و عاشقی میں اپنی خواہشات پوری کر رہی ہے۔ میرا دل بھی جذبوں بھرا کسی کی پر خلوص چاہت کا منتظر تھا۔یہ انتظار اذہان الحق نے پورا کر دیا ہے میں خوش و مطمئن ہوں کہ میں نے ہمسفر کے انتخاب میں دھوکہ نہیں کھایا۔اذہان چاہنے والا، خیال رکھنے والا انسان ہے۔مزنہ اپنا ہی راگ الاپ رہی تھی۔

مزنہ!چچی جی کو علم ہے تمہاری خالص محبت کا؟

ارینہ کا انداز استعجابیہ تھا۔

نہیں مما کو نہیں پتا۔۔۔مزنہ دھیرے سے بولی۔

کب بتا رہی ہو چچی جی کو۔؟ ارینہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

جلد بتا دوں گی۔مزنہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولی تھی۔

مزنہ!ہماری برادری میں شادی باہر نہیں کی جاتی۔ تیری شادی ممکن ہے اذہان صاحب سے کر دی جائے گی۔ارینہ کا لب ولہجہ تفتیشی تھا۔

مزنہ کے دل میں یہی سوال بار بار سر اٹھاتا تھا کہ محبت کی منزل شادی ہوتی ہے کیا اس کی اور اذہان کی شادی ہو پائے گی۔

آج ارینہ سوالات کر رہی تھی۔

ارینہ!تجھے ساتھ دینا ہوگا مجھے نہیں پتہ ہماری شادی ہوگی یا نہیں۔

مزنہ نے ارینہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر لگاوٹ بھرے انداز میں کہا تھا۔

☆☆☆

مزنہ!اگر تمہارے گھر والے نہ مانے تو تم بھاگ کر شادی کرو گی ناں مجھ سے، میں تمہارے بغیر اک پل اک منٹ نہیں رہ سکتا۔مر جاؤں گا تم بن۔

اذہان چاہت بھرے انداز میں استفسار کر رہا تھا۔۔

اذہان!مما کہتی ہیں معاشرہ ایسی لڑکیوں کو کبھی با عزت، با کردار تسلیم نہیں کرتا جن کے قدم اپنے رسم و رواج کے خلاف ہو کر رات کی تاریکی میں دہلیز عبور کر جاتے ہیں۔مزنہ سنجیدگی سے بول رہی تھی۔

مزنہ!نبھا نہیں سکتی تھی تو اس محبت کا آغاز کیوں کیا تھا۔اذہان خفگی سے بولا۔

اذہان! پلیز اتنے روکھے پھیکے انداز میں بات نہ کرو۔مزنہ ملتجی لہجے میں بولی۔

جنہیں ہم چاہتے ہیں ان کے پیار و محبت کے لہجے کے منتظر رہتے ہیں سماعتیں پیار بھری سرگوشیوں کی منتظر رہتی ہیں۔

مزنہ تم میری تھی اور ہمیشہ رہو گی یہ بات تم ہمیشہ یاد رکھنا۔اذہان کا ٹھوس لہجہ بہت کچھ باور کروا رہا تھا۔

لائن کٹ چکی تھی مزنہ اضطرابی کیفیت میں مبتلا

پورے کمرے میں چکر کاٹ رہی تھی۔

اے مولا کریم! تو ہی دلوں کی چاہتوں کا آمین ہے، گواہ ہے۔

اے معبود برحق۔ ہمیں ملا دے ہماری راہیں ہموار کردے۔

مزنہ رات کے آخری پہر میں رب کے حضور مناجات کررہی تھی۔

رات کی تنہائی ہے
چاروں طرف اندھیرا ہے
ہر اک محوخواب ہے
میں تمہاری محبت میں دیوانی
دنیا سے بیگانی
رب العزت سے تمہیں
مانگ رہی ہوں

مزنہ ڈائری میں حال دل لکھ رہی تھی۔ رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔

☆☆☆

او اذہان! گھامڑ چھ ماہ ہو چکے ہیں اس لڑکی کے پیچھے خوار ہوتے ہوئے باس تو یہ بھی کہہ رہے ہیں اذہان اس کے ساتھ سرلیس ہے اس مزنہ نامی لڑکی کو فروخت نہیں کرے گا اس کے ساتھ گھر بسانے کا ارادہ ہے۔

احتشام فرنچ فرائز کھاتے ہوئے مصروف انداز میں بولا۔

شام یار۔ یہ مزنہ تو سیدھی سادی ہے مگر اس کی تایازاد بڑی چالاک ہے مزنہ تو میری محبت میں پور پور ڈوب چکی ہے مگر اس کی تایازاد ارینہ لیکچر دے دے کر محبت سے حقیقت میں لا پٹختی ہے۔

اذہان سنجیدگی سے بولا تھا۔

میں تو استاد کو چھ ماہ میں چار لڑکیاں دے چکا ہوں سیٹھ کو اتنا معاوضہ ملا ہے کہ مجھے بھی ٹھیک ٹھاک دیے ہیں۔ احتشام رازداری سے بولا تھا۔

احتشام اور اذہان برگر پوائنٹ میں بیٹھے برگر کھا رہے تھے اور باتوں میں بھی مصروف تھے۔

ارینہ ان کے بالکل پیچھے والی چیئر پر ہی اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی تھی۔

میرا شک سچ تھا یہ دھوکے باز نکلا۔

ارینہ سر جھکائے بیٹھی تھی کہ کہیں اذہان اسے دیکھ نہ لے۔

حیدر! یہ دونوں جو جا رہے ہیں ناں ان میں ایک سے اپنی مزنہ محبت کرتی ہے یہ فراڈ ہے مجھے شک تھا آج اس کی باتوں نے تصدیق کر دی ہے اس کا تعلق ایسے گینگ سے ہے جو سیدھی سادی لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھنسا کر باہر کے ممالک میں فروخت کر دیتے ہیں۔ اف اللہ مجھے تو بہت فکر ہو رہی ہے اگر میں نے مزنہ کی سخت لہجے میں برین واشنگ نہ کی ہوتی تو یہ بھی اب تک اپنے مشن میں کامیاب ہو چکا ہوتا۔

ارینہ پریشانی و بے قراری سے کہہ رہی تھی۔

تم فکر نہ کرو ہماری مزنہ محفوظ ہے شکر الحمدللہ کہ سچائی سے آگاہی ہوگئی ہے۔

حیدر تشکر آمیز لہجے میں بولا تھا۔

ہاں حیدر کرم ہے اللہ کا کہ اللہ پاک نے ہمیں سچائی سے آگاہ کیا۔ مزنہ تو محفوظ ہے مگر اب یہ اور اس کا گینگ محفوظ نہیں ہے یہ تو پلاننگ کر کے بھولی بھالی لڑکیوں کی زندگی برباد کرتے ہیں ناں دیکھنا ان ہی بھولی بھالی لڑکیوں کی وجہ سے ان کی زندگی محفوظ نہیں رہے گی میں کوئی پلاننگ کرتی ہوں۔

ارینہ پرسوچ لہجے میں بولی۔

مزنہ کیا کر رہی ہے۔ ارینہ نے مزنہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

مزنہ نے جھٹ سے اپنے آنسو پلو سے صاف کیے۔

ہیں۔۔۔ مزنہ کیا ہوا۔۔۔؟؟

ارینہ دوڑ کر مزنہ کے پاس آئی۔۔

ارینہ۔۔۔اذہان ملنا چاہتا ہے۔یونیورسٹی سے باہر۔

مزنہ آنسو پونچھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔۔

تو۔۔۔مل لے۔۔۔ارینہ قدرے توقف کے بعد مسکرا کر بولی تھی۔

سچی۔۔۔مزنہ چہک کر بولی تھی۔

ہوں۔۔۔ارینہ نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

یار۔۔۔تیرا بہت بہت شکریہ۔۔۔مزنہ کا لہجہ تشکر آمیز تھا۔

مزنہ شرمندہ نہ کر۔۔۔

☆☆☆

اذہان تم غلط تھے ارینہ کے لیے تم کہتے تھے وہ ساتھ نبھانے والی نہیں ہے دیکھو وہ ہماری محبت کی راہ میں رکاوٹ حائل کرنے کے بجائے ہمارا ساتھ نبھا رہی ہے۔

رات کے پچھلے پہر مزنہ اس سے محو گفتگو تھی۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے تمہاری دوست کو میری سچی محبت کا اعتبار ہوا ہے ورنہ شکی رہتی تھی اور تمہیں بھی ورغلاتی رہتی تھی۔اذہان مسکرا کر بولا تھا۔

اب میری منزل دور نہیں میں چند دن میں ہی مزنہ کو سیٹھ کے حوالے کر کے پیسے لے لوں گا اور پھر کوئی نئی لڑکی ڈھونڈ لوں گا۔اذہان مختلف سوچوں میں ڈوبا تھا۔

رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی۔اذہان میں تم سے ملنے ہوٹل نہیں آسکتی۔

ارینہ نے مزنہ کو ہوٹل جانے سے منع کیا تھا۔

ارینہ نے مزنہ کو پبلک پیلس پر ملنے کا کہا تھا۔اذہان تم مقامی پارک آجاؤ ناں۔مزنہ آہستگی سے بولی تھی۔

تم اکیلی آؤ گی ناں۔۔۔اذہان نے یکدم سوال کیا تھا۔

مزنہ چونکی تھی اور پھر بتانے لگی تھی۔

نہیں ارینہ میری دوست میری رازدار میرے ساتھ ہوگی۔

اوئے ہوئے۔اذہان گڈ گڈ۔۔مزنہ پر اتنا وقت لگا اب دوسری فری میں مل جائے گی۔ارینہ صاحبہ کو بھی لگے ہاتھوں فروخت کر دیں گے۔

اذہان۔۔۔کیا ہوا۔۔؟اذہان کی خاموشی پر مزنہ نے پوچھا تھا۔

کچھ نہیں۔۔۔میں شام 5 بجے پہنچ جاؤں گا۔اذہان مسکرا کر بولا۔

ارینہ وہ دیکھا اذہان آگیا۔مزنہ چہک کر بولی۔

ارینہ اور وہ مقامی پارک میں بینچ پر بیٹھی باتیں کر رہی تھی مزنہ کی نظریں بار بار مین گیٹ کی طرف اٹھ رہی تھی۔

مزنہ اذہان کے ساتھ یہ چار لوگ اور کون ہیں ارینہ نے مزنہ کی توجہ دلائی۔

یار ارینہ جو بھی ہیں ہمیں کیا لینا دینا۔

مزنہ لاپروائی سے بولی تھی۔

ارینہ نے درختوں کی طرف حیدر کو دیکھا جو دو پولیس والوں کے ساتھ چھپ کر بیٹھا تھا جو سول وردی میں تھے۔

سیٹھ جی یہ دونوں لڑکیاں ہیں۔اذہان نے دور سے ہی اشارہ کیا۔

اذہان۔واہ واہ اتنی ترقی کر لی کہ ایک وقت میں دو دو لڑکیاں دے رہے ہو۔سیٹھ اکبر تفخر سے بولا تھا۔

مزنہ۔۔یہ میرے بڑے بھائی ہیں انہیں ہمارا یوں سرے عام ملنا پسند نہیں ہے یہ ہمیں گھر لے جانے آئے ہیں۔

اذہان نے اپنے ساتھ آئے آدمیوں سے ایک کا تعارف کروایا تھا۔

مزنہ خوشی سے مسکرائی تھی۔۔ارینہ اس کی چالاکی پر حیران ہوئی تھی۔

ہم گھر چل کر بات کریں؟

سیٹھ اکبر نے سلام دعا کرنے کے بعد اجازت طلب کی۔

نہیں۔مزنہ ارینہ سے پہلے بول پڑی تھی۔

مزنہ۔۔۔ چلتے ہیں ناں۔اذہان مزنہ کی طرف دیکھ کر چاہت سے بولا تھا۔

ارینہ۔۔ چلتے ہیں ناں۔۔مزنہ بضد ہوئی تھی۔

مسٹر اذہان۔۔بند کرو یہ ڈرامہ مجھے تمہاری اصلیت پتا چل چکی ہے۔ارینہ سختی سے بولی تھی۔

کک۔۔۔کک۔۔کیا کہہ رہی ہو۔۔؟؟

اذہان گڑبڑا گیا تھا۔

جی ہاں۔۔۔مسٹر اذہان۔۔آپ ایسے گینگ کا حصہ ہو جو لڑکیوں کو اغوا کر کے یا محبت میں پھنسا کر بیرون ملک فروخت کر دیتے ہو۔

ارینہ نے یکلخت سچائی سے پردہ اٹھایا تھا۔

ارینہ کیا کہہ رہی ہے پاگل ہوگئی ہے؟

مزنہ کو ارینہ کی دماغی حالت پر شبہ ہوا تھا۔

مزنہ۔۔جو کہہ رہی ہوں سچ کہہ رہی ہوں۔

ارینہ ٹھوس لہجے میں بولی تھی۔۔اذہان سمیت چاروں آدمیوں کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اذہان نے مزنہ کو ساتھ کھڑے سلمان کی طرف دھکیلا تھا۔خود اس نے سختی سے ارینہ کا بازو دبوچا۔

تو بہت ہوشیار نکلی ہے۔حقیقت جان ہی گئی ہے تو چل ہمارے ساتھ۔

اذہان خباثت سے بولا تھا مزنہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اذہان کی طرف دیکھ رہی تھی جو نجانے کیا کیا بول رہا تھا۔لب ولہجہ انداز گفتگو بھی تبدیل تھا۔۔وہ لوگ ارینہ و مزنہ کو گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔

اذہان تم دھوکہ باز ہو ارینہ صحیح کہتی تھی میں نے آنکھ بند کر کے تم پر بھروسہ کیا تمہیں سچے دل سے چاہا آنکھ بند کر کے تم پر بھروسہ کیا۔بدلے میں مجھے دھوکہ ملا۔مزنہ غم و غصے سے چلا رہی تھی۔

مزنہ تم لڑکیاں ہوتی ہی بے وقوف ہو ذرا سا مسکرا دو ذرا سا محبت و چاہت بھرے انداز میں بات کر لو تم لوگ اپنی عزت اپنا مان سب کچھ قربان کر دیتی ہو۔

اذہان لاپرواہی سے بولا تھا۔

اذہان پلیز ہمیں جانے دو۔پلیز ہمیں جانے دو۔

مزنہ کا لہجہ بھیگا اور ملتجی تھا۔

مزنہ میری جان جاؤ گی ناں۔سیٹھ اکبر کے گھر بندوبست ہے ان دونوں میڈم صاحبہ کا۔

اذہان سیٹھ اکبر کو دیکھ کر مکاری سے بولا تھا۔

ان دونوں کو دوبئی جانا ہے سیٹھ اکبر نے جواب دیا۔

مزنہ اندر ہی اندر لرز رہی تھی ارینہ پرسکون و مطمئن تھی۔

اے ہوشیار بول نہ چپ کیوں ہے جب تجھے میری حقیقت معلوم ہوگئی تھی تو تم نے اپنی سہیلی کو کیوں نہیں بتایا بجائے اپنی دوست کو بچانے کے تو خود بھی یہاں پھنس گئی ہے۔

اذہان ارینہ کی خاموشی پر چونک کر بولا تھا۔

تجھے اور تیرے گینگ کو رنگ ہاتھوں پکڑوانا میرا مقصد تھا۔ارینہ دوبدو بولی۔

کک۔۔۔کیا مطلب۔۔۔۔؟سیٹھ اکبر ہٹپٹا گیا۔

وہ دیکھو پولیس اہلکار اور میرا شوہر آ رہے ہیں۔

مزنہ کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔سامنے کا منظر دھندلا گیا۔۔مزنہ نے آنکھیں صاف کی۔

بھائی۔۔۔مزنہ خوشی سے حیدر کو دیکھ کر چلائی۔۔

پولیس نے اذہان اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں پہنائی۔

مزنہ حیدر کے گلے لگی زاروقطار رو رہی تھی۔

بھائی پلیز مجھے معاف کر دیں۔۔مزنہ بس کرو چپ ہو جاؤ۔

حیدر نے اپنی اکلوتی لاڈلی چہیتی بہن کے آنسو پونچھے تھے۔

سر! ان لوگوں کی اتنی کٹائی کرنا کہ یہ اپنے باقی گینگ کا بھی صحیح صحیح بتادیں بیرون ملک بھی ان کے اثر و رسوخ ہیں وہاں کے بھی تمام گروہ گرفتار کرلیں جو معصوم بھولی بھالی لڑکیوں کو محبت نامی جال میں پھنسا کر ان کی زندگیوں کو تاریک بنادیتے ہیں۔

حیدر انسپکٹر سے سنجیدگی سے بولا۔

سر! آپ بے فکر رہیں۔ ہمیں سب معلوم ہے کہ یہ لوگ کیسے سچائی اگلیں گے جسمانی ریمانڈ اچھے اچھوں کے چھکے چھڑوادیتے ہیں۔ خود ہی سچائی بتادیتے ہیں۔

انسپکٹر صاحب پروفیشنل انداز میں بولے وہ اذہان اور اس کے ساتھیوں کو لے کر جارہے تھے۔

اذہان مزنہ کو بغور دیکھ رہا تھا۔

مزنہ نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔

واقعی جب ہم اپنے کو چھوڑ کر غیروں پر بھروسہ کرتے ہیں تو یہ بھروسہ جلد ہی ٹوٹ جاتا ہے دھوکہ کی صورت میں اعتبار ٹوٹ جاتا ہے۔ مزنہ سوچوں میں گم تھی۔ مزنہ پریشان نہ ہو۔ ارینہ اسے گلے لگا کر بولی۔

ارینہ تم نے بتایا کیوں نہیں مجھے کہ اذہان دھوکے باز ہے۔

مزنہ میں بتاتی تو تو کبھی میرا اعتبار نہ کرتی تجھے میں غلط لگتی۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ سچائی سامنے آگئی تو تجھے خود ہی معلوم ہوجائے گا کہ کون غلط تھا اور کون صحیح۔

ارینہ تو میری بچپن کی دوست راز دار ہے میں کیوں تیری بات کا اعتبار نہ کرتی۔ مزنہ نے شکایتی انداز میں کہا۔ مزنہ تجھے اکثر سمجھایا۔ تو نے کہا میں اس اذہان اور اذہان مجھ سے بے پناہ خالص سچی اور بے حد محبت کرتی ہوں۔

زندگی میں صرف ایک چیز ایسی ہے جو انسان کو جی بھر کر خوار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور وہ ہے محبت۔۔۔۔ تجھے اس دھوکہ باز پر اتنا بھروسہ تھا کہ تو میری ایک بات ماننے کو تیار نہ تھی۔ میں تو تجھے روز اول سے سمجھا رہی تھی کہ یہ محبت نہیں دھوکہ ہے۔ یہ محبت خوبصورت حسین دھوکہ ہے جو آپ کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی ہے اور کبھی آپ کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے ہونے کا اتنا گہرا احساس دلاتی ہے کہ انسان کو لگتا ہے کہ وہ اپنی مٹھی میں سمندر کو قید کرسکتا ہے۔

اور کبھی کبھی آپ کو یقین کی سیڑھی سے اتنی زور سے دھکا دیتی ہے جیسے آج تجھے دھکا ملا ہے۔ پھر انسان ساری زندگی سر اٹھا کر چلنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔

جب میرے سامنے سچائی آئی تو میں بھی حیرت زدہ تھی پھر میں نے ساری سچائی حیدر کو بتائی اور یہ پلان بنایا۔ اذہان کا گروہ پتا نہیں آج تک کتنی لڑکیوں کو فروخت کرچکا ہوگا جب میں نے اذہان کے منہ سے سچائی سنی تو حیران و پریشان رہ گئی۔ ارینہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ مزنہ رودی تھی۔

ارینہ! آج اگر تم میرے ساتھ نہ ہوتی میں تجھے بتائے بغیر اذہان سے ملنے آجاتی تو آج.....

مزنہ کہتے کہتے رودی تھی۔ ارینہ محبت سے بولی۔

مزنہ زندگی میں دوست کا ہونا بہت ضروری ہے کوئی تو ایسا ہونا چاہئے جس سے ہم اپنی تمام پریشانیاں تکلیفیں بنا ہچکچاہٹ کہہ سکیں اگر ہم اپنے دل کی باتیں کسی سے نہیں کہتے تو ہم مختلف سوچوں میں گم رہتے ہیں خاموشی سے اندر ہی اندر گھٹتے رہتے ہیں دل کی باتیں کسی اچھے دوست سے ضرور کرنا چاہیے۔

میں تیری بچپن کی دوست، ہمراز، ہم عمر تھی تو تو نے مجھے ہر بات میں شامل رکھا بہت سی لڑکیاں دل کی باتیں ہر اک سے چھپالیتی ہیں پھر وہ تنہا رہ جاتی ہیں اگر ہم لڑکیاں ہمت حوصلہ سے کام لیں تو یہ اذہان نما بھیڑیے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بلکہ ہم اذہان نما ناسور کو برائی کو معاشرے سے ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

☆☆☆☆

ایک سوال.....؟

نزہت جبین ضیاء

میں نے لمبی سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ ابھی تو پیشنٹس کی لمبی لائن تھی۔ تب کہیں جا کر ہمارا نمبر آنا تھا۔ یہ شہر کے مشہور ڈاکٹر کا کلینک تھا۔ جہاں پر مختلف ڈاکٹرز مختلف بیماریوں کے حوالے سے علاج کرتے تھے۔

جنرل اور بڑا ہاسپٹل تھا۔ میں آج اپنی ساتھی ٹیچر کے ساتھ اس کی امی کے چیک اپ کے سلسلے میں یہاں آئی تھی۔

آصفہ نور میری بہت اچھی دوست تھی ہم گزشتہ چھ سال سے ایک ہی سکول میں درس و تدریس کے شعبے سے منسلک تھے۔ آصف کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ گھر کی بڑی اور واحد کفیل بھی تھی۔ اس سے چھوٹی دو بہنیں تھیں جو ابھی سکول میں پڑھتی تھیں۔ اس لیے والد کے انتقال کے بعد گھر اور گھر والوں کی ذمے داری آصفہ کے کندھوں پر آ پڑی تھی۔

آصفہ کی والدہ کو کچھ عرصہ سے پیٹ کے ایک سائیڈ پر درد کی شکایت تھی۔ کبھی یہ درد کمر کی طرف محسوس ہوتا۔ آصفہ نے ادھر ادھر دکھایا لیکن مجھے لگا یہ گردے کی تکلیف ہو سکتی ہے۔ تب میں نے ان ڈاکٹر کے بارے میں بتایا کیونکہ میں نے اپنے شوہر کی زبانی اس ڈاکٹر کی کافی تعریف سنی تھی۔ اس لیے آج سکول سے فارغ ہو کر میں آصفہ کے گھر گئی تھی اور اس کی والدہ کو لے کر ہم یہاں آئے تھے۔

آصفہ بے چاری بہت دکھی تھی اس لیے مجھے دوستی کے ساتھ ساتھ اس سے ہمدردی اور انسیت بھی ہو گئی تھی۔

شکیلہ آنٹی حسب عادت ویٹنگ کے ٹائم کو تسبیح پڑھتے ہوئے کاٹ رہیں تھیں۔ آصفہ اور میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ شکیلہ آنٹی کا نام پکارا گیا تو آصفہ ان کو لے کر ڈاکٹر کے روم میں چلی گئی اور میں وہیں بیٹھ کر اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ تب میں نے دیکھا کہ ایک حواس باختہ سی خاتون انیس بیس سال کی خوب صورت سی لڑکی کو لے کر تیزی سے اندر آئیں۔

لڑکی کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور وہ خاصی نڈھال تھی۔ سب کی توجہ ان لوگوں کی طرف مرکوز ہو گئی۔ خاتون زاروقطار رو رہی تھی۔ عملہ میں ہلچل آ گئی اور لڑکی کو لے کر آپریشن تھیٹر کی طرف بڑھ گئے اور وہ خاتون وہیں کرسی پر بیٹھ کر رونے لگیں۔

دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھائے وہ مسلسل رو رہی تھیں۔ میں ان کی تکلیف کو محسوس کر رہی تھی۔ اس لیے اٹھ کر ان کے پاس آ گئی۔

''کیا ہوا آنٹی؟ یہ بچی آپ کی کیا لگتی ہے اور اسے چوٹ کیسے لگی.....؟'' میرے سوال پر انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ اداسی اور چہرے پر دکھ کے گھمبیر سائے تھے۔

''میری بیٹی ہے..... سیڑھیوں سے گر گئی ہے۔'' ان کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ جیسے وہ کچھ چھپانا چاہ رہی ہوں۔ میں نے بغور ان کے چہرے کو دیکھا۔ زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

''اللہ پاک بہتر کرے گا۔ آپ پریشان مت ہوں دعا کریں۔'' میں نے آہستہ سے ان کے ہاتھ تھپتھپا کر تسلی دی۔ تو وہ سر ہلا کر رہ گئیں۔ اسی وقت ایک نوجوان اور ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اندر آئے۔ خاتون کو دیکھ کر تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔

''کیا تماشا لگا رکھا ہے یہ.....؟ کیوں بلایا ہمیں..... مرجانے دیتیں اس ناہنجار کو..... اس کا مرجانا ہی ہمارے لیے بہتر ہے۔ کمبخت عذاب بن گئی ہے۔'' آدمی نے نفرت سے کہتے ہوئے عورت کو مخاطب کیا۔

گو کہ آواز اتنی اونچی نہ تھی مگر میں وہاں سے اٹھتے اٹھتے سب کچھ واضح طور پر سن چکی تھی۔

خدا کے واسطے چپ کرو ابھی ایسی باتیں تو نہ کرو، میری بچی کو جینے دو۔ وہ عورت گڑگڑا کر ان سے مخاطب تھی۔

اتنی دیر میں آصفہ، شکیلہ آنٹی کا چیک اپ کروا کر واپس آ چکی تھی۔ میں ان لوگوں اور ان کے درمیان ہونے والی بات چیت میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

یہ کون ہیں؟ کیا مسئلہ ہے؟ اور یہ لوگ ایک لڑکی کے لیے ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ یہ سارے سوالات میرے ذہن میں گڈمڈ کرنے لگے۔

''کیا ہوا.....؟ کیا کہا ڈاکٹر نے.....؟'' میں نے آصفہ سے پوچھا۔

''کچھ ٹیسٹ وغیرہ لکھے ہیں اور ایک ہفتے کی دوا دی ہے ابھی تو..... نیکسٹ ویک پھر آنا ہے۔'' آصفہ نے بتایا اور ساتھ ہی مجھے غور سے دیکھا۔

''کیا ہوا رخسار.....؟ تم کیوں پریشان سی لگ رہی ہو.....؟'' چلو بتاتی ہوں میں نے اچٹتی سی نگاہ خاتون پر ڈالی اور ہم لوگ باہر کی طرف آ گئے۔ جہاں ٹیکسی ہماری منتظر تھی۔

میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر آصفہ کو تفصیل بتائی۔

''اوہ!'' آصفہ نے بھی افسوس کا اظہار کیا۔

''چھوڑو یار! تم کیوں اتنی پریشان ہو کیا پتہ اندرونی کیا مسائل ہیں؟ لڑکی پتہ نہیں کیسی ہو؟..... شاید واقعی اس کی غلطی ہو..... باپ اور بھائی ہوں گے جو غیرت میں آ کر ایسی باتیں کر رہے ہوں گے۔'' مجھے مسلسل گم سم دیکھ کر آصفہ نے میرا دھیان بٹانا چاہا اور میں نے ہونٹ کاٹ کر سر ہلایا۔

مگر میری نظروں سے ایک لمحے کے لیے بھی اس لڑکی کا خون میں بھرا چہرہ اور اس عورت کی بے بس آنکھیں اوجھل نہ ہوئی تھیں۔

میں ہاسپٹل سے سیدھا اپنے گھر پر اتری۔

''یار بہت بہت شکریہ، تم نے مجھے اتنا ٹائم دیا اور امی کے لیے اتنی پریشان ہوئیں۔'' آصفہ کی بات پر میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

''پاگل ہو گئی ہو کیا.....؟ شکریہ کس بات کا.....؟ تمہاری امی میری امی کی طرح ہی ہیں اور دوستی میں ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔ اگر آئندہ ''شکریہ'' کیا تو بات نہیں کروں گی۔'' میری مصنوعی ناراضگی پر اس نے تشکرانہ نظروں سے دیکھا۔

''اوکے میڈم..... شکریہ سود سمیت واپس کر دو۔'' میں نے اس کے گالوں پر پیار سے چپت لگائی۔

یہ لو واپس کر دیا۔ ''اچھا آنٹی! دوائیں پابندی سے لیتی رہیں۔ ٹیسٹ بھی کروا لیں۔ اللہ پاک جلدی سے آپ کو اچھا کر دے۔ السلام علیکم'' میں نے اترتے

ہوئے شکیلہ آنٹی کو مخاطب کیا اور انہوں نے میرے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر ڈھیروں دعائیں دے دیں۔

میں ٹیکسی سے اتر کر گھر کی جانب بڑھ گئی اور ٹیکسی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ گھر آ کر بھی میں ان لوگوں میں الجھی رہی۔ میں نے عباس (شوہر) سے بھی اس ملاقات کا ذکر کیا اور عباس نے ہمیشہ کی طرح میرا مذاق اڑایا۔

کچھ دن گزرے زندگی اپنے معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ میرے وہی صبح و شام سکول، گھر اور گھر کی ذمہ داریاں چل رہی تھیں۔ شکیلہ آنٹی کا علاج بھی باقاعدگی سے ہو رہا تھا۔ ان کے گردے میں انفکشن ہو گیا تھا۔ اس لیے کچھ احتیاط اور ادویات کی باقاعدہ استعمال سے کافی افاقہ ہوا تھا۔

اس روز سکول کی چھٹی تھی۔ بچوں نے ضد پکڑی کہ کہیں گھومنے چلیں میں اور عباس اپنے چاروں بچوں روحہ، اصفا، شجاع اور صبور کے ساتھ گھومنے کے لیے نکل گئے۔ یہ پارک بہت خوب صورت تھا۔ بچوں کے لیے جھولے وغیرہ تھے۔ میں چھوٹی بیٹی روحہ کو لے کر سلائیڈ کی طرف آئی تو سامنے سے روحہ کی ہم عمر ننھی سی بچی کو دیکھ کر مجھے پیار آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک خاتون کھڑی تھیں جن کی پشت ہماری جانب تھی۔ اس بچی سے تھوڑی سی بڑی ایک اور بچی تھی۔ جو سامنے پوپ کارن والے سے پاپ کارن خرید رہی تھی اور اس خاتون کا رخ اس بچی کی طرف تھا۔ دفعتاً وہ خاتون پلٹیں اور عین میرے سامنے آ گئیں۔ میری نظر ان کی جانب اٹھی ان کا چہرہ کچھ شناسا سا لگا جیسے پہلے کبھی ان کو دیکھا ہو.....

میں نے ذہن پر زور ڈالا..... اچانک میرے ذہن ہاسپٹل والی وہ سہ پہر کی یاد تازہ ہو گئی۔ جب میں شکیلہ آنٹی اور آصفہ کے ساتھ ڈاکٹر جنید کے کلینک گئی تھی اور وہاں پر خاتون آئیں تھیں ان کی بیٹی کا سر ٹھپا ہوا۔

اوہ! میں ان کو اتنی محویت دیکھ رہی تھا کہ وہ خود حیران تھیں۔

''اسلام علیکم!'' میں نے جھٹ سے سلام کر دیا۔

''وعلیکم السلام'' انہوں نے مجھے بغور دیکھا ان کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہ تھا۔

آپ نے مجھے پہچانا.....؟ میرے سوال پر انہوں نے حیرت سے مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور نفی میں سر ہلایا معاف کرنا! میں آپ کو نہیں جانتی۔'' میں خجل سی ہو گئی۔

تین چار ماہ پہلے ہم لوگ ہاسپٹل میں ملے تھے آپ کی بیٹی کو لے کر آئیں نہیں غالباً وہ سیڑھیوں سے گری تھی..... اب کیسی ہیں وہ.....؟ میں نے یاد دلایا۔

''اوہ..... ہاں.....'' ان کے چہرے کا رنگ یک دم ہی بدل گیا۔ دکھ کی چادر سی تن گئی اور آنکھوں میں اداسی تیرنے لگی۔

''وہ..... وہ..... مر گئی۔'' آواز بہ مشکل ان کے حلق سے نکلی۔

''کیا..... کیا.....؟'' ایک لمحے کے اندر میرے اندر تک دکھ سرایت کر گیا اور میں نے ہلکی سی چیخ ماری۔

''مگر..... وہ تو جوان تھی بالکل..... کب..... کیسے اور اسے کیا ہوا تھا.....؟'' میرے لہجے میں دکھ بول رہے تھے اور دل اس حقیقت سے انکاری تھا۔ فطری تجسس اور ہمدردی کی وجہ سے میں بھونچکا رہ گئی تھی۔

''کیا بتاؤں بیٹی..... میری بچی نے اتنی سی عمر میں کیا دکھ سہہ لیے اسے زندہ درگور کر دیا گیا تھا۔ اس کے سسرال والوں کی آئے دن کوئی نہ کوئی فرمائش آ جاتی۔ میں بیوہ تھی بھلا کہاں تک پورا کرتی وہ اندر اندر ہی گھٹتی رہی۔ بہت لالچی لوگ تھے۔ میرے شوہر کا اچھا کاروبار تھا مگر میری اور بیٹیاں بھی تھیں۔ ادھر آئے دن سعدیہ میکے آ جاتی اور ہم ان کی ڈیمانڈ پوری کر کے اسے سسرال چھوڑ آتے۔

اس کی دو بیٹیاں ہو گئیں۔ اب سسرال والوں کو

بیٹے کی خواہش بھی تھی۔ میں نے دو بیٹوں کی شادی کر دی ہماری جمع پونجی بھی ختم ہونے لگی تھی۔ میرے شوہر ریٹائرڈ ہو گئے اور بیمار رہنے لگے۔ ہمارے گھر کے اخراجات چلانا مشکل تھا۔ اب کیسے شادی شدہ بیٹی کا پورا خرچہ معہ فرمائشوں کے اٹھاتے۔ میرا داماد نکھٹو اور کام چور تھا۔ اس کے گھر والے بھی لالچی لوگ تھے۔

جب میں فرمائشیں پوری کرنے کے قابل نہ رہی تو..... وہ لوگ سعدیہ پر تشدد کرنے لگے۔ میری بچی مار کھاتی رہی، ظلم سہتی رہی۔ اس روز بھی اسے سیڑھیوں سے دھکا دے کر گرایا گیا تھا۔ وہ روز مرتی، روز جیتی ایسے میں ایک بار پھر امید سے ہوئی میں حتیٰ الامکان اس کا خیال رکھتی۔ اس کا علاج کرواتی ادھر سسرال والے دو دن میں سارا کھایا پیا، علاج معالجہ اور میری محنت اسے کچوکے دے دے کر ضائع کر دیتے۔

دو ماہ پہلے ایک روز اس کے شوہر نے اس کو نا جانے کس بات پر خوب مارا پیٹا۔ وہ پھر میرے گھر آ گئی۔ مسلسل ٹارچر اور ذہنی و جسمانی تشدد کی وجہ سے وہ ذہنی مریضہ بن گئی تھی۔ بلڈ پریشر بھی ہائی رہنے لگا تھا۔ پھر ایک رات نا جانے وہ کیا کیا سوچ رہی تھی کہ اس کا بلڈ پریشر اتنا ہائی ہو گیا کہ اس کے دماغ کی نس پھٹ گئی اور..... اور..... میری بچی اس ظالم دنیا اور اپنی ماں سے روٹھ گئی۔

اس کے میاں نے تو ایک ماہ بعد ہی دوسری شادی کر لی اور میں اس کی دو نشانیاں سینے سے لگا کر زندہ ہوں۔ یہ دونوں میری بیٹی کی نشانیاں میری نواسیاں طوبہ اور رفاعہ ہیں۔ بس دعا کرو بیٹی کہ اللہ پاک مجھے اس قابل رکھے کہ میں ان بیٹیوں کی اچھی تربیت کر سکوں۔ اللہ پاک مجھے اتنی مہلت دے کہ میں روز محشر اپنی بیٹی کے سامنے شرمندہ نہ ہوں۔

وہ بے تحاشہ روتے ہوئے اپنی داستان الم سنا رہی تھیں اور بے ساختہ میری آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔

مغرب کی اذان کے ساتھ ہی دونوں بچیوں کے ہاتھ تھامے وہ بیرونی راستے کی طرف بڑھ گئیں اور پیچھے میں کھڑی خود سے کیے گئے بے شمار سوالوں کی زد میں تھی۔

''یا اللہ..... آج اس دور میں بھی اتنا سب کچھ ہو رہا ہے.....؟ کب تلک ہماری بیٹیاں ایسے لالچی سسرالوں کو بھگتتے ہوئے، سسکتے مرجائیں گی.....؟ ہمارے معاشرے سے لالچ اور حرص کیوں نہیں جاتی.....؟ کیا مائیں بیٹے صرف اس لیے پیدا کرتی ہیں کہ بڑے ہو کر وہ ان کے پیدائش کے ابتدائی مرحلے سے آخر تک ہونے والے ایک ایک لمحے کی اذیت کا خراج اس طرح سے وصول کریں.....؟ کیوں انسان اپنے آپ پر بھروسہ نہیں کرتا.....؟ کیوں دنیا لالچ اور حرص کے پیچھے دوڑ دوڑ کر اپنی آخرت خراب کر رہی ہے..... ہم دنیا کے عیش وعشرت اور تعیش کے لیے آخرت کو کیوں بھول بیٹھے ہیں.....؟ کیوں آج بھی.....لڑکے والے لڑکی والوں سے اعلیٰ جہیز اور کیش کی ڈیمانڈ کرتے ہیں.....؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ زور زور سے رو لوں..... ایک نہیں نا جانے کتنی بچیاں ہوں گی جو ان حالات کا شکار ہو کر مر جاتی ہیں..... ان کی موت کا ذمے دار کون ہے.....؟

''رخسار! آجاؤ یار مغرب ہو گئی ہے۔ نماز بھی پڑھنی ہے۔'' عباس کی آواز پر میں چونکی جلدی سے آنکھیں صاف کر کے آگے بڑھی۔ مبادا میرے چہرے کو دیکھ کر وہ مجھ سے سوالات شروع نہ کر دیں۔ گو کہ میں خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کامیاب ایکٹنگ کے ساتھ گھر کی سمت جا رہی تھی۔ مگر میرے دل و دماغ پر منوں ٹنوں بوجھ تھا۔ میں بے شمار سوالوں کی بازگشت میں گھری ہوئی تھی۔ ایسے سوالات جن کا جواب شاید مجھ سمیت کسی کے پاس بھی نہیں ہوگا.....لمحہ فکریہ

☆☆☆

تم بن

ایس۔ امتیاز احمد

شاہد کے اہل خانہ کو لندن سے پاکستان منتقل ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا۔ وہ آج کل عزیز و اقارب کی طرف سے دی گئی دعوتوں میں مصروف تھا۔ ایسی ہی ایک دعوت میں شاہد نے پانی لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو جگ کو خالی پایا، اچانک ایک مترنم سی آواز اس کے کانوں میں رس گھول گئی۔

''آپ یہ میرا گلاس لے لیں..... میں جگ میں پانی لے آتی ہوں۔'' شاہد نے چونک کر دیکھا تو اس کی کزن شمع تھی۔

یہ شاہد اور شمع کی پہلی ملاقات تھی، پھر پتہ ہی نہ چلا کہ کب دو دل ایک ساتھ دھڑکنے لگے۔ شمع، شاہد کے والد کے کزن پروفیسر خالد کی بیٹی تھی۔ پروفیسر خالد کی چھوٹی سی فیملی تھی۔ ان کے اخلاق نے شاہد کو بہت متاثر کیا۔ شاہد آج اپنے دفتر سے سیدھا پروفیسر خالد کے گھر پہنچا۔ آج کا دن بھلا وہ کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ دروازے کی بیل پر ننھی گل نے دروازہ کھولا اور شاہد بھیا چلاتی ہوئی وہ شاہد کی گود میں چڑھ آئی۔ شاہد اسے گود میں اٹھائے اندر داخل ہوا۔ سامنے سے شمع آتی دکھائی دی۔ سلیقے سے بال باندھے، آنکھوں میں کاجل لگائے لائٹ گرین سوٹ میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

''اسلام علیکم.....'' شاہد نے پہل کی۔

''وعلیکم السلام جناب.....'' شمع نے مسکراتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں بالکل اسی طرح جواب دیا۔

''انکل، آنٹی..... نظر نہیں آرہے؟'' شاہد نے

پوچھا۔

''مارکیٹ تک گئے ہیں..... بس ابھی آتے ہی ہوں گے۔'' شمع نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور شاہد سر ہلاتا ہوا ننھی گل کو لیے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''شاہد بھیا آپ کو پتا ہے کل ابو میرے لیے سیل سے چلنے والی ریل گاڑی لے کر آئے ہیں، پٹڑی پر خوب بھاگتی ہے..... آپ دیکھیں گے ناں.....'' اور پھر وہ بھاگتی ہوئی ٹرین لانے کے لیے کمرے سے نکل گئی۔

''جناب کو کچھ یاد بھی ہے۔'' شمع نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا یاد ہے.....؟'' شاہد نے بھولے پن سے پوچھا۔

''کچھ نہیں..... میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں، ننھی کے ہاتھ چائے بھجوا دوں گی۔'' شمع نے غصہ سے جواب دیا۔

''ار..... ارے..... میری استانی جی..... ادھر تو دیکھیے.....'' شاہد نے پیچھے چھپائے تحفے کو باہر نکالتے ہوئے کہا۔

شمع ''استانی جی'' کے لفظ پر غصے سے پلٹی اور اپنی بڑی بڑی فسوں آنکھیں غصے سے لال کرتی ہوئی بولی۔

''استانی کسے کہا..... پورے چھ سال چھوٹی ہوں تم سے شاہد کے بچے.....''

''اچھا بابا غصہ چھوڑو..... اور یہ لیجیے اپنی سالگرہ کا تحفہ۔''

بائی داوے میں شاہد ہوں اور جہاں تک شاہد کے بچے کا تعلق ہے تو وہ شادی کے بعد..... ابھی شاہد نے اتنا ہی کہا تھا کہ شمع نے صوفے کا کشن اسے کھینچ مارا اور شاہد ''مارے گئے بابا کہتا ہوا تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا جب کہ شمع کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا۔

☆☆☆

آج موسم بے حد خوشگوار تھا۔ صبح سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ شاہد اور شمع کی فیملی پکنک منانے آئے ہوئے تھے۔ پارک میں حال ہی میں ایک چھوٹا سا چڑیا گھر تعمیر کیا گیا تھا جس میں آئرلینڈ سے لایا گیا قیمتی نسل کا ٹائیگر رکھا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے آج یہاں کافی رش تھا۔ شاہد اور شمع باتیں کرتے ہوئے کافی دور نکل آئے تھے۔

''شاہد پھر تم نے کیا سوچا.....؟'' شمع نے شاہد کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''کس بارے میں.....؟'' شاہد نے ہاتھ میں پکڑی درخت کی پتلی سی ٹہنی زمین پر مارتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے.....'' شمع غصے سے بولی اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے نکل گئی۔

''ارے بابا..... رکو..... تو..... ایک تو غصہ تمہاری ناک پر دھرا رہتا ہے۔'' شاہد نے تیزی سے شمع سے آگے نکل کر اپنے کانوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا بابا..... یہ لو..... کان پکڑ لیے..... اب معاف بھی کر دو نہیں تو ابھی مرغا بن کر اذان دینا شروع کر دوں گا پھر نہ کہنا.....'' شاہد نے معصوم سا چہرہ بناتے ہوئے کہا اور شمع اس کے انداز پر نہ چاہتے ہوئے بھی بے اختیار ہنس دی۔

''ہاں..... یہ ہوئی ناں بات..... بس یوں ہی مسکراتی رہا کرو۔ کچھ چہرے ہمیشہ مسکرانے کے لیے بنے ہوتے ہیں شمع..... میں تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں تمہارے چہرے پر معصوم مسکراہٹ میں تو میری زندگی پوشیدہ ہے۔ تمہیں دکھ دینے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''اچھا تو پھر کیوں ایسی باتیں کرتے ہو کہ میں ناراض ہو جاؤں..... ویسے ایک بات کہوں باتیں بنانا آپ کو خوب آتا ہے جناب کو وکالت کرنی چاہیے تھی۔

بزنس میں خواہ مخواہ آ گئے۔'' شمع شرارت بھرے لہجے میں بولی۔

''شمع تم پوچھ رہی تھی ناں کہ میں نے کیا سوچا ہے۔'' شاہد یک لخت سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''ہوں.....'' شمع نے آہستگی سے گردن ہلا دی۔

''دیکھو شمع میں چاہتا ہوں کہ پہلے تم اپنا ایم فل مکمل کر لو اس کے بعد امی ابو کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔''

''شاہد یہ میرا آخری سمسٹر ہے اور پھر ایک دو رشتے بھی آئے ہوئے ہیں۔ میں ڈرتی ہوں کہ کہیں گھر والوں نے ہاں کر دی تو.....'' اس سے آگے شمع کچھ نہ کہہ سکی اور ٹپ ٹپ آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگنے لگا۔ یہ دیکھ کر شاہد تڑپ اٹھا۔

''شمع..... یہ کیا..... اتنی بہادر ہو کر ایسا کر رہی ہو تم کیا سمجھتی ہو..... میں تمہارے بغیر جی پاؤں گا..... شمع میری معصوم دھڑکن ہم دونوں نے ایک ساتھ حسین زندگی کا خواب دیکھا ہے..... اس خواب کو حقیقت کا روپ ہماری سچی محبت دے گی۔ اس سچی محبت کے سہارے میں زندہ ہوں..... جس دن یہ محبت نہ رہی میں بھی نہ رہوں گا، شمع ادھر میری آنکھوں میں دیکھو شاہد نے شمع کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ ان آنکھوں میں بے وفائی ہے..... بولو شمع..... بولو.....'' شمع نے لرزتی پلکوں کے ساتھ نظر اٹھا کر شاہد کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی کہ شاہد کی سیاہ آنکھیں بھی آنسوؤں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھیں۔

☆☆☆

شاہد کے اہل خانہ کھانے کی میز پر جمع تھے۔

''بیٹے تم نے آگے کیا سوچا ہے؟'' انور صاحب نے اپنے بیٹے شاہد سے پوچھا۔

''سوچنا کیا ہے..... ماشاء اللہ بزنس ٹھیک ٹھاک ہے..... اب تو بیٹے کی سر پر سہرا سجانا ہے۔ شاہد کو سلیم صاحب کی بیٹی ضرور پسند آئے گی۔ بزنس میں ایک نام ہے اس فیملی کا.....'' شاہد کی والدہ بیگم انور نے کہا۔

''شاہد کی رائے تو پوچھ لو پہلے.....'' انور صاحب نے مداخلت کی۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں میں اپنے بیٹے کے لیے غلط فیصلہ تو کرنے سے رہی..... لڑکی بالکل چاند کا ٹکڑا ہے۔''

''مم..... مگر..... امی میں خالد انکل کی بیٹی سے۔'' شاہد نے کچھ کہنا چاہا لیکن بیگم انور نے اس کی بات کاٹ دی۔

''خاموش شاہد..... میں بھی کہوں کہ کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ چکر ہے..... ان مڈل کلاس کو اپر کلاس کی دولت پر ہاتھ صاف کرنے کا اچھا موقع ملا ہے..... خبردار جو تم نے اس بارے میں سوچا بھی.....'' وہ غصے میں تھیں۔

''امی..... میں..... شادی کروں گا تو خالد انکل کی بیٹی شمع سے ورنہ کبھی نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر شاہد میز سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

شاہد کا فیصلہ سن کر بیگم انور طیش میں آ گئیں وہ غصے سے اٹھیں گاڑی نکالی اور سیدھا پروفیسر خالد کے گھر پہنچ گئیں۔ کمرے میں پروفیسر صاحب کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بیگم انور نے پروفیسر خالد سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ تم دو ٹکے کے لوگوں نے اپنی بیٹیوں کو پیسے والی آسامی کے لیے اچھا آلہ کار بنایا ہوا ہے۔ خبردار جو آئندہ میرے بیٹے کی طرف رخ بھی کیا تو..... اچھا نہیں ہوگا۔

شمع ڈرائنگ روم کے دروازے سے لگی سب سن چکی تھی۔ وہ باپ کو روتے دیکھ کر تڑپ کر آگے بڑھی اور قدموں میں گر کر روتے ہوئے بولی۔

"بابا مجھے معاف کر دیں۔ آپ جہاں کہیں گے میں شادی کرلوں گی...... بابا بس آپ روئیں مت...... ماما...... پلیز...... بابا...... روئیں مت۔" اور وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بابا کے گلے لگ گئی۔ شمع کے آنسوؤں میں اپنی محبت کہیں ڈوب سی گئی تھی۔

شاہد کو بزنس کے سلسلے میں اچانک کینیڈا جانا پڑ گیا۔ جانے سے قبل اس نے شمع سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن شمع نے ٹھیک طور سے بات نہیں کی، پوچھنے پر طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔ شاہد کینیڈا چلا گیا۔ پندرہ روز بعد وہ ایئر پورٹ سے گھر پہنچا تو اپنے کمرے میں پہنچتے ہی شمع کا نمبر ڈائل کیا۔ ننھی گل نے فون اٹھایا...... دوسری جانب فون پر کافی شور تھا۔

"اسلام علیکم! کیسی ہو گل بیٹا۔" شاہد نے کہا۔

"ارے...... شاہد بھیا...... کہاں تھے آپ...... ہم آپ کو کتنا مس کر رہے ہیں...... آج آپ شادی پر آ رہے ہیں ناں......؟"

"کس کی شادی......؟" شاہد نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے...... آپی شمع کی شادی...... اور کس کی......" شاہد کے سر پر جیسے بم پھٹ گیا ہو۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے اور دماغ پر یہ الفاظ ہتھوڑے بن کر برسنے لگے۔

"ارے آپی شمع کی شادی...... اور کس کی......"

موبائل شاہد کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ ننھی گل اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھی...... لیکن شاہد بت بنا کرسی پر بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ اچانک شاہد کو جیسے ہوش آ گیا ہو۔ اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی...... پھر اچانک کچھ خیال آنے پر گاڑی کی چابی رکھتے ہوئے بائیک کی چابی لے کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

شاہد کی ہیوی بائیک تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ رش کے باوجود وہ تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ دل و دماغ میں ایک طوفان سا برپا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا ہے۔ شمع کے گھر کے قریب اچانک ایک ٹرک گلی سے سڑک پر نکل آیا۔ تیز رفتاری کے باعث شاہد بائیک پر قابو نہ پا سکا اور ٹرک میں جا گھسا...... ٹرک رک گیا۔ پیچھے سے بارات کی کاریں رک گئیں۔ باراتی نکل نکل کر ایکسیڈنٹ کا جائزہ لینے لگے۔

اچانک باراتی پیچھے ہٹنے لگے اور دولہے کی کار نکل کر آگے آ گئی...... دولہے کے بھائی نے شاہد کے نزدیک گرے ہوئے کارڈ کو اٹھاتے ہوئے چونک کر کہا۔

"ارے...... یہ تو مشہور بزنس مین انور علی کا بیٹا ہے...... اس کے گھر فون کرو اور پولیس کو بھی...... پھر وہ دولہے کی کار کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

"بھائی جان آپ گھر والوں کو لے جائیں...... یہاں میں معاملہ نپٹا کر آتا ہوں...... مشہور بزنس مین کا بیٹا شاہد علی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ نا جانے کن سوچوں میں گم تھا بے چارہ۔"

شاہد علی کا نام سن کر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی دلہن چونک اٹھی۔ شمع نے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے گھونگھٹ اٹھا کر کھڑکی کے شیشے سے باہر کا منظر دیکھا تو دھک رہ گئی۔ سانسیں جیسے سینے ہی میں دم توڑتی محسوس ہوئیں۔ سامنے سڑک پر شاہد کا خون سے بھرا چہرہ اور آدھ کھلی آنکھیں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں......!

"تم نہ ملی شمع تو میں کیسے"

"تم بن"

"زندہ رہ پاؤں گا؟"

☆☆☆

تم مجھے قبول ہو

حنا اصغر

کبھی کبھی اپنوں کے کھو جانے کا ملال
اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ کسی کو پانے کی
خواہش بھی کھو جانے کے خوف میں دب کر رہ جاتی ہے

ایک لڑکی کا فسانہ جو سچی محبت کی تلاش میں تھی

اپنوں سے کچھ ملا نہیں غیروں سے کوئی گلہ نہیں
میں غم کی وہ کتاب ہوں جسے کسی نے پڑھا نہیں

نہ میں پوچھتی ہوں آخر کمی کیا ہے شوکت علی میں۔ مرد نہیں ہے، کانا ہے، ٹنڈا ہے یا پھر کماتا نہیں ہے۔ کاروبار تو دیکھو شوکت علی اکیلی فیکٹری کا مالک گھبرو جوان دو کاروں کا مالک بھلا اس کو کمی کیا ہے بس ضد کر کے بیٹھا ہے کہ اس گندی شکل والی (عرف عام میں کالی) زینت سے شادی کروں گا۔

کہتا ہے پہلے بھی ابا جی نے دے کی مریض شہناز کے پلے باندھ دیا لیکن اب اپنی مرضی کروں گا۔ (جبھی تو اس کالی کو چنا ہے)

بھابی شبنم کی پات دار آواز وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر بھی با آسانی سن رہی تھی۔ جی تو اس کا چاہ رہا تھا ان سے دو دو ہاتھ کرے۔ لیکن بھائی حیدر ابھی کام سے گھر آیا تھا۔ وہ مزید اس جھگڑے کو بڑھا کر ٹینشن نہیں دینا چاہتی تھی۔ اسی لیے اپنے کمرے میں رکھا ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی اور دل ہی دل میں خود کو سمجھانے لگی۔

خود کو صبر کی تلقین کرتے کرتے اس کا صبر جواب دے گیا اور وہ آندھی طوفان کی طرح بھابی شبنم کے کمرے میں پہنچی لیکن وہاں قابل اعتراض اور اچھے خاصے بے باک سین نے اس کا غصہ ایک طرف بلکہ اس کو جھجکنے اور خفت میں مبتلا کر دیا۔

حیدر بھائی بھابی شبنم کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا جبکہ شبنم بھابی حسب معمول زینت کے کارنامے سنانے میں مشغول تھیں۔ دونوں کی نگاہیں بیک وقت زینت کی جانب اٹھیں۔

حیدر بھائی سٹپٹا کر اٹھ بیٹھا اور تقریباً یہی حال شبنم کا بھی تھا۔

نی بے غیرتے تجھے شرم نہیں آتی شادی شدہ لوگوں کے کمروں میں یوں گھسا جاتا ہے جس طرح تو آجاتی ہے.....

بھابی شبنم چھلانگ لگا کر پلنگ سے ایک ہی جست میں اتریں اور اب وہ اس کے بدمقابل تھیں۔

شادی شدہ او آٹھ سال ہونے کو آئے ہیں تیرے دیاہ کو لیکن چونچلے ابھی بھی ایسے ہیں جیسے کل آئی ہو بیاہ کے..... بے شرم اور کیا تو ہر وقت بکواس کرتی ہے شوکت علی..... شوکت علی..... یہ وہی شوکت علی ہے جو میری بہن کو کھا گیا صرف نکاح ہی ہوا تھا کہ صبح و شام کے اعتراضات نے میری بہن کو منوں مٹی تلے اتار دیا اور اب اس کی مجھ پر نظر ہے اور حیدر بھائی زن مرید اتنے بھی نہ بنو کیا بھول گئے ہو ابا مرتے وقت میرا نکاح عبدالرحیم سے کر گیا تھا یا پھر میں مولوی برکت اللہ کو پکڑ کر لاؤں جس نے میرا نکاح پڑھایا تھا۔

زینت کی آنسوؤں میں ڈوبی آواز اور مسلسل بین نے حیدر کو ہراساں کر دیا جبکہ شبنم تو اس اداکاری کے مظاہرے ہر روز ہی دیکھنے کی عادی تھی۔ اس کو خاطر میں لائے بغیر بولی۔

شوکت نے مارا ہے یا پھر اللہ چاچے کو جنت میں جگہ دے اس نے آدھ مڑی ہوئی لڑکی ہمیں تھمانے کی کوشش کی تھی۔ دے کی مریضہ وہ تھی، چلنے پھرنے سے معذور اوپر سے جب ہم ملنے آتے کمرے میں گھس جاتی۔ اب ہمیں کیا پتہ کہ ہمارے ساتھ چاچے نے یہ کام کیا ہے۔

وہ تو نکاح کے بعد اس نے خود ہی اپنی اک اک بات شوکت کو بتا کر اس کا دل کھٹا کر دیا۔ پھر بھی میرا بھرا (بھائی) شادی کو تیار تھا۔ وہ تو اللہ بخشے شہناز خود ہی فوت ہو گئی اور رہی بات تیرے نکاح کی تو سارے خاندان کو پتہ ہے چاچے نے لالچ میں صفدر قصائی کے بیٹے عبدالرحیم سے تیرا نکاح کر دیا اور دس جماعتیں پڑھنے کے ساتھ ہی وہ ایسا دبئی گیا کہ ابھی تک نہیں لوٹا اور تو اور اپنے ماں باپ کو بھی وہیں بلا لیا اور اب جب بھی حیدر اس کے بھائی سے رخصتی کا تقاضا کرتا ہے تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگتا ہے۔

تجھے ناز ہے ناں اپنے بی اے پاس ہونے پر تو

بہن نہ اترا یہ نا ہو کلثوم کی طرح شوہر سے پٹتی ہی رہے..... شبنم نے دوسرا تیر پھینکا..... لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کلثوم بھی خود کافی دیر سے لڑائی کے یہ مظاہرے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر رہی ہے۔ وہ انتظار تو اس بات کا کر رہی تھی کہ کس بات پر انٹری دے اور شبنم کا چونڈا (بال) ہلا کر رکھ دے۔ اب موقع اس جنگجو حالات کی ماری شوہر کی ستائی ہوئی کلثوم کو خود شبنم نے دیا تھا۔ وہ ایکا ایکی آگے بڑھی اور آگے بڑھنے کے ساتھ ہی اس نے سدا کی نکمی اور ڈرپوک زینت کو ایک طرف دھکا دیا اس افتاد پر دھان پان سی زینت اندر تک ہل کر رہ گئی جبکہ وہ شبنم کے سامنے کھڑی تھی۔

حیدر نے سرعت سے بیڈ چھوڑ دیا لاکھ گھر والوں پر رعب جھاڑنے کے باوجود بھی وہ کلثوم سے جھینپتا ہی تھا وجہ اس کا دوست امجد تھا جس کا نکاح امجد کے اصرار پر اس نے اپنی بڑی بہن کلثوم سے کروا دیا اور ہر بار پٹ کر گھر آنے کے بعد کلثوم حیدر کو ہی اپنی زندگی کی بربادی کا ذمہ دار گردانتی تھی۔

ہاں اب بول کیا بک رہی تھی..... وہ..... وہ آپا..... میں تو..... شوکت کے بارے میں بات کر رہی تھی وہی اصرار کرتا ہے کہ زینت سے شادی کرنی ہے..... کچھ دیر پہلے کی جوالہ مکھی شبنم اب بھیگی بلی بنی ہوئی تھی۔

ہاں زینت کہتی تو ٹھیک ہے کیوں بدشکل عبدالرحیم کے پیچھے خود کو برباد کر رہی ہے اگر تیرا نکاح نہ ہوا ہوتا تو میں خود تیری شادی شوکت سے کرتی۔ چل دفعہ کر اے شبو رانی چل کھانا دے مجھے اور حیدر وہ تیرا دوست سوات جا رہا ہے سیر کرنے کے لیے اب کی بار میں بھی اس کے ساتھ جاؤں گی۔ آخر پتہ تو چلے ہر سال وہاں حاضری کیوں دینے جاتا ہے..... آپی اور سیف (بیٹا) وہ بھی آپ لوگوں کے ساتھ جائے گا.....

وہ کیوں جائے گا تو ہے ناں اس کا خیال رکھنے کے لیے.....

اب جا بھی..... بھوک مر جائے گی تب دفع ہو گی..... کلثوم آپی کے لہجے سے ڈر کر شبنم جلدی سے باہر نکل گئی جبکہ زینت سر جھٹک کر ایک بار پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

میں نے سوچ لیا ہے اب میں نوکری کروں گی..... ناشتے کے وقت زینت نے اطلاع دی۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی شبنم بھابی اور بھیا نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ دونوں اب اس کی غیر مستقل مزاجی سے سخت تنگ آ گئے تھے۔

ابا جی کے مرنے کے بعد اس نے بیوٹیشن کا کورس کیا اور گھر میں پارلر بنایا کچھ عرصے تک پارلر خوب چلا لیکن پھر اس کی ہمسائی نے عین اس کے پارلر کے سامنے اپنا پارلر بنا لیا۔ آئے دن کی لڑائیوں، تانک جھانک اور ڈپریشن سے تنگ آ کر زینت نے پارلر بند کر دیا اور ٹیوشن سینٹر کھول لیا۔

محلے والوں نے اپنے بچوں سے جان چھڑائی اور زینت کی جان عذاب میں ڈال دی۔ وہ دو بجے سے آٹھ بجے تک نان اسٹاپ بچوں کو پڑھاتی۔ اتنی جاں فشانی سے پڑھانے کے باوجود بھی والدین فیس دینے کے ٹائم آنا کانی کرتے اور ٹھیک ٹھاک ڈنڈی مار جاتے۔ چار ماہ بعد ہی زینت نے تھک ہار کر ٹیوشن سینٹر بند کر دیا اور ایک مقامی سکول میں جاب کر لی۔ سکول میں جاب ٹھیک ٹھاک ہی چل رہی تھی کہ وہاں کے پرنسپل نے پٹڑی سے اترنا شروع کر دیا۔

شروع شروع میں وہ اس کو دیکھ کر مسکراتے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک دم سے اس کی تنخواہ بڑھا دی اور آخری بار اس کو سوٹ گفٹ کر دیا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ منہ نوچ لے لیکن اس نے سوٹ پرنسپل کے منہ پر مارنے پر اکتفا کیا اور بکتی جھکتی

گھر آ گئی.....

کہاں نوکری کرو گی زینت.....؟ شبنم بھابی نے روٹی توے پر ڈالتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

لیکن زینت کو ایسا لگا جیسے انہوں نے صبح ہی صبح طنز کے تیر پھینکنا شروع کر دیئے ہوں۔

ابھی وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کھلے دروازے سے اندر آتے شوکت علی کو دیکھ کر اس نے برا سا منہ بنایا۔ اس کو دیکھ کر ہی شوکت علی کے چہرے پر مسکراہٹ سج گئی۔ جس کو چھپانے کی اس نے قطعاً کوشش نہیں کی تھی۔

حیدر بھائی سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھے اور شوکت علی کے استقبال کو لپکے۔ ان کی چاپلوس رویے کو دیکھ کر زینت کا حلق اندر تک کڑوا ہو گیا.....

اوئے بشیرے آم کی پیٹیاں اندر لے آ کیا باہر جم گیا ہے..... شوکت علی نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور دوسری دروازے کی اوٹ سے جھانکتے بشیرے پر.....

وہ اونہہ کہتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

سلام و دعا کا رواج نہیں ہے تمہارے گھر میں پا حیدر..... وہ شرارت بھرے لہجے میں بولا۔

جہاں سے سلام و دعا کی تم توقع کرے بیٹھے ہو پا وہاں سے اونہہ ہی ملے گا۔ شبنم ہنستے ہوئے بولی۔

آج اتنے دنوں بعد اپنے پا کو دیکھ کر اس کو صحیح معنوں میں مسرت محسوس ہو رہی تھی۔ ورنہ آخری بار زینت سے بے عزتی کروانے کے بعد شوکت علی اب آیا تھا۔ شبنم نے تو اس کے آنے کی ہر آس ہی ختم کر ڈالی تھی۔ وہ کافی دیر بیٹھا رہا۔ چائے ناشتہ کرنے کے بعد ہی گیا۔ جب تک وہ وہاں موجود رہا ایک بار بھی زینت نے وہاں آ کر نہیں جھانکا۔ اس کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے سے چائے بنانے کی غرض سے باہر آئی۔

کیا ہو جاتا زینت جو اگر دو گھڑی آ کر بیٹھ جاتی شوکت محسوس کر کے گیا ہے..... شبنم بھابی نے حتی الامکان اپنا لہجہ نارمل رکھا۔

دیکھ بھابی تیرے بہن بھائیوں کی خاطر مدارت کا میں نے ٹھیکہ نہیں لیا۔ ادھر اپنی زندگی عذاب بنی ہوئی ہے اور تجھے ہنسی مذاق کی پڑی ہے..... زینت بڑبڑا کر چولہے پر رکھے کھولتے پانی کی دیگچی میں پتی جھونکنے لگیں۔ جب کہ اس کی سوچیں شوکت علی کے اردگرد گردش کرنے لگیں۔

☆☆☆

الرحیم انڈسٹریز میں سیکرٹری کی جاب کے انٹرویو کے لیے وہ روانہ ہوئی۔ حیدر بھائی نے لاکھ کہا کہ میں چھوڑ دیتا ہوں لیکن اس نے صاف منع کر دیا۔ انٹرویو کے پہلے دن وہ گھر میں کوئی فساد نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی حیدر بھائی نے بلال (بیٹے) کو سکول چھوڑنا ہوتا تھا۔ صبح سویرے وہ شبنم بھابی کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی اخبار میں الرحیم انڈسٹریز کا نام پڑھ کر اس کو عبدالرحیم کا خیال آ گیا۔

یہاں سے جانے کے بعد اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بھائیوں نے جھوٹے منہ پوچھا اس کو کبھی کبھار ابا سے دل ہی دل میں سخت شکایت ہوتی۔ انہوں نے یہ بے جوڑ رشتہ کرتے ہوئے ایک بار بھی زینت شاہین کے متعلق نہیں سوچا اور شوکت علی کو دیکھ کر زینت کے دل کا قلق بڑھ جاتا۔ شوکت علی شکل وصورت سے لے کر کردار تک کا کھرا بندہ تھا، اوپر سے حیثیت بھی بہت اچھی تھی.....

بی بی آ گئی ہے الرحیم انڈسٹریز..... ٹیکسی ڈرائیور نے دو منزلہ عمارت کے عین سامنے ٹیکسی روک کر اس کو مخاطب کیا۔ وہ جو سوچوں کی گرداب میں الجھی ہوئی تھی چونک گئی۔

کرایہ ادا کرنے کے بعد اس نے اپنے قدم آگے کی جانب بڑھائے۔ وہاں پہلے سے ہی کافی لڑکیاں

موجود تھیں۔ وہ بھی ان کے درمیان بیٹھ گئی۔ انٹرویو شروع ہو چکا تھا۔ ایک ایک کر کے لڑکیاں اندر جانے لگیں۔ کچھ ہی دیر بعد اس کو بلایا گیا۔

وہ خود اعتمادی سے اندر بڑھی لیکن دروازے کے عین سامنے رکھی نشست پر براجمان عبد الرحیم کو دیکھ کر اس کا دماغ ماؤف ہو گیا جبکہ وہ ستائشی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا (تو گویا مجھے پہچان گیا ہے) وہ مسکرا کر آگے بڑھی۔

بیٹھئے مس زینت ..... انتہائی بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

میں بالکل ٹھیک ہوں ..... اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

وہ اس کی اسناد کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے ایک دو سوال پوچھے جن کے جواب دینے کے بعد زینت کو یقین تھا وہ کہے گا کہ زینت شاہین میں عبد الرحیم ہوں لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ انٹرویو ختم ہو گیا اور طویل راہداری سے گزرتے ہوئے اس نے کتنی ہی بار پیچھے مڑ کر دیکھا کہ شاید وہ اس کو پکارے یا اس کو بلوا لے اور کہے میں تو مذاق کر رہا تھا۔

گیٹ کے قریب پہنچتے ہوئے اس نے آس کے تحت پیچھے مڑ کر دیکھا۔ چپڑاسی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آ رہا تھا۔ تو گویا وہ بھی پہچان گیا ہے مجھے اس کی تصویر بہت پہلے زینت نے دیکھی تھی لیکن اس کے نقش گویا دل میں اتر سے گئے تھے حالانکہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد وہ تبدیل ہو گیا تھا پہلے سے زیادہ سمارٹ اور گورا چٹا.....

بی بی آپ نے اپنا کنٹریکٹ نمبر نہیں دیا۔ رحیم صاحب ناراض ہو رہے ہیں ..... وہ جو کوئی اور ہی امید لگائی بیٹھی تھی۔ چپڑاسی کی بات سن کر اس کی ساری خوش فہمی ہوا ہو گئی۔ اس نے اپنا نمبر لکھوایا اور مرے مرے قدموں سے باہر نکل گئی۔

خواہش

خواہش! وہ بھنور ہے، جس میں پھنس کر انسان اپنا مقصد حیات بھول جاتا ہے۔ یہ وہ آگ ہے جو انسان کو جھلسانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ وہ سمندر ہے جس کے ساحل تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ یہ وہ سیلاب ہے، جو انسان کو انسان سے دور بہالے جاتا ہے۔ یہ وہ کالی رات ہے، جو انسان کی زندگی میں کبھی سویرا نہیں ہونے دیتی۔

(اقراء تبسم، ملتان)

دوپہر کا وقت تھا اور ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ اپنے روٹ تک آتے آتے وہ پسینے سے شرابور ہو چکی تھی۔

اس نے گھڑی کی جانب دیکھا بس آنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس نے کوفت میں ادھر ادھر دیکھا اور بس سٹاپ پر کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت ایک بلیک کار اس کے قریب آ کر رکی، کھڑکی کے شیشے نیچے گرا کر شتر مرغ کی سی گردن باہر نکال کر شوکت علی بولا.....

آ جاؤ زینت میں ڈراپ کر دیتا ہوں.....

زینت نے آئی برو اچکا کر اس کی جانب دیکھا پہلے تو دل میں خیال آیا کہ منع کر دے لیکن پھر گرمی میں کھڑے رہنا محال سا لگنے لگا۔ اس لیے بغیر حیل و حجت کے فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی۔

کہاں سے آ رہی ہو..... کار چلانے کے ساتھ ہی پہلا سوال داغا گیا جو کہ زینت کو سخت ناگوار گزرا۔ منہ بنا کر بولی۔

تمہاری گاڑی میں بیٹھ گئی ہوں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کی پابند ہو گئی ہوں۔

میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا تم تو برا منا گئی ہو۔

وہ ہنستے ہوئے بولا ویسے شبنم نے بتایا تھا جاب کر رہی ہو.....

ہاں..... اس نے مختصر جواب دیا۔

چائے پیو گی..... اس نے شرارت سے کہا۔

دماغ خراب ہے اس چلچلاتی گرمی میں چائے پی کر میں نے مرنا ہے..... زینت بلبلا کر بولی۔ شوکت علی ایک بار پھر مسکرا اٹھا۔ میں نے سوچا آئس کریم کی آفر کروں گا تو صاف منع کر دو گی ہاں اگر چائے کی آفر کی تو انکار کرنے کے ساتھ ایک آدھ پتھر بھی دے مارو گی تو محترمہ زینت صاحبہ یہ پتھر کے لیے کہا گیا تھا۔

اس کی بات کے جواب میں وہ لاجواب سی ہو کر چپکی بیٹھی رہی۔ اس نے خود ہی آئس کریم پارلر کے باہر گاڑی روک دی۔ ایک منٹ ابھی آتا ہوں کہہ کر وہ چلا گیا جبکہ زینت کا کچھ دیر پہلے کھولتا ہوا دماغ شوکت علی کی باتوں کے زیر اثر خوشگوار ہو گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ہاتھوں میں دو بڑے آئس کریم گلاس تھامے ہوئے چلا آیا۔ اس نے ایک آئس کریم گلاس اس کے سامنے کیا جو بغیر کسی حجت کے زینت نے تھام لیا۔

آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے زینت.....؟ آئس کریم کھاتے ہوئے شوکت علی نے سرسری انداز میں پوچھا لیکن زینت نے کوئی جواب نہ دیا وہ خود کو ایک گورکھ دھندے میں الجھتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس کی طویل خاموشی پر شوکت علی محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔

☆☆☆

اس کو کال کر کے جاب ملنے کی اطلاع دے دی گئی جبکہ وہ ابھی بھی تحیر زدہ تھی کہ عبدالرحیم نے اس کو پہچانا نہیں یا پھر وہ اس کے ساتھ کھیل کھیل رہا ہے۔ عبد الرحیم اگر یہ کھیل ہے تو میں بھی جان لڑا کر کھیلوں گی..... اس نے خود سے کہا اور مسکرا کر تیاری کرنے لگی۔

اگر تو کہے تو کچھ دن تک شوکت علی سے کہہ دوں تجھے آفس چھوڑ دیا کرے..... ناشتہ کرتے ہوئے شبنم بھابی نے کہا۔

دیکھ بھابی جہاں شوکت علی ہے ناں اس کو وہیں رہنے دے یہ سیٹنگ ویٹنگ کرانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ میرا نکاح ہو چکا ہے اور انشاء اللہ اسی کے ساتھ ہی رخصت ہو کر جاؤں گی..... نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

بیسن پر منہ دھوتے حیدر نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا تو لیے سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

زینت شاہین آرام سے زیادہ خواب نہ سجا ان آنکھوں میں عبدالرحیم کے دونوں بھائی یہ علاقہ چھوڑ گئے ہیں اور مجھے ان کے اندر کے ایک آدمی نے بتایا ہے کہ اس نے عبدالرحیم کو شہر میں بڑی سی گاڑی میں دیکھا ہے وہ تو اور بھی بہت کچھ بتا رہا تھا البتہ مجھے ان لوگوں کے لچھن ٹھیک نظر نہیں آ رہے۔

حیدر کی گل فشانی کو اس نے اونہہ کہہ کر سر سے جھٹک ڈالا اور تن فن کرتی گھر سے نکل آئی لیکن پورے راستے حیدر پا کی باتیں گردش کرتی رہیں۔

آفس میں اس کا پہلا دن خلاف معمول اچھا گزرا عبدالرحیم سے ایک دو بار سامنا ہوا معمول کی مسکراہٹ کے علاوہ اس نے نہ تو کوئی بات کی اور نہ ہی کوئی اشارہ دیا۔ اب زینت کو یقین ہونے لگا کہ عبدالرحیم اس کو پہچانتا ہی نہیں ہے۔

یہ ہے نئی سیکرٹری..... بریک کے وقت وہ لڑکیوں کے درمیان جا بیٹھی جو آفس کینٹین میں جمع تھیں۔ اس کو دیکھ کر ایک دوسرے کو اشارے کیے گئے۔

کہیں اس کا حال نائلہ جیسا نہ ہو..... ہلکی سی سرگوشی پر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ سب اس کے چوکنا ہونے پر کھانے میں مشغول ہو گئیں اور وہ ہوا میں لہراتا ہوا سرا پکڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

تنبیہہ تھی یا اشارہ..... آخر کیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد بھی دماغ اسی نہج پر دھینگا مشتی کرتا رہا لیکن جواب

☆☆☆

اس کو جاب کرتے ہوئے ہفتہ ہوگیا اس کے ساتھ ہی عبدالرحیم کا بے گانہ رویہ جوں کا توں برقرار تھا۔ ایک دن بریک ٹائم میں عبدالرحیم نے زینت کو بلوایا وہ جو وہاں لڑکیوں کے ساتھ کھانا کھانے میں مشغول تھی۔ ایک لمحے کو حیرت زدہ ہوگئی۔ زینت دھیان سے عبدالرحیم سر کی شہرت اچھی نہیں ہے انتہائی کیریکٹر لیس انسان ہیں۔ ان کی پہلی والی سیکرٹری نے ان کی حرکتوں سے تنگ آ کر جاب چھوڑی ہے۔

لیکن ان کا تو نکاح ہوا ہے..... زینت کو اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی جبکہ اس لمحے اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار تھے۔ دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے پنجرے کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

ارے کون سا نکاح بی بی ان کے تو دو بیٹے بھی ہیں دبئی میں بھی کسی انڈسٹریلسٹ کی بیٹی کو پھانس کر شادی کی تھی جبھی تو یہ ٹھاٹ باٹ ہیں بیوی کی ساری دولت ہے اور ان کا پورا کنبہ راج کر رہا ہے۔ سنا ہے عبدالرحیم کچھ دنوں تک اپنے بھائیوں کو ایک فیکٹری لگا کر دینے والا ہے۔

بی بی آپ کو سنائی نہیں دیتا سر کب سے بلا رہے ہیں۔ چپڑاسی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

زینت نے ایک لمحے کو نازیہ کی جانب دیکھا اور دوسری نگاہ چپڑاسی پر ڈالی جس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اس کو بازو سے کھینچتا ہوا لے جائے..... جبکہ زینت خود کو ہوا میں معلق محسوس کر رہی تھی۔ اس نے پرس کندھے پر ڈالا اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

☆☆☆

وہ جیسے ہی دفتر سے باہر آئی جس اور لو نے اس کا خیر مقدم کیا اس کو خود پر افسوس ہونے لگا اگر وہ اتنا عرصہ عبدالرحیم سے جان چھڑانے میں لگاتی تو شاید اب تک اس کی جان چھوٹ ہی جاتی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ شبنم بھابی سے لے کر حیدر بھائی کی باتوں کو اس نے یوں اڑایا جیسے لوگ ناک پر سے مکھی اڑاتے ہیں۔

زینت آؤ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں وہ پتہ نہیں کہاں سے آن وارد ہوا۔ زینت نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے شوکت علی کی جانب دیکھا جو عبدالرحیم انڈسٹریز سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔

زینت نے بغیر چوں چرا کیے اس کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ کچھ ہی فاصلے پر اس کی کار کھڑی تھی۔ اس نے زینت کے لیے فرنٹ ڈور کھولا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

زینت نے بیٹھنے کے ساتھ ہی زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ شوکت علی کار ڈرائیو کرتا رہا اس نے ایک لفظ بھی نہیں بولا۔

کافی دور جا کر شوکت علی نے کار روک دی۔ زینت کے آنسو تھم گئے۔ اس نے اچھنبے سے راستے کی جانب دیکھا یہ جگہ تقریباً انجان تھی نہ تو یہاں زینت رہتی تھی اور نہ ہی شوکت علی..... شوکت علی نے موبائل نکالا ایک نمبر ڈائل کیا اور فون کان سے لگا کر بولا۔

جی مس انجم ہم آ گئے ہیں۔ آپ آ جائیں.....

فون بند کرنے کے ساتھ ہی شوکت علی کار سے باہر نکلا زینت بھی اس کی معیت میں کار سے نکلی..... سامنے ایک کوٹھی سے انتہائی ماڈرن لڑکی ان کے قریب آتی ہوئی نظر آئی۔

اسلام علیکم کیسی ہیں آپ.....

میں ٹھیک ہوں آپ سنائیں..... انجم نے مسکرا کر پوچھا۔

یہ زینت ہے عبدالرحیم کی منکوحہ..... شوکت علی نے تعارف کرایا اور میں اس کی بیوی ہوں بلکہ یوں کہنا چاہیے تیسری بیوی میرا کیس تھوڑا مختلف ہے کیونکہ

موصوف عبدالرحیم مجھے طلاق نہیں دے رہے وجہ حق مہر ہے..... آپ کے کیس کا کیا بنا انجم..... شوکت نے پوچھا۔

عبدالرحیم کے والد نے کہا ہے کہ آج فائنل کریں گے اور اگر آج بھی وہ نہیں مانتا تو کیس دائر کردوں گی..... مجھے حیرت ہے یہ کس طرح پھنس گئی ہے..... انجم نے حیرت سے زینت کی جانب دیکھا جو اس وقت موجود ہو کر بھی کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔

یہ نہیں پھنسی بلکہ ان کے والد ماجد نے پھنسایا ہے ویسے اس کے بھائی حیدر نے کل بات کی ہے عبدالرحیم سے اس نے بغیر کسی تردد کے طلاق دینے کی حامی بھر لی ہے ایک دو دن میں یہ آزاد ہوں گی۔

میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے..... شوکت علی نے گھڑی دیکھ کر کہا..... انجم سے ہاتھ ملا کر زینت کار میں بیٹھ گئی۔

کچھ کہو گی نہیں..... کار ڈرائیو کرنے کے دوران شوکت علی نے پوچھا۔

زینت نے نفی میں سر ہلا دیا۔

زینت بہت پہلے کی بات ہے جب شبنم کا رشتہ ابا جی نے حیدر سے طے کیا تھا تم ہمارے گھر آئی تھیں میں گھر لوٹا تو مہمان خانے میں تمہیں باتیں کرتے ہوئے دیکھا..... کافی دیر دروازے کی اوٹ میں کھڑا رہا اور دیکھتا رہا یہاں تک کہ ابا جی نے آ کر سرزنش کیا۔ اس کے بعد کتنی ہی بار تمہیں دیکھتے رہنے کے مشغلے میں مصروف رہا اور شبنم کی منگنی کے بعد ہی میں نے ابا جی سے تمہاری بات کر دی۔ ابا جی نے جیسے ہی چاچا جان سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔

انہوں نے شہناز کا رشتہ دے دیا میرے لاکھ منع کرنے پر پرانی وضع قطع کے حامل ابا جان نے رشتہ قبول کر کے نکاح کروا دیا۔ اس وقت مجھے ایسا لگتا تھا میں مر جاؤں گا۔ ہر روز خود کو مناتا بہلاتا کہ اس چاند کو میرا نصیب نہیں بننا تھا۔ شہناز کے مرنے کے بعد بھی دل پیچھے نہیں ہٹا۔ اس نے پیچھے ہٹنا بھی نہیں تھا۔ پھر حیدر بھائی نے بتایا کہ رخصتی میں عبدالرحیم کے گھر والے آنا کانی کرتے ہیں۔ میں نے خود اس کا پتہ لگانے کی ٹھانی اور جیسے ہی اس کی اصلیت میرے سامنے آئی۔ دل میں آیا کہ اس جیسے خبیث انسان کو جان سے مار دوں۔ حیدر بھائی نے بتایا کہ تم اس کے دفتر میں کام کرنے لگی ہو۔

شوکت علی کی بات کے اختتام پر زینت نے ہونق پن سے شوکت علی کی جانب دیکھا۔

ہاں زینت حیدر کو اور مجھے پتہ تھا تم اس کے دفتر میں کام کرتی ہو۔ میں چاہتا تھا کہ تمہیں اس کی اصلیت پتہ چل جائے۔ اچھا ہوا کہ وقت سے پہلے تمہاری آنکھیں کھل گئی اور تم نے میرے حق میں فیصلہ دے دیا.....

شوکت علی نے شرارت سے کہا۔ زینت نے تیکھے تیور سے اس کو گھورا.....

میں نے کب ہاں کی ہے شوکت علی.....

نہیں کی میں نے خواہ مخواہ ہی شبنم کی اور کلثوم باجی کو تمہاری رضامندی کا بتایا ہے چلو کوئی بات نہیں منع کر دیتا ہوں..... کار روکنے کے ساتھ شوکت علی نے موبائل نکالا۔

زینت نے چیل کی طرح جھپٹا مار کر موبائل اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا.....

اب سب کو پتہ چل گیا ہے تو چلنے دو.....

کیا مطلب میں سمجھا نہیں..... شوکت علی کی نگاہیں زینت کے چہرے میں الجھ سی گئیں۔

مطلب یہ کہ شوکت علی تم مجھے قبول ہو..... زینت نے شرمگیں مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر کہا اور شوکت علی کی بولتی نگاہوں اور گہری ہوتی مسکراہٹ نے اس کو منہ چھپانے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

خواب، خواہش، زندگی

شمینہ طاہر بٹ

پیروں پر چلنے والوں کے ساتھ تو ہر کوئی چل لیتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ کسی گرنے والے کو اپنے شانوں پر سوار
کروا کے چلا جائے اور یہی اصل مردانگی ہے کہ گرتے ہوؤں کو
سہارا دیا جائے، نہ کہ آخری دھکا دے کر زمین بوس کر دیا جائے

ایک ایسے شخص کا فسانہ جو زندگی میں ترقی کرنے کے لیے ہر ناجائز کام کو جائز سمجھتا تھا

''شہروز صاحب! آپ نے کبھی نول کا پھول دیکھا ہے؟'' میں جو اس حسینہ کے جلوؤں اور اداؤں میں کھویا ہوا، حال سے بے حال ہوا جا رہا تھا، اس کے لرزتے، کانپتے، ٹوٹے کانچ جیسے لہجے میں کیے گئے سوال پر چونک کر اس طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

''کنول کا پھول؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔ تم کھل کر کہو جو کہنا چاہ رہی ہو۔''

''ہاں شہروز صاحب! کنول کا پھول اپنی تمام تر خوبصورتی اور پاکیزگی کے باوجود اس کا نصیب کیچڑ کی دلدل میں کھلنا ہی لکھا ہوتا ہے؟ کیچڑ کی دلدل، گندے پانیوں کے جوہڑ ہی کنول کا نصیب کیوں ہوتے ہیں شہروز صاحب؟ پھول تو پھول ہی ہوتا ہے شہروز صاحب، کنول کا ہو یا گلاب کا۔ سب کو ایک جیسا ماحول کیوں میسر نہیں آ سکتا شہروز صاحب؟'' اس کی بڑی بڑی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں اس قدر اداسی اور یاسیت بھری تھی کہ میری روح کانپ کر رہ گئی۔ میرے حواسوں پر چھایا نشہ یکلخت ہی غائب ہو گیا اور میں بس ایک ٹک اسے دیکھتا ہی چلا گیا۔

☆☆☆

میرا نام شہروز حیدر آفندی ہے۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں اور اس لیے بہت لاڈلا بھی ہوں۔ میرے والد جج کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور امی ویمنز کالج کی وائس پرنسپل اور اسسٹنٹ لیکچرار۔ اسی لیے ہمارے گھر کا ماحول ہمیشہ ہی بڑا استعلیق رہا تھا۔ امی اور ڈیڈی میں بلا کی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ وہ ایک دوسرے کے دل کی بات بنا کہے ہی سمجھ جایا کرتے تھے، اور ان کی اسی ذہنی ہم آہنگی نے میری تربیت کو اس قدر متوازن اور اعلیٰ پائے کا بنا دیا تھا کہ ہمارے سارے سرکل میں مجھے ایک آئیڈیل شخصیت کے طور پر جانا جاتا تھا۔ شاید یہ اکلوتا ہونے کی وجہ تھی یا پھر واقعی میرے اندر قائدانہ صلاحیتیں موجود تھیں کہ میں جوں جوں بڑا ہوتا جا رہا تھا، ہر محفل کی جان بنتا جا رہا تھا۔ خاندان کے علاوہ اسکول اور کالج کے بعد یونیورسٹی تک آتے آتے میری مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا گراف بڑھتا ہی چلا گیا۔ بلکہ یونیورسٹی تک آتے آتے تو میری شخصیت کا سحر اس قدر بڑھ چکا تھا کہ میری رائے اور شمولیت کے بغیر کوئی ایونٹ، کوئی فنکشن کامیاب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پوری یونی میں میرے ہی نام کا طوطی بول رہا تھا۔ میں اپنی مقبولیت کو خوب انجوائے کر رہا تھا کہ، اچانک ایک دن ''وہ'' میری زندگی میں آ گئی۔ اور پھر اس نے آتے ہی ایک ایک کر کے مجھ سے میرے سارے عہدے، ساری نشستیں کچھ اس طریقے سے چھین لیں کہ میں بس کھڑا اس کا منہ ہی دیکھتا رہ گیا۔

میں ان دنوں ایم بی اے کے فائنل ایئر میں تھا۔ ہمارے اکنامکس ڈپارٹمنٹ کی ڈین سر اکرام اللہ بخاری کا ٹرانسفر سندھ یونیورسٹی میں ہو گیا۔ ہم نے ان کے اعزاز میں ایک پارٹی رکھی۔ میرے ساتھ ساتھ سب کو پورا پورا یقین تھا کہ میرے زیر نگرانی انجام پانے والی یہ فیئر ویل پارٹی بھی اپنے انتظامات کی وجہ سے سپر ہٹ جائے گی۔ پارٹی والے دن میں صبح ہی صبح یونی پہنچ گیا۔ اور میرے ساتھ ساتھ میرے تمام دوست بھی موجود تھے۔ ہم نے یہ پارٹی آڈیٹوریم ہال میں رکھنے کی بجائے اکنامکس ڈپارٹمنٹ کے ہرے بھرے لان میں رکھی تھی۔ وہ سردیوں کے خوبصورت دن تھے۔ پورے لان پر سردیوں کی نرم گرم دھوپ نے اپنے سنہری پنکھ پھیلا رکھے تھے۔ سر اکرام اللہ بخاری ہماری یونی کے ہر دلعزیز اساتذہ میں سے ایک تھے۔ ان کے آفس کے دروازے ہر اسٹوڈنٹ کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ وہ اس قدر شفیق انسان تھے ان کے پاس اپنا بڑے سے بڑا مسئلہ بھی لے جاتے ہوئے کبھی کسی کو کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اور پھر وہ بھی اپنی ازلی محبت اور خلوص کے ساتھ وہ سارے مسائل حل کرتے کبھی دل سے ان کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ میں اس فیئر ویل پارٹی کو ان کے شایانِ شان دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے زرخیز دماغ میں اس فنکشن کی کامیابی کے حوالے سے جو جو بھی آئیڈیاز آئے میں نے اپنے ساتھیوں سے ڈسکس کیے تھے۔ اور ہمیشہ کی طرح ہی میرے وہ تمام آئیڈیاز ہی انہیں اس قدر پسند آئے کہ بغیر کسی تامل کے سب نے نا صرف مان لیے بلکہ ان پر عمل بھی کر ڈالا تھا۔ سر اکرام اللہ کے اعزاز میں ہمارے ڈپارٹمنٹ کی طرف سے ظہرانہ دیا جا رہا تھا۔ ان کی طویل علمی خدمات کے اعتراف میں ہمارے ڈپارٹمنٹ کے علاوہ، تقریباً پورے یونی اسٹاف کی طرف سے بھی انہیں خراجِ تحسین پیش کیا جا رہا تھا۔ لان کے مرکزی حصے میں ہم نے اسٹیج بنایا تھا، جس پر پرنسپل صاحب کے ساتھ سر اکرام اللہ جلوہ افروز تھے۔ اسٹیج کے ایک طرف رکھے گئے روسٹرم پر ان کے رفقاء کے علاوہ ہم جیسے ان کے مداح، ان کے طلبہ بھی باری باری آتے اور سر کی شان میں قصیدے پڑھتے ہوئے انہیں خراجِ تحسین کے ڈونگرے برساتے چلے جا رہے تھے۔ کافی دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر اس کے بعد سر اکرام اللہ نے اپنے جذبات کا اظہار کیا، سر کو سب کی طرف سے تحائف دیئے گئے۔ پھر اس کے بعد کھانے کا دور چلا۔ میں اس تقریب کا منتظم اعلیٰ اور روح

رواں تھا، اس لیے ہمیشہ کی طرح اس پروگرام کی ممکنہ کامیابی کی خوشی کو دل سے محسوس کر رہا تھا۔ اور پھر میرے اندازوں کے عین مطابق جلد ہی مجھے رزلٹ بھی مل گیا۔ سر ابرام اور پرنسپل صاحب نے بطورِ خاص مجھے اپنے پاس بلا کر شاباش دی تھی۔ میرے ساتھیوں اور دوسرے کلاس فیلوز نے بھی میری انتھک محنت کو سراہا تو میرا سیروں خون بڑھ گیا۔ اس پر میرے بچپن کے دوست اسجد نے حسب معمول تعریفیں کر کر کے میرا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔ میں اس وقت خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا کہ اچانک اس پھولے ہوئے غبارے سے ہوا نکل گئی اور میں دھڑام سے زمین پر آن گرا۔

میں اور اسجد ہر طرف کا راؤنڈ لگا چکے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا، اسی لیے ہم بے فکر ہو کر ایک طرف کھڑے ہو گئے ہمارے بالکل پیچھے سرو کے اچھے خاصے گھنے درخت تھے، اور ان درختوں کے پیچھے سے ہی ایک جھنجھلائی نسوانی آواز ابھری تھی جس نے مجھے چاروں خانے چت کر دیا تھا۔

''اُف! توبہ ہے سبرینہ! اب بس بھی کر دو اور نکلو یہاں سے۔ میرے تو سر میں درد ہونے لگا ہے اس بے ہنگم شور سے۔ اُونہہ تم تو کہہ رہی تھیں کہ بہت اچھا پروگرام ہوگا اور بہت مزہ آئے گا، مجھے تو خاک بھی مزہ نہیں آیا۔ الٹا میرا تو سارا دن ہی ضائع ہو گیا تمہارے اس ''شو'' کے چکر میں۔''

''اوہو۔ کیا ہو گیا ہے یار! تم اتنی بیزار کیوں ہو رہی ہو؟ بس، تھوڑی دیر اور ناں پھر چلتے ہیں۔ میں سر بخاری سے آٹو گراف تو لے لوں!'' ابھی ہم پہلی آواز کے جھٹکے سے ہی نہیں سنبھلے تھے کہ دوسری قدرے جانی پہچانی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

''کیا؟ ابھی تھوڑی دیر اور؟ نہیں، بالکل بھی نہیں۔ اب مجھ میں ذرا بھی ہمت نہیں بچی اس سیاسی جلسے، جلوس والی بیہودہ ارینجمنٹ میں بیٹھ کر ہونق کی طرح سب کے منہ دیکھنے کی۔ بس، تم چلو یہاں سے۔ اور رہی سر سے آٹو گراف لینے کی بات تو تم اپنی آٹو گراف بک اپنے ڈپارٹمنٹ کے اس ''سپر ہیرو'' کو دے دوناں، جس کی شان میں قصیدے پڑھتے تم سمیت تمہارے پورے ڈپارٹمنٹ کی زبان نہیں سوکھتی۔ ہونہہ! جسے دیکھو، ''شہروز یہ، شہروز وہ'' اور شہروز صاحب نکلے کیا؟ حسن جمال سے عاری اور بالکل کورے بندے۔

''اونہہ!! تم بس چلو یہاں سے۔ میرا اب دم گھٹنے لگا ہے یہاں۔'' اس انجان لڑکی کے مُنہ سے نکلنے والے الفاظ نے میرا وجود ایک دھماکے سے اڑا کر رکھ دیا تھا۔ میں بے اختیار اس کی طرف بڑھا تھا، مگر اسجد نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روک لیا اور اشارے سے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔ میں شدید بے بسی کے عالم میں اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ وہ دونوں لڑکیاں تو جانے کب کی وہاں سے جا چکی تھیں، مگر جاتے جاتے میرا سکون اور اطمینان بھی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔

☆☆☆

اسجد میرا پکا اور سچا دوست تھا۔ وہ میری دلی کیفیت اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا، اسی لیے اس نے مجھے چھیڑا نہیں اور خود ہی ایک تنہا گوشہ دیکھ کر مجھے وہاں بٹھا دیا، خود باقی کے امور نپٹانے چلا گیا۔ پھر میں بھی زیادہ دیر وہاں رک نہ سکا، اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ واپس گھر چلا آیا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی اور امی ڈیڈی حسب معمول لان میں بیٹھے شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مجھے اس وقت اور اس طرح اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ دونوں ہی حیران رہ گئے۔ کیونکہ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ میں اپنا کوئی فنکشن اس طرح ادھورا چھوڑ کر آ گیا تھا۔ اور وہ بھی اس قدر اجڑی بکھری حالت میں۔ امی تو مجھے دیکھ کر دہل ہی گئیں۔ پریشان تو ڈیڈی بھی بہت ہو گئے تھے، مگر انہوں نے خود پر ضبط کا پہرہ بٹھا لیا اور خاموش نگاہوں سے میرا جائزہ لینے لگے۔ میں دور سے ہی انہیں سلام کرتا، ان سے

نگاہیں چراتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور وہ دونوں بس مجھے دیکھتے ہی رہ گئے۔

''جگر! اٹھ، چل تیار ہو جا جلدی سے۔ پتا چل گیا ہے اس مغرور حسینہ کا جس نے ہمارے شہزادے کا دل دکھانے کا جرم کیا ہے۔ چل اٹھ، چل کر ذرا اس سے اپنا حساب تو چکتا کریں!'' میں تکیوں میں مُنہ دیئے پڑا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھولتے ہوئے اسجد نے دبنگ انداز میں انٹری دیتے ہوئے پرجوش انداز سے کہتے ہوئے اس نے میرے اوپر سے کمبل کھینچ کر دور پھینک دیا۔ میں ظاہر ہے کہ اس افتاد کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا اس لیے گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

''او یار۔! ذرا چھری تلے دم تو لو۔ اور تم کیا کہہ رہے ہو، ذرا سمجھ تو آنے دو مجھے پہلے۔!''

''اب چھری تلے دم نہیں لینا۔ اب ان کے جگر پر چھریاں چلانے کی باری ہماری ہے۔ تم اٹھو ابھی اٹھو اور چلو میرے ساتھ۔'' اور پھر میرے لاکھ نہ نہ کے باوجود وہ مجھے تیار کروا کے یونی لے ہی گیا اور اس دن میری سمجھ میں آیا کہ اس پری وش کو میرا کام اگر پسند نہیں آیا تھا تو بالکل ٹھیک ہی تھا۔ وہ اسم بامسمیٰ تھی۔ سبرینہ، جو ہمارے ہی ڈپارٹمنٹ کی تھی، پریشے گل اس کی بیسٹ فرینڈ تھی۔ اور فائن آرٹ ڈپارٹمنٹ کی ذہین ترین اسٹوڈنٹس تھی۔ وہ سبرینہ کے اصرار پر ہی اس روز سر اکرام کی الوداعی پارٹی میں شریک ہوئی تھی۔ میں بڑے خراب موڈ میں اسجد کے ہمراہ ان دونوں سے ''پوچھ گچھ'' کرنے گیا تھا۔ مگر جیسے ہی اس نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا، میں سب کچھ بھول گیا۔ وہ تھی ہی اس قدر حسین کہ اس پر نگاہ ٹھہر ہی نہیں سکتی تھی اور اس پر اس کا سنجیدہ اور پروقار انداز کہ دل خود بخود ہی اس کی تکریم میں جھک جھک جائے۔ وہ ہلکے گلابی اور آسمانی کنٹراس کے لباس میں ملبوس تھی۔ اس کا گلابی اور آسمانی دوپٹہ بڑے قرینے سے اس کے صبیح چہرے کے گرد ہالے کی صورت لپٹا اس کے تقدس میں اضافہ کر رہا تھا۔ اب یہ اس کا رعبِ حسن تھا یا سادگی کہ میں اسے ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا بس چپ چاپ خاموشی سے اسے دیکھے چلا گیا۔

''سبرینہ! مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اور آپ کی دوست کو اس دن پارٹی میں مزہ نہیں آیا۔ ہماری وجہ سے آپ کا ٹائم بھی ویسٹ ہوا اور آپ دونوں کو بوریت بھی اٹھانا پڑی۔ میں اس کے لیے بہت شرمندہ ہوں اور آپ سے دلی معذرت چاہتا ہوں۔'' میرے مُنہ سے نکلنے والے ان الفاظ نے جہاں ان دونوں کو چونکایا تھا، وہیں اسجد بھی حیرت سے مجھے گھورنے لگا تھا۔ مگر میں جانے کیوں شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ اور اپنی اس حالت کی تو خود مجھے بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی تو دوسروں کو بھلا کیا سمجھاتا۔

''ارے نہیں شہروز! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ آپ جیسا سمجھ رہے ہیں ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تو اس دن پری کی واقعی طبیعت بہت خراب تھی، اسی لیے یہ جانے کیا اناپ شناپ بول گئی ورنہ سچ کہہ رہی ہوں، فنکشن اتنا بھی برا نہیں تھا جس قدر یہ واویلا مچا رہی تھی۔'' اب میری ظاہری حالت ایسی ہو رہی تھی یا واقعی میری شرمندگی سبرینہ کو بھی اس قدر شرمندہ کر گئی تھی کہ وہ بے ساختہ مجھے تسلی دینے والے انداز میں بولتی چلی گئی یہ سوچے بنا کہ وہ بول کیا رہی ہے۔ سبرینہ کی بات سن کر ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میری اور پری کی نگاہیں ملیں، اور پھر ہم دونوں کی ایک ساتھ ہی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ پہلے تو حیرت سے ہمیں ہنستا دیکھتی رہی، پھر نا سمجھی سے شانے اچکاتے ہوئے اسجد کو دیکھنے لگی، مگر اسے بھی ہماری طرح ہنستا دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئی اور پھر خود بھی ہمارے ساتھ ہنسنے لگی اور پھر اس دن کے بعد سے ہم چاروں کے درمیان دوستی کا ایک رشتہ سا بن گیا جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

میرا اور اسجد کا جیسے ہی ایم بی اے مکمل ہوا، ہم دونوں

عملی زندگی میں کود پڑے۔ میں نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی جوائن کر لی اور اسجد نے اپنے ابو اور بھائی کے ساتھ فیملی بزنس جوائن کر لیا۔ پری اور سبرینہ کا لاسٹ سمسٹر چل رہا تھا، اس لیے ہم دونوں ان سے ملنے کبھی کبھار یونی چلے جاتے۔ مگر میں چاہ کر بھی اپنے دل کی بات کبھی اسے بتا نہیں پایا تھا۔ یہ اس کا گریز تھا یا اس کے وجود پر چھایا وقار کہ میرے دل کی بات کبھی زبان پر آ ہی نہیں پائی تھی۔ مگر اسجد اور سبرینہ کی گاڑی پوری رفتار سے پیار کی پٹڑی پر دوڑ رہی تھی اور پھر ان کی گاڑی کو منزل مل ہی گئی۔ اسجد اور سبرینہ کے گھر والوں نے ان کے رشتے کو منطقی انجام تک پہنچا ہی دیا۔ ان کے ساتھ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا تھا۔ ان دونوں کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے اور ظاہر ہے کہ ہم بھی ان کی خوشی میں دل سے خوش تھے۔

''ہاں بھئی برخوردار! تمہارا دوست تو ٹھکانے لگا۔ اب تم بتاؤ تمہارے کیا ارادے ہیں؟ ہے کوئی حسینہ نظر میں یا پھر یہ کارنامہ بھی ہمیں ہی انجام دینا پڑے گا؟''

اسجد اور سبرینہ کی شادی کا کارڈ دیکھتے ہوئے ڈیڈی نے اپنے نرم گرم انداز میں میری کھنچائی کی تو میں جھینپ کر رہ گیا۔ پہلے تو میرا دل چاہا کہ جھٹ سے پری کا نام ان کے سامنے رکھ دوں، مگر پھر مجھے اس کا گریز اور اس گریز کی وجہ یاد آ گئی۔

''سوری شہروز! جو آپ چاہتے ہیں وہ ہو نہیں سکتا۔ میں اپنے علاقے، اپنے قبیلے کی پہلی لڑکی تو نہیں جو اس یونیورسٹی تک پہنچی ہوں، مگر ہاں، میں وہ پہلی لڑکی بھی نہیں بننا چاہتی جو اپنے والدین کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر ان کا اونچا شملہ جھکا دے۔ اپنے علاقے کے رسم و رواج کے خلاف جانے کی مجھ میں واقعی ہمت نہیں ہے شہروز۔ اس لیے پلیز، اپنے بڑھتے قدموں کو یہیں روک لیں۔ میں اس سفر میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔'' یہ پری کے وہ الفاظ تھے جنہوں نے میرے سارے منہ زور جذبوں پر جیسے بند باندھ دیئے تھے۔ ظاہر ہے وہ میری محبت تھی اور میں اپنی محبت کی رسوائی کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس لیے میں خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا۔

''ارے نہیں ڈیڈی! ایسی کوئی بات نہیں مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں، بلکہ میں نے کبھی کسی کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں امی سے ضرور شیئر کرتا کہ اگلے مراحل تو بہر حال آپ دونوں کو ہی انجام دینے تھے۔'' میں نے خود پر بمشکل کنٹرول کرتے ہوئے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا تو امی میری ''فرمانبرداری'' پر نہال ہی ہو گئیں۔

''دیکھا! میں نہیں کہتی تھی کہ ہمارا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ وہ ضرور ہمارا مان رکھے گا اور اپنی زندگی کے سب سے بڑے فیصلے کا اختیار ہمیں ہی دے گا۔ آپ تو ایسے ہی اس کی طرف سے شکوک و شبہات کا شکار ہو رہے تھے۔'' امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے بیگم صاحبہ! آپ حالات بھی تو دیکھیں ناں۔ آج کل تو ہر طرف بس ایک ہی ہوا چل رہی ہے۔ آج کل کے نوجوانوں کو بس اپنی پسند پر ہی بھروسہ ہے۔ وہ کسی اور کی پسند پر اعتبار کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تو پھر ایسے میں ہم جیسے بزرگوں کا مشکوک ہونا تو بنتا ہی ہے ناں۔'' ڈیڈی نے اپنی انوکھی منطق کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا کہ امی انہیں گھور کر رہ گئیں اور میری بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔ ڈیڈی بھی میرے ساتھ قہقہے لگانے لگے۔ امی کچھ دیر تو خاموشی سے جارحانہ انداز سے ہمیں گھورتی رہیں، اور پھر خود بھی ہمارے ساتھ ہماری ہنسی میں شامل ہو گئیں۔ اسجد اور سبرینہ کی شادی بہت دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ وہ اپنے والدین کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا تھا تو سبرینہ بھی دو بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن اور اپنے والدین کی اکیلی بیٹی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں گھرانے اپنے پورے ارمان نکالنے کے چکر میں تھے۔ میری اور پری کی تو ساری ہی فیملی انوائیٹڈ تھی، اور اس کے ساتھ ساتھ یونی کے کافی دوست بھی انوائیٹڈ تھے۔ اسجد اور سبرینہ کی شادی میں پری

اور میں سب سے آگے آگے تھے اور یہ ہمارے حق میں بہت اچھا ہوا، کیونکہ پری امی کے دل کو بھا گئی تھی۔ امی جان نے باتوں باتوں میں پری کی اموجان سے ان کا پورا شجرہ اگلوالیا۔ اسجد کے شادی کے فلنکشنز جیسے ہی ختم ہوئے امی اور ڈیڈی ایک خاص مشن پر روانہ ہوگئے۔ مجھے انہوں نے ہر معاملے سے انجان رکھا تھا۔ شاید ان کا ارادہ مجھے سرپرائز دینے کا تھا۔ بہرحال ان کی کاروائیوں کا مجھے اس وقت علم ہوا، جب پری کے بابا جان اور اموجان اپنی پوری فیملی سمیت ہمارے گھر ڈنر پر آئے تھے۔ میں ان سب سے اسجد کی شادی میں مل چکا تھا، اور کچھ وہ پری کے والدین اور بھائی بھابی تھے اس لیے بھی مجھے ایک خاص قسم کی خوشی محسوس ہورہی تھی۔

''ہاں تو شہروز میاں! اب آگے کا کیا ارادہ ہے؟ اپنا بزنس اسٹارٹ کرو گے یا پھر کہیں جاب وغیرہ کا پروگرام ہے؟'' اسفند بھائی نے گرین ٹی کا سپ لیتے ہوئے اچانک مجھ سے سوال کیا تو میں ایکدم گڑبڑا سا گیا کیونکہ اس سے پہلے بار سیاست کی ہورہی تھی اور میری دلچسپی سیاست میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں تو اس گتھی کو سلجھانے میں ہلکان ہوا جارہا تھا کہ پری ان سب کے ساتھ کیوں نہیں آئی۔ کہ بھیا نے اچانک اپنی توپوں کا رخ میری طرف موڑ دیا جس کی وجہ سے میں ہونق بن کر رہ گیا۔ میری حالت دیکھ کر سب ہی ہنسنے لگے اور میں خواہ مخواہ ہی شرمندہ ہوکر رہ گیا۔

''جی وہ! اپنا بزنس تو ابھی اسٹارٹ نہیں کروں گا۔ ابھی تو اچھی جاب چل رہی ہے، ویسے بھی میں نے کچھ اور اچھی ملٹی نیشنل کمپنیز میں اپلائی کررکھا ہے۔ امید ہے جلد ہی کہیں اچھی سی جاب مل جائے گی۔'' میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے قدرے انکساری سے کہا تو بابا جان تائیدی انداز میں سر ہلاتے مجھے سراہنے لگے۔

''بھئی اسفند بیٹا آپ ہمارے بیٹے کو انڈر اسٹیمیٹ مت کریں۔ یہ جو بھی سوچتے ہیں، کرگذرتے ہیں۔ اور جو بھی ٹھان لیں، پھر اس سے پیچھے نہیں ہٹتے، کرکے دکھاتے ہیں۔ بہت فوکسڈ اور کمپوزڈ پرسنالٹی ہے ہمارے بیٹے کی۔ ماشاءاللہ۔'' امی نے محبتوں سے چور انداز میں میری تعریف کی تو میں کھل کر مسکرا دیا اور قریب بیٹھی امی کے شانوں پر بازو پھیلا کر انہیں ساتھ لگالیا۔ یہ شاید ہم ماں بیٹے کی محبت کا اثر تھا، یا پھر قسمت مجھ پر مہربان تھی کہ بابا جان نے اسی وقت مجھے سند قبولیت بخش دی۔ بس، پھر سب کچھ خود بخود ہی طے ہوتا چلا گیا۔ اور پھر صرف دو ماہ کے اندر اندر پری میری زندگی میں محبتوں اور خوشیوں کے رنگ بھرنے ہمیشہ کے لیے چلی آئی۔

پری نے ہمارے گھر کو واقعی جنت نظیر بنا ڈالا تھا۔ ڈیڈی کو گارڈننگ کا بے حد شوق تھا اور ان کے اس شوق کو پری نے مہمیز کیا تھا۔ وہ تو خود بھی پھولوں کی دیوانی تھی، اب ڈیڈی کے ساتھ مل کر اس نے گھر کے لان کو جنت کے ٹکڑے میں بدل دیا تھا۔ امی کو کوکنگ اور نٹنگ کا شوق تھا، اور پری یہاں بھی ایک ایکسپرٹ کی طرح ان کے ساتھ ساتھ تھی۔ سو لان کی طرح ہماری ڈائننگ ٹیبل پر بھی خوب رونق اور بہار نظر آتی تھی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ پری کا ساتھ ملنے کے بعد مجھے دنیا میں ہی جنت کے نظارے آنے لگے تھے۔ راوی ہر طرف چین ہی چین لکھ رہا تھا، مگر ہر وقت کا سکھ چین بھی بندے کو راستے سے بھٹکا دیتا ہے شاید۔ اور اسی لیے اللہ پاک نے اس دنیا میں جنت کا تصور ہی رکھا ہے۔ جن جن لوگوں نے دنیا میں اپنی جنت کی تعمیر کی، وہ اسی دھوکے میں الجھ کر رہ گئے، اور ویسے بھی کہتے ہیں کہ کشش کسی بھی چیز کی صرف اس وقت تک ہی رہتی ہے، جب تک وہ ہماری دسترس میں نہیں آجاتی۔ دسترس میں آجانے کے بعد تو شاید کوہ نور بھی اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے۔ اور یہ سب کچھ تو میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔

ہماری شادی کو دس سال بیت چکے تھے۔ ڈیڈی اور امی اب اپنی ریٹائرڈ لائف گذار رہے تھے۔ پری کی کشش اب بھی ویسے کی ویسی ہی تھی۔ حالانکہ ہمارے دو بچے ہو

چکے تھے۔ آٹھ سالہ بہروز اور پانچ سالہ مہروز۔ ان دونوں میں وادادادی کی جان تھی۔ پری کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی اس کی تربیت میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی جاب پر تھا اور اب تو ترقی کرتے کرتے ''جی ایم'' کے عہدے پر فائز ہو چکا تھا۔ میری جاب اور امی ڈیڈی کا سوشل سرکل ایسا نہیں تھا کہ ہم گمنامی کی زندگی گذارتے۔ ہماری پرسنل لائف بہت سوشل اور ایکٹیو تھی۔ ہر ہفتے ہی ہم کہیں نہ کہیں مدعو ہوتے تھے۔ اور ہم بھی مہینے میں ایک دو پارٹیز تو ضرور ارینج کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ ان پارٹیز کو پری ہی مینج کرتی تھی اور اس کی ارینج کی گئیں پارٹیز کو دیکھ کر مجھے اپنی ارینج کی گئیں پارٹیز یاد آجاتیں تو میں بے ساختہ جالت سے مسکرا دیتا کہ ان پارٹیز پر واقعی کسی جلسے کا ہی گمان ہوتا تھا۔ وہ ہر بار ایک نیا اور اچھوتا آئیڈیا لاتی اور ہماری ہر پارٹی پہلی سے زیادہ کامیاب اور شاندار ٹھہرائی جاتی۔ لیکن ایک بات تھی کہ اس سارے ہنگامے اور اس قدر شدید مصروفیات کے باوجود بھی ہم لوگ ایک پل کے لیے بھی ایک دوسرے سے غافل نہیں رہتے تھے۔ یہ ہمارا آپس کا پیار تھا یا پھر شاید ہماری کیمسٹری ہی ایک دوسرے سے کچھ اس طرح مل چکی تھی کہ ہم بنا کہے ہی ایک دوسرے کے دل کی بات جان جایا کرتے۔

☆☆☆

میں نے کہا ناں کہ وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ اور میرا وقت بھی آہستہ آہستہ بدلنے لگا تھا۔ ہماری برانچ میں کچھ نئے ایمپلائز ٹرانسفر ہو کر آئے۔ وہ سب اچھے عہدوں پر تھے اور ملک کے گوشے گوشے سے پرموٹ ہو کر آئے تھے۔ میں ان سب کی کیس ہسٹری دیکھ رہا تھا۔ میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ نئے آنے والوں میں، کون کس کیٹگری کا ہے۔ یہ سب میرے آفس کے ماحول اور میرے کام کے لیے بہت ضروری تھا۔ ان نئے آنے والوں میں سب ہی پرموشن پا کر آئے تھے سوائے ایک بندے کے۔ اور اس ایک بندے کے کوائف نے مجھے بری طرح چونکا دیا تھا۔ جنید کا تعلق پشاور برانچ سے تھا۔ وہ وہاں جس پوسٹ پر تھا، اسے یہاں بھی اسی پوسٹ پر ٹرانسفر کر دیا گیا تھا۔ کیوں؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے کم از کم میرے آفس میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ مسٹر انور (میرے پی اے) نے سب نئے آنے والوں سے تعارف کے لیے فوری طور پر ایک میٹنگ ارینج کر دی تھی۔ میٹنگ میں سب نئے آنے والوں سے مل کر ہمیشہ کی طرح اچھا ہی لگا تھا۔ ہمارا نیا سٹاف بھی پہلے اسٹاف کی طرح بہت قابل اور ذہین افراد پر مشتمل تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ ہم سب مل کر اپنی برانچ کو پہلے سے بھی زیادہ ترقی کی بلندیوں تک لے جائیں گے۔

میں اپنے نئے ساتھیوں سے مطمئن تھا، مگر جنید سے مل کر مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ کچھ تھا اس بندے کی آنکھوں میں جو بار بار مجھے چونکا رہا تھا کیا؟ میں خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ جلد ہی سب نئے لوگ آفس کے ماحول سے ایڈجسٹ ہو گئے۔ اور ہم نے بھی انہیں اپنے آفس کا حصہ تصور کر لیا۔ جنید کا رویہ میرے ساتھ بہت نیاز مندانہ سا تھا۔ اس کے اس قدر عقیدت اور عاجزی بھرے خوشامدی انداز سے بعض اوقات مجھے سخت کوفت ہونے لگتی۔ لیکن پھر میں خواہ مخواہ ہی شرمندہ بھی ہو جاتا۔ یہ تو اس کی عادت تھی۔ وہ میرے علاوہ اپنے دوسرے سینئرز کے ساتھ بھی یہی رویہ اپنائے رکھتا تھا۔ بلکہ وہ سب کے آگے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ اس کا یہ خوشامدی بھرا، جی حضوری والا انداز، اس کی شاندار پرسنالٹی کے ساتھ بالکل بھی میل نہیں کھاتا تھا۔ وہ بلا کا وجیہ و جمیل تھا۔ جانے اسے اپنی وجاہت کا احساس ہی نہیں تھا یا پھر وہ یہ احساس کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ بہر حال، اس کی یہی عادتیں اسے سب کے مذاق کا نشانہ بناتی تھیں۔ لیکن حیرت اس بات پر تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کے کسی بھی مذاق کا برا نہیں مانتا تھا۔ میں اکثر اس کی شخصیت کے اس پہلو پر غور و فکر کرتا، مگر کوئی سرا

ہاتھ نہیں آتا تھا۔

''شہروز! آج تمہارے آفس سے کوئی مسٹر جنید اپنی مسز کے ساتھ آئے تھے۔'' میں ڈنر کے بعد بہت ریلکس ہو کر لاؤنج کے صوفے پر نیم دراز، ٹی وی پر اپنا فیورٹ ٹاک شو دیکھ رہا تھا کی پری نے میرے سامنے گرین ٹی کا کپ رکھتے ہوئے سرسری سے انداز میں اطلاع دی تھی۔

''کیا؟ جنید، اور یہاں؟ ہمارے گھر؟ ارے، وہ آیا کیوں تھا، اور اسے اجازت کس نے دی یہاں آنے کی؟'' میں جنید کا نام سنتے ہی جھنجھلا گیا اور تیزی سے اندازِ نشست بدلتے ہوئے بہت تیز لہجے سے بولا تو پری کے ساتھ ساتھ امی اور ڈیڈی بھی میرا منہ دیکھنے لگے۔ جو دوسرے صوفے پر بیٹھے گرین ٹی اور ٹاک شو سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''شہروز! کیا ہوا ہے بیٹا؟ اور یہ کون سا طریقہ ہے بات کرنے کا؟'' امی نے اپنا کپ سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے سنجیدہ اور ٹھنڈے لہجے میں مجھ سے کہا تو میں فوراً سنبھل گیا۔

''سوری امی! بس، وہ جنید کا نام سنتے ہی جانے کیوں مجھے غصہ آ گیا اور میں ایکدم ہائپر ہو گیا۔ حالانکہ آپ جانتی ہیں کہ میرا ٹیمپر امنٹ ایسا نہیں ہے۔'' میں نے سب کے سنجیدہ اور خفگی بھرے تاثرات دیکھتے ہوئے خفت زدہ انداز سے کہا تو پری سنجیدگی اور غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔

''ایسا کیا ہے شہروز، کہ جنید صاحب کا نام سنتے ہی آپ کو غصہ آ گیا؟ حالانکہ آپ کے کولیگز اور اسٹاف ممبرز تو اکثر آتے ہی رہتے ہیں ہمارے ہاں۔ even کہ ہماری پارٹیز میں بھی آپ کے کولیگز کی شرکت معمول کی بات ہے، تو پھر اب ایسا کیا ہو گیا کہ آپ اپنے ایک ایمپلائی کی آمد کا سنتے ہی اس قدر بھڑک اٹھے کہ خود پر قابو ہی کھو بیٹھے؟'' پری کی سنجیدہ اور اندر تک اترتی نگاہوں نے تو مجھے پہلے ہی گڑبڑا کر رکھ دیا تھا، اب اس کے سنجیدگی سے پوچھے گئے سوال نے مجھے شرمندہ بھی کر دیا تھا۔ اور اس پر امی ڈیڈی کی سوالیہ نگاہیں۔

''ارے، نہیں پری! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تو بس ایسے ہی۔۔۔۔۔!!''

''ہاں، تو وہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ'' ایسے ہی کیا؟'' ارے، آپ تو ان کی آمد کا ہی سن کر اس قدر ہائپر ہو گئے اور جب آپ کو یہ پتہ چلے گا کہ وہ ہمیں ڈنر پر انوائٹ کر گئے ہیں تو۔۔۔۔!!''

''کیا؟ ڈنر؟ اور وہ بھی ہم دونوں کو؟ ارے پری۔ کہیں تم نے انکا انویٹیشن قبول تو نہیں کر لیا؟ میں بتا رہا ہوں تمہیں کہ میں نہیں جا رہا کہیں۔۔۔۔!!

''شہروز۔!! enough is enough۔ بس، بہت ہو گئیں یہ تمہاری بیوقوفوں والی باتیں۔ اب اگر تم نے کوئی فضول بکواس کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ سمجھے تم۔'' ڈیڈی سے شاید میرا یہ بیوقوفوں والا بچگانہ رویہ برداشت نہیں ہو رہا تھا، اسی لیے انہوں نے ایکدم میری بات سختی سے کاٹتے ہوئے اپنے مخصوص'' کھردرے اور جارحانہ'' انداز سے مجھے لتاڑا تو میں ایکدم جیسے ہوش میں آ گیا۔

''اوہ، ڈیڈی! سوری، مجھے لگتا ہے کہ آج واقعی میری طبیعت کچھ خراب ہے اسی لیے''

''اور ہمیں لگتا ہے کہ آج تمہارا دماغ ہی خراب ہو گیا ہے، اسی لیے ایسی الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو۔ کیوں پری بیٹا، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں۔'' امی نے بھی اپنے نرم شفیق انداز میں مسکراتے ہوئے میری بات کاٹی تو سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں میری جھینپی جھینپی سی مسکراہٹ بھی شامل تھی۔

''شہروز! میں نے مسٹر اور مسز جنید کا انویٹیشن ایکسپٹ کر لیا ہے۔ اس ہفتے کو ہم ان کی طرف جا رہے ہیں۔ آپ یاد رکھئے گا، اور پلیز اس روز کوئی مصروفیت مت نکال لیجئے گا۔ مجھے آپ کی نیت پر ابھی سے شک ہونے لگا ہے۔'' پری نے خالی کپ سمیٹتے ہوئے کچھ اس انداز سے کہا کہ میں صرف گہرا سانس بھر کر رہ گیا۔

☆☆☆

ہفتے کی شام ہم دونوں جنید کے دیئے گئے ایڈریس پر جا پہنچے۔ جنید کا گھر ہمارے گھر کی مخالف سمت میں تھا، ایک تو لمبی ڈرائیو اور اس پر ایڈریس شاید درست نہیں تھا، سو ہمیں گھر ڈھونڈنے میں ہی بہت وقت لگ گیا۔ راستے کی خواری اور دل نہ ماننے کی اوازاری نے میرا موڈ بہت خراب کر دیا تھا مگر میں پری کا جوش دیکھ کر خود پر جبر کر گیا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی، نرم دل، پر خلوص اور کسی کا دل نہ توڑنے والی۔ جیسے ہی ہم مطلوبہ جگہ پر پہنچے، جنید اور اس کی مسز کو اپنا منتظر پایا۔ وہ دونوں گھر سے باہر نکل کر سڑک پر بے چینی سے ٹہلتے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی ہماری گاڑی ان کے قریب رکی، ان کے چہروں پر جیسے بہار آ گئی۔ جنید لپک کر آگے بڑھا اور پری کی سائیڈ والا دروازہ کھول کر کچھ اس عاجزانہ انداز سے اسے ویلکم کرنے لگا کہ ایک لمحہ کو تو پری بھی گڑبڑا گئی۔ پری کے باہر قدم رکھتے ہی میں نے بھی برے موڈ کے ساتھ اپنا دروازہ کھولا اور جیسے ہی باہر قدم نکالا اپنے سامنے کھڑی اپسرا کو دیکھ کر بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

''آئے ناں سر! آپ کے انتظار میں تو ہماری آنکھیں بھی پتھرا گئی تھیں۔ سچ، بہت انتظار کروایا آپ نے۔'' اس حسین ترین لڑکی کے بولنے کا انداز بھی بے حد حسین تھا۔ اس کی آواز، اس کا انداز اس قدر دلنشیں تھا کہ ایک لمحے کو تو میرا سانس ہی بند ہو گیا۔ میں بس آنکھیں کھولے، مُنہ پھاڑے ہونقوں کی طرح اس مہ جبیں کو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

''شہروز چلیں ناں۔ کیا ہوا آپ کو؟ آپ رک کیوں گئے؟'' پری، جنید کے قریب کھڑی میرے باہر نکلنے کا انتظار کر رہی تھی، اور جب اس نے مجھے اس طرح آدھا گاڑی کے اندر اور آدھا باہر، بت کی طرح ایستادہ دیکھا تو ٹوکے بنا نہ رہ سکی۔

''جی سر۔!! آیئے ناں پلیز۔!!'' اس حسینہ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس ادا سے کہا کہ میں ایک بار پھر گڑبڑا سا گیا اور فوراً گاڑی سے باہر نکل آیا۔ پری کچھ فاصلے پر کھڑی ہمیں سرسری سے انداز سے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ حسینہ پری سے مل رہی تھی۔ اس کے انداز میں بہت گرم جوشی اور محبت بھری تھی۔ پری بھی اس سے مل کر بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ اگلے چند لمحوں میں ہم ان کے ڈرائینگ روم میں بیٹھے تھے۔ جنید نے اس حسینہ کا تعارف ''خوشبو'' کے نام سے کروایا۔ وہ واقعی مہکتی ہوئی خوشبو ہی تھی۔ میں جتنے برے دل اور خراب موڈ کے ساتھ وہاں آیا تھا، اب اسی قدر خوش اور شاد دکھائی دے رہا تھا۔ خوشبو کسی پروانے کی طرح میرے ہی ارد گرد منڈلا رہی تھی۔ جنید اگر پری کو فل پروٹوکول دے رہا تھا تو خوشبو بھی مجھے ہاتھوں ہاتھ لے رہی تھی۔ ہم نے وہاں بہت اچھا وقت گذارا۔ اس روز جنید کی چند اور خوبیاں مجھ پر کھلیں تھیں۔ وہ بہت خوش مزاج اور ملنسار انسان تھا۔ بہت ذہین بھی تھا اور شاید محنتی بھی۔ مگر اس کے باوجود اسے ابھی تک پرموشن کیوں نہیں مل سکا تھا؟ اس کی وجہ ابھی بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ہم رات گئے تک وہاں بیٹھے رہے۔ کھانے اور گرین ٹی کے بعد خوشبو، جنید کے کہنے پر اپنا ستار اٹھا لائی۔ اس کی آواز بھی اس کی طرح بے پناہ دلکش تھی۔ پری بھی اس کی آواز کے سحر میں جیسے کھو سی گئی تھی۔ اب ان دونوں میں بہت اچھی دوستی ہو چکی تھی اور مجھے بھی اپنے گزشتہ رویئے پر دل ہی دل میں پشیمانی ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

جنید کا اور میرا رشتہ اب باس اور ایمپلائی سے بڑھ کر دوستی تک جا پہنچا تھا۔ اب وہ اکثر ہی لنچ ٹائم میں میرے کیبن میں آ جاتا۔ اس کے ساتھ خوشبو کے ہاتھوں سے بنے مزیدار اور خوشبودار کھانے بھی ہوتے، جو بقول جنید کے خوشبو خاص طور سے میرے لیے بنا کر بھیجتی تھی۔ پہلے پہل تو جنید کی اس طرح کی باتیں مجھے عجیب سے احساس میں مبتلا کر جاتیں، مگر پھر آہستہ آہستہ میں ان کا عادی ہوتا

چلا گیا۔ بھئی، ظاہر ہے، میں کوئی ''زاہد خشک'' قسم کا انسان تو نہیں تھا، کہ اتنی حسین و جمیل ہستی میرے آگے پیچھے پھرے، میرے لیے اپنے حسین ہاتھوں سے کھانے بنا بنا کر بھیجے اور میں پھر بھی اسے اگنور کرتا چلا جاؤں۔ سو، میں نے بھی اس ''خصوصی پروٹوکول'' کو خوب انجوائے کرنا شروع کر دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے میں ان دونوں کے اس قدر نزدیک آ گیا کہ اب اگر چند دن بھی ان کے گھر کا چکر نہ لگا پاتا تو خود کو ادھورا محسوس کرتا۔ میرے من کے اندر دور دور تک ایک انجانی سی پیاس پھیلتی چلی جاتی۔

''شہروز جی! کیا آپ آج لنچ میرے ساتھ کر سکتے ہیں؟ پلیز۔'' میں اپنے آفس میں بیٹھا بہت ضروری فائلز کے ساتھ الجھ رہا تھا کہ خوشبو کی کال آ گئی۔ ایک لمحے کو تو میرا دل کیا کہ اسے منع کر دوں، کیونکہ کام کا بوجھ بہت زیادہ تھا۔ آفس میں ان دنوں کلوزنگ سیزن چل رہا تھا اور ایسے وقت میں اس قسم کی عیاشی کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ مگر کیا کریں۔ اس کا انداز میں اس قدر مان، اتنی محبت اور ایسی التجا تھی کہ میں چاہتے ہوئے بھی اسے انکار نہ کر سکا۔

''ہوں۔!! ٹھیک ہے خوشبو۔ میں تمہاری خوشی کے لیے آ جاؤں گا۔ مگر یاد رکھنا، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اس لیے میں تمہارے پاس زیادہ دیر رک نہیں پاؤں گا۔'' میں نے اس سے وعدہ کرتے ہوئے اپنی مجبوریوں کو بھی مدِ نظر رکھنا ضروری سمجھا تھا۔

''جی جی شہروز! آپ چاہیں تو تھوڑی دیر بعد ہی واپس چلے جائے گا۔ مجھے تو بس آپ سے ملنا، آپ کو دیکھنا ہی ہے۔ آپ کتنے دنوں سے آئے ہی نہیں مجھ سے ملنے۔ میرا بہت دل چاہ رہا ہے آپ کو دیکھنے، آپ کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے کو۔ آپ بس تھوڑا سا وقت میرے ساتھ گذار لیں تو میں مطمئن ہو جاؤں گی۔'' اس کی باتیں میرے دل کی کلی کھلا رہی تھیں۔ میرا اب آفس میں بیٹھنا بھی محال ہو رہا تھا، سو میں وقت سے پہلے ہی وہاں سے اٹھ آیا۔

''خوشبو! جنید کہاں ہے؟ وہ آج آفس بھی نہیں آیا اور اس وقت بھی وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' مجھے اس کے پاس بیٹھے آدھا گھنٹہ گذر چکا تھا، اور اس دوران وہ ایک بار بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ویسے بھی جب سے میرا خوشبو کے ساتھ ربط زیادہ بڑھا تھا، جنید کے رویئے میں ایک خاص قسم کا استحقاق آتا جا رہا تھا۔ اب وہ جب دل چاہتا آفس سے چھٹی مار لیتا۔ اور جب دل چاہتا اپنا کام آدھا ادھورا چھوڑ کر غائب ہو جاتا۔ اس کے آفس ٹیبل پر اکثر فائلوں کا انبار لگا رہتا، مگر اسے اس کی کوئی پرواہ ہی نہ ہوتی۔ ایسے وقتوں میں اس کے پاس سب سے آسان حل یہ ہی رہ جاتا کہ وہ خوشبو کے ذریعے اپنا اُلو سیدھا کرنے کی کوشش کرتا۔ خوشبو کا ایک فون آتے ہی میں جنید کو اس گرداب سے نکالنے کے لیے فوراً آگے بڑھتا اور اس کے حصے کا کام سارے اسٹاف میں اس طرح بانٹ دیتا کہ کسی کو شک بھی نہ ہو اور اس کا کام بھی ہو جائے۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے اس عمل کی شاید کسی کو بھی خبر نہیں ہو پائے گی، مگر میں غلط تھا۔ میں جس پوسٹ پر بیٹھا تھا، وہاں اس قسم کی ہیرا پھیریوں کی نہ تو گنجائش تھی اور نہ ہی ضرورت۔ مگر میں اپنے دل کا کیا کرتا کہ خوشبو کی ایک ملتجیانہ کال پر میں شاید اپنا منصب بھی بھول جاتا تھا۔ مگر میرا اسٹاف سب سمجھتا تھا۔ سب جانتا تھا۔ انہیں جب اپنے کام کے ساتھ ساتھ جنید کے حصے کا بھی کام کرنا پڑتا تو وہ خوب ناک بھوں چڑھاتے۔ مگر میرے رعب کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پاتے تھے۔ اور اب تو ویسے بھی ہمارے آفس کا ماحول بہت بدل چکا تھا۔ جنید کی دیکھا دیکھی سب کو آپو دھاپی پڑ چکی تھی۔ اور اس پر آج کل ہیڈ آفس سے بھی نت نئے احکامات جاری ہو رہے تھے، اور اس لیے بھی دفتر میں ایک سراسیمگی کا عالم پھیلا ہوا تھا۔ لیکن جنید صاحب کا وہی حال تھا۔ دل کیا تو کام کر لیا، ورنہ ''خوشبو'' یا ''پری بھابی'' سے ایک فون کروایا اور اللہ اللہ خیر صلی۔ اور یہی وجہ تھی کہ

مجھے اچانک ہی اس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تو میں اس کے بارے میں پوچھ بیٹھا۔

''وہ تو پشاور گئے ہوئے ہیں۔ ان کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے انہیں جانا پڑ گیا۔ بس، ایک دو دن تک آجائیں گے واپس۔!!'' میرے سامنے سلاد کی پلیٹ رکھتے ہوئے اس نے بڑی ادا سے کہا تو میں بس اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اس وقت سیاہ شیفون کی باریک اور نفیس سی ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ جس پر ننھے منے سلور اسٹونز ہیروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اس کے لمبے سیاہ لہراتے بال اس کی پشت پر آبشار کی طرح پھیلے تھے۔ بے حد خوبصورتی سے کیا گیا نفیس سا میک اپ اس کے حسن کو دوآتشہ کر رہا تھا۔ میری نگاہیں بار بار اس کے مرمریں جسم پر پھسل رہی تھیں۔ وہ لہراتی بل کھاتی جس طرف بھی جاتی، میری نگاہیں بے تابی سے اس کے تعاقب میں اس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھیں۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ اپنے بھٹکتے دل اور الجھتے دماغ کو قابو میں کرنے کے لیے ہی میں نے اس سے جنید کا پوچھا تھا، مگر اس کے جواب نے ایک لمحے کے لیے تو مجھے حیران ہی کر دیا تھا۔

''کیا مطلب؟ جنید پشاور گیا ہے؟ اور وہ بھی آفس میں بتائے بغیر؟ اور تم، تم یہاں اکیلی؟ وہ کس کے سہارے چھوڑ کر گیا ہے تمہیں؟ عجیب لاپرواہ بندہ ہے۔ آجائے ذرا، اس کی تو اچھی خاصی کلاس لینی پڑے گی مجھے۔'' میں ایک دم غصے میں آیا تھا۔ بھئی، ظاہر ہے، میں اپنے آفس کا باس تھا اور جنید میرا جونیئر ترین ایمپلائی۔ اور اس پر اس کے انداز۔ غصہ تو مجھے آنا ہی تھا۔

''آپ! آپ ہیں ناں، میرا خیال رکھنے کے لیے۔ وہ مجھے آپ کے سہارے ہی تو چھوڑ گیا ہے شہروز جی۔'' وہ اک ادا سے لہراتی، بل کھاتی آئی اور میرے بالکل قریب بیٹھتے ہوئے، اس نے میری آنکھوں میں اپنی نشیلی آنکھیں ڈالتے ہوئے کچھ اس ادا سے کہا کہ میری بولتی ہی بند ہوگئی۔

''وہ تو ٹھیک ہے خوشبو۔ مگر تم خود سوچو کہ تمہیں اس طرح اجنبی شہر اور اجنبی جگہ پر اکیلا دیکھ کر اگر کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو۔۔۔!!''

''نہیں شہروز جی! آپ کے ہوتے ہوئے میرے لیے نہ تو یہ شہر اجنبی ہے اور نہ ہی یہ جگہ اور پھر مجھے کوئی نقصان کیسے پہنچ سکتا ہے، جب میں اپنے گھر اور دل کے دروازے صرف آپ کے لیے ہی کھولتی ہوں۔'' اور ایک بار پھر اس کے جواب نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ناز بھرے انداز سے اٹھی اور کچن کی سمت چلی گئی۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں اس نے ٹیبل پر کھانا لگا دیا، پھر وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر ٹیبل تک لے آئی اور بڑے محبت بھرے انداز سے مجھے سرو کرنے لگی۔ میں بھی اسے خوش کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر اس کی تعریفیں کرتا چلا گیا اور اس کے ہاتھوں سے نوالے کھاتا چلا گیا۔ آج شاید کوئی خاص دن تھا یا پھر شاید میرے دماغ میں شیطان نے یہ خیال ڈال دیا تھا کہ اس وقت ہم دونوں کے سوا یہاں کوئی بھی نہیں، اور میں جو چاہوں اس حسینہ کے ساتھ کر سکتا ہوں۔ مجھ پر تو یوں بھی کوئی الزام نہیں آئے گا کہ مجھے خود فون کر کے بلانے والی یہ ''قیامت'' بھی خود ہی تھی۔ مگر میں شاید یہ بھول گیا تھا کہ ایک ایسی ہستی ہر وقت میرے ساتھ موجود رہتی ہے جو میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اور وہ میرے دل کا حال تو جانتی ہی ہے، وہ میرے خیالوں اور ارادوں سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ اور اسی ہستی نے میری نگاہوں پر پڑے غفلت کے پردے کو چاک کرنا تھا جو یہ سارا کھیل رچایا گیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ میری فرمائش پر پشاوری قہوہ بنا لائی۔ میں اس کے ہاتھ سے پیالی ٹھیک طرح سے پکڑ بھی نہیں پایا تھا کہ اس کا ہاتھ کانپا اور گرم گرم قہوہ میرے ہاتھ اور ٹانگ پر گرتا چلا گیا۔ اس افتاد کے لیے میں تو بالکل بھی تیار نہیں تھا، سو ایک دم گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ خود شاید وہ بھی تیار نہیں تھی اس لیے میرے سے زیادہ وہ بوکھلا گئی۔

"اوہ.....اوہو، شہروز جی یہ کیا ہوگیا؟ آپ۔۔آپ پلیز میرے ساتھ آئیں۔ میں کچھ کرتی ہوں۔!!" میرے سے زیادہ گھبرائی ہوئی وہ لگ رہی تھی، اس لیے صرف اس کی تسلی کے لیے میں اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا، ورنہ نہ تو قہوہ اتنا گرم تھا کہ مجھے جلا پاتا اور نہ ہی میں اتنا نازک مزاج تھا کہ ذرا سی جلن نہ برداشت کر پاتا۔ وہ مجھے لیے ہوئے سیدھا اپنے بیڈروم میں چلی آئی۔ ہمارے آپس کے روابط کو ڈھائی، تین سال ہونے کو آئے تھے، مگر آج پہلی بار میں اس کے بیڈ روم میں آیا تھا۔ اور اب عجیب قسم کے احساسات کا شکار ہو رہا تھا۔

"شہروز! آپ یہاں لیٹ جائیں۔ میں آپ کے ہاتھ اور ٹانگ پر برنال لگا دیتی ہوں۔" اس نے بیڈ پر ترتیب اور نفاست سے رکھے تکیے اور کشن ٹھیک کرتے ہوئے کہا اور پھر میرا جواب سنے بغیر ہی مجھے زبردستی لٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں ہلکی ہلکی سی لرزش تھی اور کانپتی لرزتی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ مجھے لٹاتے ہوئے اس کی ساڑھی کا پلو اس کے شانے سے ڈھلکتا ہوا میرے سینے پر گرتا چلا گیا۔ ایک لمحہ لگا تھا۔ بس ایک لمحہ اور شیطان میرے حواسوں پر پوری طرح قابض ہوتا چلا گیا۔ خوشبو کے مہکتے وجود سے اٹھنے والی دلنواز مہک مجھے دیوانہ کیے دے رہی تھی۔ میں نے بے اختیار اسے شانوں سے تھام لیا، اور پھر ایک ہلکا سا جھٹکا دینے کی دیر تھی کہ وہ کٹی شاخ کی طرح میرے اوپر ڈھیر ہو چکی تھی۔ میرے ہاتھ سرسراتے ہوئے اس کے بالوں کے ریشم سے الجھ رہے تھے تو سانسیں اس کی قربت کی وجہ سے دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھیں۔ وہ ذرا سا کسمسائی، اور اپنا آپ مجھ سے چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے میرے اور بھی زیادہ نزدیک آگئی۔ اس کی اس درجہ قربت سے میرے حواسوں پر ایک عجیب سا نشہ چھا رہا تھا۔

"شہروز صاحب! آپ نے کبھی کنول کا پھول دیکھا ہے؟" ایکدم اس کی سرسراتی، کانپتی لرزتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں ایک دم چونک سا گیا۔

"کنول کا پھول؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو خوشبو۔ کھل کر کہو ناں جو بھی تمہارے دل میں ہے۔" میرے حواسوں پر چھایا نشہ تو اس کی کانپتی لرزتی آواز سن کر ہی اترنے لگا تھا۔ پھر جیسے ہی میری نظر اس کے بجھے بجھے افسردہ سے چہرے پر پڑی تو میرے حواس بھی اپنے ٹھکانے پر آگئے۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں شہروز صاحب! کنول کے نصیب میں ہمیشہ کیچڑ ہی کیوں ہوتی ہے۔ دلدلی کیچڑ، گندے پانیوں کے جوہڑ اور غلاظت کے انبار ہی کیوں ہمیشہ کنول کا مقدر بنتے ہیں۔ حالانکہ پھول تو پھول ہی ہوتا ہے، چاہے گلاب کا ہو یا کنول۔ پھر ایک کے نصیب میں حسین باغ، باغیچے اور کیاریاں تو دوسرے کے نصیب میں کیچڑ، دلدل اور گندے جوہڑ ہی کیوں ہوتے ہیں؟ آپ اس کی وجہ بتا سکتے ہیں شہروز صاحب۔!!"

چہرہ اس خوشبو کا تو نہیں تھا، جس کے ساتھ کچھ دیر پہلے میں شیطان کے دکھائے راستے پر چلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ چہرہ تو ایک بے بس اور مظلوم لڑکی کا تھا۔ میرے ضمیر نے میرے منہ پر اس زور کا تھپڑ مارا کہ میرا منہ ہی دوسری طرف جا لگا۔ میں اسے ایک جھٹکے سے پیچھے پھینکتا اس تیزی کے ساتھ بیڈ سے اٹھا جیسے میرے نیچے نرم مخملیں بستر نہیں بلکہ کانٹوں سے بھرا ایسا بستر تھا جس کے زہریلے، نوکیلے کانٹے میری روح تک کو چھید گئے تھے۔

"تم۔۔تم کہنا کیا چاہتی ہو خوشبو؟ اور، تمہارا مقصد کیا تھا مجھے اس طرح تنہائی میں بلانے کا؟" میرے دماغ کی رگیں جیسے پھٹ رہی تھیں۔ میں جھنجلا کر اس پر ہی الٹ پڑا تھا۔ مگر وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور اس کا اس طرح رونا میرے لیے مزید پریشانی کا باعث بن رہا تھا۔

"خوشبو۔!! بولو، کچھ تو بتاؤ مجھے۔ آخر تمہاری اس بے تکلفی اور جنید کی اس لاپروائی کے پیچھے اصل راز کیا ہے؟ تم مجھے کچھ تو بتاؤ۔ دیکھو، اس طرح رونے سے کچھ بھی حاصل

نہیں ہوگا تمہیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ مجھے کھل بتاؤ کہ تم لوگوں کا پرابلم کیا ہے؟'' میں نے اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ سے نیچے کھینچ لیا، اور اس کے دونوں بازوؤں کو مضبوطی سے جکڑتے ہوئے اسے جیسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ وہ نازک سی لڑکی، میری اس وحشیانہ حرکت سے اور زیادہ پریشان ہوگئی اور پہلے سے زیادہ زور شور سے رونے لگی۔

''وہ۔وہ۔۔سر جنید کو پرموشن۔۔بس کسی بھی طرح، کسی بھی قیمت پر۔۔ کیسے بھی کر کے، صرف ایک بار پرموشن۔۔!!'' اور اس کی ان ٹوٹی پھوٹی باتوں نے ایک بار تو میرا دماغ بھک سے اڑا کر رکھ دیا۔

''کیا؟ پرموشن؟ صرف ایک پرموشن کے لیے؟ اُف۔۔توبہ۔'' اور پھر میرا اس چھت کے نیچے جیسے دم گھٹنے لگا۔ میں تیزی سے اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بھاگتے قدموں سے باہر نکلا، اور پیچھے مُڑ کر دیکھے بغیر بس بھاگتا ہی چلا گیا۔ واپسی کے راستے میں میرے دماغ کی بند گرہیں کھلتی چلیں گئیں۔ جنید کا سارا منصوبہ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس کا پرموشن پانے کا جنون۔ اس کی خواہشیں۔ اس کے خواب اس حد تک بڑھ گئے تھے اس نے ان کے حصول کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا اور اس راستے پر چلتے ہوئے اس نے اپنی غیرت کو بھی داؤ پر لگانے میں کوئی عار نہیں سمجھی تھی۔ اب مجھے رہ رہ کر پری کی باتیں بھی یاد آ رہی تھیں۔ میرے بدلتے رویوں نے ظاہر ہے اسے بھی بہت پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ پہلے تو کھٹکی تھی، پھر میرے دل کے چور سے خود بخود ہی واقف ہوتی چلی گئی تھی۔ ویسے بھی کہنے والے کہتے ہیں کہ بیوی کی نظر سے شوہر کی کوئی چوری چھپی نہیں رہ سکتی۔ شوہر کے دل کے دروازے جیسے ہی کسی دوسری عورت کے لیے کھلنے لگتے ہیں، بیوی کے اندر موجود خطرے کی گھنٹی پورے زور و شور سے بجنے لگتی ہے۔ شاید اسی لیے پری بھی میری اس بدلتی کیفیت سے الرٹ ہوگئی تھی اور پھر اس پر جیند کا اس پر چڑھتا ہوا پریشر۔ وہ اپنی پرموشن کے لیے اسے بھی مہرہ بنانے کے چکروں میں تھا۔ اٹھتے بیٹھتے اسے میرے سامنے اپنی سفارش کرنے کو کہتا رہتا تھا اور اس چیز نے پری کو بری طرح سے اریٹیٹ کر دیا تھا۔ اس لیے اب پچھلے کچھ عرصے سے وہ بھی مجھ پر اس حوالے سے دباؤ ڈال رہی تھی کہ میں جنید کو پرموشن دے کر اس قصے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں اور اس پر اور اپنے بچوں اور گھر پر پہلے کی طرح بھرپور توجہ دینے لگوں۔ میں جتنا سوچتا جا رہا تھا، میرے دماغ کی رگیں اتنی ہی پھٹتی جا رہی تھیں۔ پہلے تو مجھے شدید قسم کا غصہ آیا تھا، مگر پھر آہستہ آہستہ میرا غصہ ملال میں ڈھلنے لگا۔ میں دل ہی دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہا تھا کہ جس نے عین وقت پر مجھے گناہ کی دلدل میں گرنے سے بچالیا۔

☆☆☆

''انور صاحب! آپ کا کیا خیال ہے؟ مسٹر جنید کی فائل بھی تو بہت عرصے سے پرموشن کے انتظار میں پڑی ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟'' میں نے انور صاحب سے جنید کا مسئلہ ڈسکس کرتے ہوئے ان کی رائے طلب کی تو وہ مدبرانہ انداز سے سر ہلاتے مسکرانے لگے۔

''جی سر! جنید کے جنون سے تو اب سب ہی اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں اور اس کی یہ خواہش، اس کے یہ خواب ہی تو اسے در در بھٹکاتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی لیے تو اس نے آج تک کسی ایک جگہ بھی ٹک کر کام نہیں کیا۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس کا حل صرف اور صرف پرموشن ہی رہ گیا ہے۔ اور اب بھی میرا یہ ہی خیال ہے اگر اب بھی اس کی یہ خواہش، یہ خواب پورا نہ ہوا تو شاید وہ سچ مچ پاگل ہی ہو جائے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کوئی نقصان ہی پہنچا بیٹھے۔ کیونکہ یہ برانچ ہی اب اس کی لاسٹ ہوپ ہے۔ اور اسی لیے اس نے اپنی ساری کشتیاں یہیں جلا ڈالی ہیں۔ اور میرے خیال میں اب بھی اگر اسے اس کی منزل نہ ملی تو شاید پھر جنید ہمیں کہیں نہ ملے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیں۔!!'' انور صاحب کی باتیں

میرے رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے کافی تھیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر فائل اپنے سامنے کی اور اس پر ''پرموٹڈ'' کی مہر لگا کر سائن کیے اور فائل انور صاحب کی طرف بڑھا دی۔

''شہروز! آپ نے پھر کیا فیصلہ کیا جنید کی پرموشن کے بارے میں؟ اس کا آج بھی فون آیا تھا۔ بہت پریشان تھا بے چارہ۔ آپ پلیز، اس کی فائل پر سائن کر دیں اور۔۔۔!!''

''ہاں، ہاں کر دیئے ہیں سائن اس ''بیچارے'' کی فائل پر۔ اور بھیج دی ہے اس کی فائل ہیڈ آفس۔ تم اب اس کی فکر چھوڑ کر میری کچھ فکر کر لو۔!!'' میں، جو بڑے عرصے کے بعد خود کو ذہنی طور پر اپنے کمرے میں موجود محسوس کر رہا تھا، اور ایک عجیب طرح کی خوشی اور سرشاری محسوس کر رہا تھا کہ اچانک پری کے مُنہ سے ایک بار پھر جنید اور اس کی ترقی کا قصہ سن کر بری طرح سے بیزار ہو گیا اور اس کی بات تیزی سے کاٹتے ہوئے اندازِ نشست بدلتے ہوئے اس کی گود میں سر رکھ دیا۔ مجھے شروع سے ہی اس طرح پری کی گود میں سر رکھ کر لیٹنا بہت پسند تھا۔ پری کی نرم ملائم انگلیاں جیسے ہی میرے بالوں میں سرسراتیں، میں دنیا مافیہا سے جیسے بے خبر ہو جاتا۔ لیکن جب سے ہماری زندگی میں ''جنید اور خوشبو'' آئے تھے، یہ سکون بھرے لمحات جیسے خواب و خیال ہی ہو گئے تھے۔ اور اب جو ایک عرصے کے بعد میں نے اپنی محبت کا پرانا انداز اپنایا تو پری بھی کھل کر مسکرا دی۔ اس کی نرم ملائم انگلیاں بڑی نرمی سے میرے بالوں میں گردش کرنے لگیں۔ اور میں آنکھیں موندتے ہوئے اس کے پیار کے ساغر میں ڈبکیاں لگانے لگا۔

☆☆☆

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود بھی میں نے جنید کے خلاف کوئی ایکشن کیوں نہیں لیا؟ اسے اور خوشبو کو ایسے ہی کیوں چھوڑ دیا؟ انہیں اپنی زندگی سے کھیل کر اتنی آسانی سے کیوں چلا جانے دیا؟ لیکن نہیں۔ آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ بالکل غلط۔ میں نے جنید کو ایسے ہی پرموشن نہیں دے دی تھی۔ انور صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جنید کی یہ خواہش، اس کا جنون بن چکی تھی۔ اور وہ اپنے جنون میں کوئی بھی حد پار کر سکتا تھا۔ میں نے اسے علیحدگی میں بلایا اور اسے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھایا تھا۔ ٹھیک ہے، اس کا انداز بہت غلط تھا، مگر اس کی خواہش جائز تھی۔ اور میں کیا، میری جگہ کوئی بھی ذی روح انسان ہوتا تو شاید وہی کرتا جو میں نے کیا۔ ویسے بھی ڈیڈی ہمیشہ کہتے ہیں کہ اپنے پیروں پر چلنے والوں کے ساتھ تو ہر کوئی چل لیتا ہے، مزہ تو جب ہے کہ کسی گرنے والے کو اپنے شانوں پر سوار کروا کے چلا جائے۔ اور یہی اصل مردانگی ہے کہ گرتے ہوؤں کو سہارہ دیا جائے، نہ کہ آخری دھکا دے کر زمین بوس کر دیا جائے۔ بس، اسی لیے میں نے جنید کو ایک بھائی کی طرح پاس بلا کر بڑے پیار سے سمجھایا اور شکر خدا کا کہ اس کی سمجھ میں یہ بات آ بھی گئی۔ اس نے مجھ سے تو معافی مانگی ہی، خوشبو کے پندارِ نسوانیت کو ٹھیس پہنچانے کے جرم کی اس سے بھی معافی مانگی تھی۔ کہ جنید کی خواہش کی تکمیل کے لیے سب سے زیادہ چوٹ کھائی بھی تو اس نے ہی تھی۔

جنید اور خوشبو کا آج بھی ہمارے ساتھ ملنا جلنا ہے۔ وہ آج بھی ہم سے اسی طرح ملتے ہیں۔ مگر اب اس میل ملاپ میں واضح قسم کی تبدیلی آ چکی ہے۔ میں خوشبو کو بھابی کہتا ہوں اور وہ مجھے بڑے بھائی کی طرح سمجھتی ہے۔ اور ہم لوگ یہ صرف زبانی کلامی نہیں کہتے، بلکہ دل سے ان رشتوں کو مانتے بھی ہیں۔ کہ اگر کسی رشتے میں حرمت نہ ہو تو، پھر کسی بھی رشتے کی کوئی اساس باقی نہیں رہتی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ میں نے غلط کیا یا درست۔ میں آپ کی رائے کا شدت سے منتظر ہوں۔

☆☆☆☆

سستا خون

ثمینہ کنول

رسم دنیا ہے کہ موت صرف مرنے والے
کا مقدر ہی سمجھی جاتی ہے اسی لیے کچھ لوگ اس
تکلیف دہ موقع کو مزید پُر اذیت بنا کر دوسروں کو
دکھ دینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں

غیرت کے نام پہ قتل ہونے والی ایک معصوم دوشیزہ کی داستان الم

آپ سے پیار کیا، آپ کو اپنا سمجھا
زندگی میں یہی اک جرم ہوا ہے مجھ سے

گیلے بالوں کو تولیے کی قید سے آزاد کرتے ہوئے وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی کہ آج تو من کی مراد پوری ہونے جا رہی تھی۔ آئینہ اس کے تیکھے نقوش، شربتی آنکھوں اور گلابی رنگت کے سحر میں مبتلا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ حسن بے مثال کو مسلسل مسکان نے اور دلکشی بخش دی تھی کہ اسے نظر بھر کر دیکھنا دوسرے کو مشکل میں ڈال سکتا تھا۔

بلال! آج ہم ایک ہو جائیں گے۔ دنیا ہار گئی اور

محبت جیت گئی ہے۔ وہ جانے کب تک خود سے ہم کلام رہتی..... کہ دروازہ یک لخت زور زور سے کھٹکھٹایا جانے لگا۔ ساتھ عجیب نامانوس سے شور کی آواز بھی ہم آہنگ ہو رہی تھی جیسے دو افراد آپس میں لڑ رہے ہوں۔

کرن گھبرا کر کمرے کے دروازے کی طرف لپکی اور جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔

باہر رحیم بھائی کو کھڑے دیکھ کر ایک دم پرسکون ہو گئی۔

وہ بھائی آپ.....؟

بھائی کے پیچھے کھڑی رائنہ بھابی سخت پریشان نظر آ رہی تھیں۔ عجیب سا خوف ان کے چہرے پہ رقم تھا۔ رحیم نے اچانک رائنہ کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا تھا۔ اور وہ فوراً دروازے پہ دستک دینا شروع ہو گئیں تھیں۔

ساتھ بلند آواز سے چیخ بھی رہی تھیں۔ رحیم پلیز دروازہ کھولیں۔

کیا ہوا بھائی؟ آپ نے بھابی کو دھکا کیوں دیا۔ دروازہ کیوں بند کر دیا.....؟ وہ پریشان ہو کے بولی۔

رحیم نے ایک خشونت بھری نظر اس پر ڈالی اور پیچھے کیے ہوئے ہاتھ کو سامنے کیا تو کرن کی چیخ نکل گئی۔

بھائی یہ کیا کر رہے ہیں؟ ریوالور دیکھ کر اس کی جان نکل گئی تھی۔ رحیم نے کوئی جواب دیئے بغیر سر کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا تھا۔ کرن پیچھے بیڈ پر جا گری۔ آخری لمحے میں جان کنی کی اذیت کے ساتھ ایک حیرت کا تاثر بھی چہرے پر رقم ہو گیا۔ سپنوں سے سجی ہوئی آنکھوں میں اب وحشتوں کا بسیرا تھا۔ کالی گھٹاؤں سی زلفیں تیزی سے رنگین ہوتی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

ہر طرف آہ و زاری اور آہ و فغاں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ بڑی شادی شدہ بہنیں چھوٹی بہن کی جوان میت پر بین کر رہی تھیں۔ ماں، باپ غم سے نڈھال تھے۔ ایک طرف بیٹی کی موت کا دکھ دوسری جانب پولیس رحیم کو گرفتار کر کے لے جا چکی تھی۔ اس پہ رشتے داروں اور دوسرے لوگوں کی چہ مگوئیاں جاری تھیں۔

ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں اشارے کیے جا رہے تھے اور کچھ نے تو باقاعدہ پوچھ بھی لیا کہ آخر ایسا کیوں ہوا کہ رحیم نے لاڈلی بہن کو قتل کر کے اپنا آپ پولیس کے حوالے کر دیا مگر جواباً ایک جامد چپ ہی طاری رہی۔

رسمِ دنیا ہے کہ موت صرف مرنے والے کا مقدر ہی سمجھی جاتی ہے۔ اسی نے مرنا تھا کہ اس کا وقت آ گیا تھا۔ ہم عمر دراز لکھوا لائے ہیں شاید اسی لیے اس تکلیف دہ موقع کو مزید پراذیت بنا کر دوسروں کو دکھ دینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

دونوں بہنوں کے لیے اچانک ملنے والی یہ خبر جھٹکے سے کم نہیں تھی۔ وہ دونوں ہر بات سے بے خبر تھیں۔ کرن کا معصوم چہرہ نگاہوں کے سامنے بار بار آ رہا تھا۔ جنازہ کب کا جا چکا تھا۔ مگر آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

دونوں ماں سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھیں مگر رشتے داروں اور محلے داروں کا ہجوم کم ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر نگاہ میں تجسس تھا کہ آج تو کرن کی سادگی سے شام کو رخصتی ہونا قرار پائی تھی کہ جہاں رشتہ طے ہوا تھا۔ لڑکے نے جلد باہر چلے جانا تھا تو جلدی میں نکاح ہوا اور پھر لڑکے والوں کے اصرار پر آج سادگی سے رخصتی طے ہونا پائی تھی۔ مگر رخصتی کے لیے اسے اتنی جلدی تھی کہ اس نے شام کا انتظار بھی نہیں کیا اور ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی تھی۔ اس لیے ہر نظر میں حیرانی تھی کہ آخر ایسا کیا ہوا کہ رحیم کرن کو قتل کر کے تھانے پہنچ گیا۔

مگر ہر سوال کے جواب میں مسلسل خاموشی نے

انہیں مایوس کیا تو سب لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے کہ رات بہت ہوگئی تھی۔

امی کیا ہوا تھا؟ کیوں مارا ہے رحیم نے کرن کو وہ تو بہت پیار کرتا تھا اس سے۔ اس کی لاڈلی چھوٹی بہن تھی وہ.....

کتنے ناز نخرے اٹھاتا تھا وہ اس کے..... آخر اچانک یہ سب کیا ہوگیا۔ گھر کا شیرازہ بکھرنے پر سارہ انعم کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

آہ میری پیاری بیٹی! ماں کے لب آخر کھل ہی گئے تھے۔ کاش کرن کو اتنے لاڈ پیار نے بگاڑا نہ ہوتا۔ کاش وہ اتنی خودسر نہ ہوتی۔ اگر وہ اپنی عزت پہ محبت کو ترجیح نہ دیتی تو آج وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتی۔

ماں کے بہتے آنسو ان کے دکھ کی گواہی دے رہے تھے۔ ہم نے اس پہ اعتماد کیا مگر اس نے بچپن کی منگنی کو ٹھکرا کر اپنے کلاس فیلو سے شادی پہ اصرار کیا۔ بلال (کلاس فیلو) نے کئی بار رشتہ بھجوایا تھا مگر ہم نے ذات برادری ایک نہ ہونے پر ہر بار انکار ہی کہلوایا۔ مگر کرن نے ہماری عزت قدموں تلے روند کر اس سے خفیہ نکاح کر لیا تھا۔

مجھے کیا خبر تھی کہ وہ اتنا بڑا قدم اٹھالے گی۔ میں سمجھ رہی تھی وقتی پسندیدگی ہے۔ پھر میرے سمجھانے پر تمہارے ابا اور رحیم سادگی سے اس کی رخصتی پہ تیار ہو گئے تھے کہ عزت بچانے کا اب اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ سولوگوں کو یہی کہا گیا کہ لڑکے نے باہر جانا ہے۔ ہم نے نکاح اچانک کر دیا ہے اور آج شام کو تم دونوں کو اسی لیے بلایا تھا کہ جلدی میں یہ سب کر رہے ہیں۔ مگر افسوس میں اور تمہارے ابا کچھ ضروری انتظامات کے سلسلے میں بازار گئے ہوئے تھے کہ اچانک رحیم غصے میں بھرا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ رائنہ کے لاکھ سمجھانے پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا کہ چپکے چپکے بات گھر سے نکل چکی تھی اور اس کے دوستوں نے اسے بے غیرت ہونے کا طعنہ دیا تھا کہ بہن کو معشوق سے ملوانے کا بندوبست کر رہے ہو۔ بس اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ یہ سب کر ڈالا۔

بیٹی کی نادانی کو روؤں یا بیٹے کے اس عمل کو۔ نہ کرن یہ قدم اٹھاتی نہ ایسا ہوتا۔

☆☆☆

صبح کا اجالا نمودار ہونے کو تھا۔ تازہ تازہ بنی قبر پہ پھولوں کی پتیوں پہ سر رکھے کوئی کب سے روئے جا رہا تھا۔ پتیاں اوس سے زیادہ آنسوؤں میں بھیگ چکی تھیں۔

کرن! تم نے تو ہمیشہ ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر وعدہ وفا کیوں نہیں کیا.....؟

مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ میں کیسے جی پاؤں گا تمہارے بغیر.....؟

بھائی بس کریں آئیں گھر چلیں بلال کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ردا افسردگی سے بولی۔

مگر وہ اونچا لمبا مرد سر اٹھائے بغیر ہچکیوں سے روتا رہا۔ ردا سوچ رہی تھی کہ ہمارا معاشرہ کیوں کسی حال میں جینے نہیں دیتا؟ اگر کوئی جائز راستہ اختیار کرتا ہے تو اسے ذات برادری کے مسئلوں میں الجھ کر انکار کر دیا جاتا ہے اور اگر من مانی پہ اتر آئے تو جینے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔

شک

ایک بے حد شکی مزاج خاتون ہر شام اپنے خاوند کا نہایت باریک بینی سے معائنہ کرتی تھی۔ اس کے کوٹ پر ایک چھوٹے سے بال کی موجودگی نہایت خوفناک مناظر کا موجب بنتی تھی۔ ایک شام جب نہایت تفصیلی معائنے کے باوجود وہ کچھ نہ پاسکی تو روہانسی ہو کر کہنے لگی۔ ''اب یہ نوبت آ گئی ہے کہ گنجی عورتیں بھی!''

(شیخ امجد، خانیوال)

خون کو پانی سے سستا جاننے و سمجھنے والی یہ سوچ آخر کب بدلے گی کہ بیٹی نے نکاح جیسا سنگین جرم کیا تھا اسے تو سزا لازم ہے مگر بیٹا غیرت میں قتل بھی کر ڈالے تو جائز ہے۔

☆☆☆

رسم قل پہ اشاروں کنایوں میں بات چیت کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ زرینہ (کرن کی ماں) بھئی اصل بات کا تو ہمیں پتہ نہیں مگر تم لوگوں کو رحیم کو معاف کر دینا چاہیے۔ بیٹی کو تو کھو دیا ہے اب بیٹا بھی ہاتھ سے نہ جائے۔

اکلوتا بچہ ہے گھر ویران ہو جائے گا تمہارا۔ ایک عورت بولی تو زرینہ خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

لوگ تو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔ یقیناً اندر کھاتے بات سب کے علم میں آ چکی تھی مگر لاعلمی کی اداکاری کر رہے تھے۔

پاکستان میں غیرت کے نام پہ ہونے والے قتل میں عموماً گھر والے معاف کر دیتے ہیں تو یہی امید کی جا رہی تھی کہ رحیم شام تک گھر آ ہی جائے گا۔

☆☆☆

رحیم بے چینی سے منتظر تھا کہ کب ابا آئیں اور اسے لے جائیں آخر غیرت کے نام پر بہن کو مارا تھا کوئی چھوٹا کارنامہ تو نہیں تھا۔ گولڈ میڈل بھی کم تھا اس کے لیے۔ حالانکہ کرن کی رخصتی میں اس کی مرضی شامل تھی مگر دوستوں کے طعنے نے اس کی سوئی ہوئی غیرت جگا دی تھی۔

تھانے میں بھی سب کو علم تھا کہ ایسے کیسوں میں گھر والے معاف کر دیتے ہیں یہاں تو پھر اکلوتے بیٹے کا معاملہ تھا۔

ابھی کچھ روز قبل ہی ایک واقعے میں ایک دسویں کلاس کے بچے نے اپنی سگی ماں کے سر میں گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا کہ اس نے باپ کے مرنے کے بعد نکاح کر لیا تھا اور چچا، تایا اور دادی کے بھڑکانے پر کہ تمہاری غیرت کا سوال ہے۔ اپنی جنت اجاڑ دی تھی اور بعد میں گھر والوں کے معاف کرنے پر باعزت بری ہو گیا تھا۔

واللہ علم کہ اس چھوٹے سے بچے کے پاس پستول کہاں سے آیا تھا۔ اس کے پس پردہ کیا راز تھا۔ کیونکہ معاشرے میں عورت کو غیرت کے نام پہ قتل کرنا اتنا آسان کر دیا گیا ہے۔ جتنی آسانی سے کوئی پاؤں تلے چیونٹی کو مسل ڈالتا ہے اور یہی قاتل معافی کے بعد کھلے عام دندناتے پھرتے ہیں تو پھر معاشرے کے سدھرنے کے امکان کہاں جائیں گے۔

جی بزرگو! کیا حکم ہے ہمارے لیے؟ آپ نے اپنے بیٹے کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرانا ہے؟ انسپکٹر صاحب نے حاکم صاحب سے پوچھا تو سر جھکائے کرسی پہ ایسے بیٹھے تھے جیسے سب کچھ ہار چکے ہوں۔

انسپکٹر کے سوال پر اس کی طرف دیکھا تو صاف لکھا ہوا تھا کہ مجھے جواب کا پہلے سے علم ہے۔ بیوی اور بیٹیوں کی آوازیں ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

رحیم کے ابا! کرن بھی آپ ہی کی بیٹی تھی۔

بابا! بیٹے بیٹیوں سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔ اسی لیے انہیں بہنوں کو مارنے کا سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے۔ کرن کو لاتعلقی کی سزا بھی تو دی جا سکتی تھی پھر اس کی جان کیوں لی گئی؟ رحیم نے بھی تو اپنی پسند سے شادی کی تھی اور آپ نے اس کا ساتھ بھی دیا تھا۔ کیا بیٹے بیٹیوں سے اتنے زیادہ عزیز ہوتے ہیں؟ ساری سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے ان کے منہ سے الفاظ نہیں گویا انگارے نکلے تھے کیونکہ زبان تپش سے جل اٹھی تھی کہ دل و دماغ پہ حاوی رہتا ہے یا پھر یہ رشتہ مہنگا تھا۔

انسپکٹر صاحب! میرے بیٹے کو رہا کر دیں۔ میں اپنی بیٹی کا خون معاف کرتا ہوں۔

☆☆☆

اور جسے رب رکھے

مجید احمد جائی

اِسے لے جاؤ اور مندر کے اوپر لے جا کر نیچے پھینک دو!

وہ اُس وقت شدید غصے میں تھا۔آخر اُس نے ایسا کیا تو کیونکر۔۔ساری رعایا مجھے دیوتا مانتی ہے ،میری پوجا کرتی ہے اور یہ ہے کہ صاف انکار کر رہا ہے۔۔۔لے جاؤ اور پھینک دو۔اس نافرمان کو۔

اُس کے کارندے حکم کے منتظر تھے اُنہوں نے لڑکے کو پکڑا اور مندر کی اوپری منزل پر لے جا کر نیچے پھینک دیا۔کیا یہ ظلم نہیں تھا۔؟ہاں ظلم تھا ،ایک باپ نے بیٹے کو مندر کی اوپری منزل سے نیچے پھینکوا دیا تھا۔

اُس لڑکے کا نام ''پرہلاد'' تھا اور اُس کا باپ راجہ ہرنا کشپ تھا۔جس کی حکومت کشمیر سے لے کر ملتان تک پھیلی تھی۔اس دھرتی پر اُس کا راج تھا۔اُس کے حکم عدولی نہیں ہوتی تھی۔کسی میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ اُس کا انکار کرے۔

راجہ ہرنا کشپ بڑا بہادر شخص تھا۔اُس نے اپنی بہادری کے بل بوتے پر اس علاقے پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ہزاروں سال پہلے کی بات ہے۔ایک زبردست سیلاب آیا تھا جس سے ساری زمین ڈوب گئی تھی۔

جی ہاں !آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔

طوفان نوح علیہ السلام نے ساری زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور یہ ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عذاب تھا جو اُس کے نافرمان تھے۔اُن کے لئے۔جو کشتی میں سوار ہو گئے وہ بچ گئے۔وہ حق پر تھے۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ سیلاب کا پانی خشک ہونے لگا اور جو بچ گئے تھے۔وہ عذاب سے ڈرتے تھے۔ڈرتے رہے پھر وقت نے کروٹ لی اور ماحول بدلنے لگا۔کہتے ہیں وقت کبھی نہیں تھمتا۔وقت کی کوئی بریک نہیں ہوتی جس کو دبا کر وقت کی رفتار کو روک لیا جائے۔وقت ایسی چیز ہے نہ سانس لیتا ہے اور نہ ہی تھکتا ہے۔سو یہی وقت اپنی مستی میں گزرتا رہا۔

ڈرنے والے پھر سے گمراہی کی طرف لوٹنے لگے۔پھر سے پتھروں اور بتوں کو اپنا خدا مان لیا اور اُن کی پوجا شروع کر دی۔ادیتہ دیوتا کی مورتی بنا کر اُس کی پوجا پاٹ شروع کر دی ،انہی لوگوں میں وہی ایک بہادر شخص تھا۔جس نے شمالی ہندوستان سے لے کر کشمیر تک پہاڑوں میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ان چٹانوں میں سیلاب کا پانی جمع تھا۔اُس نے اپنی بہادری اور قوت سے چٹانوں کو دھکا دے کر ہٹا دیا اور پانی جنوبی سمت بہہ نکلا۔اسی پانی سے دریائے جہلم ،راوی ،چناب اور سندھ معرض وجود میں آئے۔راجہ ہرنا کشپ اِنہی دریاؤں کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ملتان کی سرزمین تک پہنچ گیا۔یہاں کے باسیوں میں اُس کی بہادری کی دھاک پہلے سے ہی بیٹھ چکی تھی۔یوں سمجھیں اس کے تابع دار بن گئے۔۔

اُس کا نام ہرنا کشپ تھا۔اپنی بہادری اور قوت سے اس نے اپنی حکومت قائم کی تو ان پہاڑوں ،چٹانوں کو ''کشپ میر'' کا نام دیا۔جو اب ہزاروں سال گزرنے کے بعد کشمیر کہلایا جانے لگا۔

اتنے بڑے علاقے کو دیکھ کر راجہ ہرنا کشپ بڑا خوش ہوا اور ایک دن اُسے خیال آیا۔میں اتنے بڑے علاقے کا مالک ہوں اور دربدر بیکار پھرتا ہوں۔کیوں ناں میں دیوتا بن جاؤں۔یہ خیال آتے ہی اُس نے

حقیقت کا روپ دھار دیا اور دیوتا ہونے کا اعلان کر دیا۔صرف اعلان ہی نہ کیا بلکہ اپنی شکل کا ایک سونے کا بت بنوایا اور رعایا کو حکم دیا کہ اس کی پوجا شروع کرو۔

ان لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو پوجا نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن اس نے اعلان کر دیا کہ جو پوجا نہیں کرے گا اُس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔پھر یہی ہوا جنہوں نے انکار کیا اُن کے سر قلم کر دیئے گئے۔

ہر طرف مہاراجہ کا خوف لوگوں کے دِلوں میں گھر کر گیا۔لوگ اس کے قہر و غضب سے ڈرنے لگے اور اُس کا حکم ماننے لگے۔اُس کے حکم کی عدولی کرنا اپنی جان گنوانا کے مترادف تھا۔اب کشمیر سے ملتان تک اُس کی حکومت تھی اور وہ راج کرنے لگا۔

جب ظلم بڑھ جائے تو ظلم کو مٹایا بھی جاتا ہے۔دینے والے نے اُس مہاراجہ کو چاند سا بیٹا عطا کر دیا۔اُسے کیا خبر تھی کہ یہی بیٹا اُس کی موت کا سبب بن جائے گا۔اگر اُسے خبر ہوتی تو وہ فیملی پلاننگ والے محکمہ سے ضرور رجوع کرتا اور اُس وقت تو تعزیرات ہند بھی نہیں تھی۔کون پوچھتا۔بدقسمتی سے اُس وقت فیملی پلاننگ والے بھی نہیں تھے۔ورنہ ان سے مدد لی جا سکتی تھی۔لیکن قدرت نے کرشمہ دکھانا تھا۔اس لئے راجہ ہرنا کشپ کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام راجہ نے ''پرہلاد'' رکھا۔

پرہلاد عجیب مزاج کا مالک تھا۔جب سن بلوغت کو پہنچا ہی نہ تھا کہ ایک دن ایک واقعہ رونما ہوا۔اس واقع نے پرہلاد کو پریشان کر کے رکھ دیا۔پرہلاد کے ذہن میں خیالات کی جنگ چھڑ گئی۔اُس کے سامنے عجیب منظر تھا۔اُس کی آنکھیں ایک کرشمہ دیکھ رہی تھیں۔ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔شاید وہ باپ کو سب کچھ مان لیتا۔اُس کے بت کے سامنے بیٹھ کر پوجا کرتا۔اسے دیوتا مان لیتا لیکن اُس کی آنکھوں نے جب سے یہ منظر دیکھا تھا تب سے عجیب کشمکش میں تھا۔

ایک کمہار کی بھٹی سے بلی کا بچہ زندہ نکل آیا تھا اور اس واقع نے اُس کے اندر ہلچل مچا دی۔کوئی بھلا آگ سے کیسے زندہ بچ سکتا ہے۔بھٹی میں تو کئی دن سے آگ جل رہی تھی۔ضرور کوئی ہے جو بچا رہا ہے۔کوئی ایسی ذات ہے جس نے اس بچہ کو آگ سے محفوظ رکھا ہے۔اس کی حفاظت کی ہے۔وہی طاقت دار ہے۔وہی پوجا کے لائق ہے۔۔میرے باپ میں ایسا کچھ نہیں ہے۔میرا باپ ایسا کام تو نہیں کر سکتا ضرور ایسی ذات ہے جس نے جلتی بھٹی میں بلی کے بچے کو زندہ رکھا۔

پرہلاد اسی سوچ میں ڈوبا رہا اور ایک دن اپنے گُرو (استاد) کو سارا حال کہہ سنایا اور اس کے بارے پوچھا۔استاد تو استاد ہوتا ہے وہ جان گیا لیکن پرہلاد کے سامنے آئیں بائیں شائیں کر کے اُسے ٹال دیا۔پرہلاد بچہ تھا استاد کی بات مان گیا لیکن دلی طور پر مطمئن نہیں تھا۔اُس کے اندر بے قراری تھی۔کوئی چیز اُسے اُکسا رہی تھی۔

اُدھر گُرو (استاد) نے جا کر راجہ ہرنا کشپ کے روبرو پیش ہو کر اس واقعے سے آگاہ کیا۔شاید وہ انعام و اکرام کے لالچ میں تھا۔راجہ ہرنا کشپ غصے سے بھڑک اُٹھا۔اب دونوں باپ ،بیٹا کا ٹاکرا ہو گیا اور پرہلاد نے باپ کو دیوتا ماننے سے صاف انکار کر دیا۔مہاراجہ کے تن بدن میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔میرا بیٹا ہو کر ،میری ہی دیوتائی سے انکار کر رہا ہے۔میں اسے ختم کر دوں اور پھر اُس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا۔

اِسے لے جاؤ اور مندر کے اوپر سے نیچے پھینک دو ،راجہ نے پرہلاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کارندوں کو کہا۔کارندے تو اشارے کے منتظر ہوتے ہیں۔انہوں نے حکم پاتے ہی پرہلاد کو اُٹھایا اور مندر کے اوپر لے جا کر نیچے پھینک دیا۔

یہ مندر راجہ ہرنا کشپ نے بنوایا تھا۔ بہت ہی عالی شان، خوبصورت۔ اس میں اُس نے اپنا بت رکھا ہوا تھا، جس کی لوگ پوجا کرتے تھے۔ یہ مندر آج بھی اپنی کھنڈر حالت میں موجود ہے۔

پرہلاد کو مندر کی آخری منزل سے نیچے پھینک دیا گیا، لیکن سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پرہلاد کو کچھ بھی نہ ہوا اور وہ ہنستا مسکراتا، کھیلتا تھا۔ راجہ ہرنا کشپ اور جلال میں آگیا اور رعایا دانتوں میں اُنگلیاں دبائے محو حیرت تھے۔ ایک طرف انتقام کی آگ جل رہی تھی اور دوسری طرف بچے کو یقین تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میرا بچانے والا مجھے بچا لے گا۔

مہاراجہ نے ایک اور پلان تیار کیا اور اُس پر عمل کروایا۔ تیل کا بڑا کڑھایا رکھا گیا اور اس کے نیچے آگ جلوا دی گئی۔ کارندے حکم بجا لائے تھے۔ دیکھنے والے محو حیرت تھے اور راجہ کے ڈر سے سہمے ہوئے تھے۔ اُن کو جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ راجہ چاہتا تھا کہ ان کے دل میں میرا ڈر قائم رہے۔ رعایا ڈر رہے تھے کہ ہم گئے تو موت پکی۔ جو اپنے بیٹے کو معاف نہیں کر رہا ہے، ہمیں کہاں معاف کرے گا۔

تیل کا کڑھایا جب گرم ہو گیا اور تیل کڑ کڑانے لگا تو پرہلاد کو اُس کڑھائے میں پھینکوا دیا گیا۔

ایک اور کرشمہ۔ جناب کمال ہی ہوگیا۔ مثال جس نے بھی دی کمال دی۔ ''جسے رب رکھے اُسے کون چکھے'' بڑی مشہور مثال ہے اور ہر عام و خاص کے لبوں پر رہتی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ پرہلاد کو کچھ بھی نہ ہوا۔ اس کا بال تک نہ جلا۔ اور اُسے کوئی ڈر، خوف بھی نہیں تھا۔ وہ مسکراتا تھا۔ اُس کی مسکراہٹ دشمن کو آگ لگا رہی تھی۔ وہ جل بھن رہا تھا اور اُسے ختم کرنے کے ہر بے ڈھونڈ رہا تھا۔ دیوتا ہو کر بے بس تھا۔ اگر بیٹے کو ختم نہ کر پایا تو اُس کی ڈھاک ختم ہو جائے گی اور اُس کی دیوتائی ختم ہو جائے گی۔ وہ ایسا کب چاہتا تھا۔

مہاراجہ ہرنا کشپ کی ایک بہن تھی جس کا نام رانی ہولکا تھا۔ رانی ہولکا نے بھائی کو غصے میں دیکھا تو اُس کے پاس جا کر تجویز دی۔

بھائی! میں تیری بہن ہوں اور آپ دیوتا ہو۔۔۔

ہاں! تو؟

دیوتا کی بہن کو کچھ نہیں ہوگا۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو تم بچا لوگے۔۔ ہیں ناں؟

ہاں۔۔۔

میرے پاس ایک تجویز ہے مجھے پورا یقین ہے کہ جیت ہماری ہوگی اور آپ دیوتا ہیں ناں۔ دیوتا ہی رہیں گے۔ کسی کی کیا مجال جو آپ کی دیوتائی سے انکار کرے۔ آپ آگ کی بہت بڑی چتا جلائیں۔ میں پرہلاد کو لے کر اُس میں بیٹھ جاؤں گی۔ مجھے تو آگ کچھ بھی نہیں کہے گی کیونکہ میں دیوتا کی بہن ہوں۔ بھلا دیوتا کی بہن کو آگ کیسے چھو سکتی ہے۔؟ لیکن اس انکاری کا خاتمہ ضرور ہو جائے گا۔ پرہلاد کو آگ جلا کر بھسم کر دے گی۔ یہ مٹ جائے گا آپ کی دیوتائی ہمیشہ رہے گی۔

مہاراجہ کو بہن کی تجویز پسند آئی۔ اس نے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے آگ کی ایک بہت بڑی چتا جلوائی۔ رانی ہولکا اپنے بھتیجے کو لے کر چتا کے اندر بیٹھ گئی۔ دیکھنے والوں کا ہجوم لگ گیا تھا۔

تماشائی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آگ نے رانی ہولکا کو جلا کر بھسم کر دیا اور پرہلاد کو کچھ بھی نہ ہوا اور وہ مسکراتا رہا۔ جیسے پرہلاد کے لئے آگ گلزار بن گئی ہو۔ واقعی آگ اُس کے لیے گل گلزار بن گئی تھی۔ پرہلاد کے ساتھ آگ نے کیا سلوک کیا، اسے چھوڑیں لیکن ہندو آج بھی رانی ہولکا کی یاد میں ہولی کا تہوار مناتے ہیں۔ اس تہوار کا آغاز ملتان سے

ہوا۔

آگ سے بچ جانے والے پرہلاد کے ہر طرف چرچے ہونے لگے۔ پرہلاد باپ سے زیادہ مشہور ہو گیا۔ باپ دن رات تڑپ رہا تھا۔ اُس کی روح کو چین نہیں آ رہا تھا۔ اُس کو نجومیوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ آپ کو موت دن کو آئے گی نہ رات کو، زمین پر آئے گی نہ آسمان پر۔ اس بات کو لے کر وہ کہتا تھا مجھے کبھی موت نہیں آئے گی۔ مہاراجہ اپنی حکومت میں ،اپنے پوجے جانے میں صرف ایک مخالف کو پا رہا تھا اور وہ مخالف کوئی اور نہیں اُس کا سگا بیٹا تھا۔ جس کو اب تک موت کے گھاٹ اتارنے میں ناکام رہا تھا۔ اُس سے نجات ہی میں اس کی سلامتی تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ جس کی سلامتی رب نے رکھی ہو اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ آخر مہاراجہ نے ایک اور پلان بنایا۔

مندر کے اندر بنے لوہے کے ستون تھے۔ مہاراجہ نے ان ستونوں ۔کے اندر آگ جلوا دی اور پرہلاد کو ان ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ جب آگ کی تپش زیادہ ہو گی ،اس کو تڑپائے گی ا ر یہ خود بخود مجھے دیوتا مان لے گا۔ مہاراجہ نے اپنے پلان کو حتمی شکل دی اور ستون گرم ہونے لگے۔ آگ نے اپنی تپش دکھانی شروع کر دی اور ستون سُرخ ہونے لگے لیکن پرہلاد کو کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑا تھا۔ جو تیل کے تپتے کڑھائے سے زندہ سلامت نکل آیا ،مندر کی بلندی سے زندہ بچ گیا ،جس کو آگ نے کچھ نہیں کہا ،اب بھلا اُسے کیا ہونا تھا۔

ستون گرم ہو کر سُرخ ہو چکے تھے کہ اچانک ستون پھٹ گیا اور اس میں سے اوتار سنگھ اُتر آیا۔ (شکل شیر اور جسم انسانی تھا) اُس نے پل بھر میں راجہ ہرناکشپ کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا اور منٹوں میں اُسے ہڑپ کر لیا۔ مہاراجہ کو ہڑپ کرنے کے بعد وہ غائب ہو گیا۔ جو کہتا تھا مجھے موت نہیں آئے گی۔ اب مر گیا تھا بلکہ فنا ہو گیا تھا۔ اور یہ وقت مغرب کا تھا۔ یعنی نہ دن اور نہ رات۔

مہاراجہ ہرناکشپ کا قصہ تمام ہوا اور پرہلاد کے ہر طرف چرچے ہو گئے۔ لوگوں نے پرہلاد کو حکمران بنا لیا۔ پرہلاد نے اس وقت ملتان کا کشپ پورہ جو کہ اس کے باپ سے منسوب تھا بدل کر پرہلاد پورہ رکھ دیا۔ خود پرہلاد بھگت سے مشہور ہو گیا۔ اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مندر سے اور جہاں کہیں اُس کے باپ کے بت تھے سب ختم کروا دیئے اور مندر کو درس گاہ بنا لیا۔ یہاں طالب علم تعلیم حاصل کرنے لگے۔ جہاں سے بڑے بڑے معتبر ہستیاں پڑھ کر گئیں ہیں۔ حضرت معین الدین اجمیری پانچ سال یہیں پر پڑھتے رہے۔

پرہلاد کب مرا، کب اُس کی حکومت ختم ہوئی تاریخ خاموش ہے لیکن کہتے ہیں ہندوؤں میں سب سے پہلا توحید پرست پرہلاد تھا۔ پرہلاد تو کب کا گزر گیا لیکن اس مندر کے نشانات آج بھی موجود ہیں۔ 1992 پر یہ مندر اپنی اصلی حالت میں موجود تھا لیکن کیا کریں اشتعال انگیز لوگوں کا جب بابری مسجد کو شہید کیا گیا تو قلعہ کہنہ پر مسلمانوں نے احتجاجی جلوس نکالے اور چند شریر لڑکے مندر پر چڑھ گئے اور مندر کو کھنڈر بنا دیا۔ یہ کھنڈر آج بھی موجود ہے اور پرہلاد کی یاد دلاتا ہے۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

دیکھ لیا ملتان۔۔۔۔ زاہد علی واسطی

آئینہ ملتان۔۔۔۔ منشی عبدالرحمان

تاریخ ملتان۔۔۔۔ پروفیسر عاشق حسین دُرانی

ملتان کا آئینہ۔۔۔۔ محمد اسلم میتلا

شادی کی خواہش

ایم اشفاق بٹ

اکثر لوگوں کو آپ نے پولیس والوں سے شاکی ہی دیکھا ہوگا۔ یہ شکایت عام طور پر سننے میں آئی ہے کہ پولیس والے بے جا تشدد کرتے ہیں چنانچہ ہماری تحویل میں ایک بے گناہ مجبور و بے بس شہری کو بھی ناکردہ جرم کا اقرار کرنا ہی پڑتا ہے۔ کچھ لوگ تو انتہا سے گزر جاتے ہیں ان کے مطابق ہم ایک کھمبے سے بھی اقبال جرم کروانے کے ایک سو ایک طریقے جانتے ہیں۔

حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نوعیت کے خیالات اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ عوام کے ذہنوں میں اس قسم کے تاثرات کو جامد کرنے میں فلموں کا بڑا ہاتھ ہے جہاں اکثر و بیشتر ملک کے اس حساس ادارے کا حلیہ بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔

بلاشبہ ہمیں سنگین اور ہنگامی نوعیت کے معاملات میں تشدد کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے مگر یہ تشدد بے جا نہیں بلکہ بجا ہوتا ہے کیونکہ عیار مکار قسم کے ڈاکو، لٹیرے اور خطرناک قاتل اتنے شریف النفس نہیں ہوتے کہ رضا کارانہ طور پر ہم سے تعاون کے لیے تیار ہو جائیں۔ اپنی تفتیش کے دوران ہم جب ان سے سوال کریں کہ فلاں جرم تم نے کیا ہے؟ تو وہ نہایت فرماں برداری سے جواب دیں۔

جی مائی باپ۔ یہ غلطی مجھ ہی سے سرزد ہوئی ہے۔ آپ اسے میری پہلی خطا سمجھ کر معاف کر دیں۔ انشاء اللہ۔ آئندہ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا۔

پیشہ ور مجرموں اور نامی گرامی غنڈوں سے حقیقت اگلوانے کے لیے ہمیں مختلف قسم کے حربے اور تفتیشی ہتھکنڈے بھی آزمانے پڑتے ہیں البتہ وہ افراد جو ہماری نظر میں صرف مشکوک ہوتے ہیں۔

پاکستان میں جرائم کی ہوشربا بھرمار ہے۔ تھانیداروں کی کوشش ہوتی ہے کہ کیس رجسٹر ہی نہ ہو اس کے علاوہ رشوت عام چلتی ہے ملک میں جو سیاست رائج ہے۔ یہ بھی کئی مجرموں کا تحفظ کرتی ہے کچھ دلچسپیاں پولیس والوں کی بھی ہیں۔

اوپر والوں کا اثر و رسوخ چلتا ہے۔ ان عناصر نے مل جل کر پولیس کا وہ رول ہی بدل ڈالا ہے جو انگریزوں کے دور حکومت میں ہوا کرتا تھا۔

جب عورت، دولت، زمین کی ہوس ہو جائے تو پھر عجیب و غریب داستانیں جنم لیتی ہیں حسن کے بے بہا خزانوں کے سامنے عشق بے بس و مجبور ہو جاتا ہے۔ شکار اور شکاری کے اس کھیل میں جبر کی تباہی اور تباہ کن داستانیں اور حیران کن واقعات کا ظہور ہونا ایک لازمی امر ہے۔

یہ واقعہ کافی پرانا ہے وہ موسم سرما کی ایک صبح کا واقعہ ہے۔ چاروں طرف چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ان دنوں میں بطور اے ایس آئی ضلع جہلم کے ایک تھانے میں تعینات تھا۔ میں اپنی بیوی کے ہاتھوں کا بنا ہوا ناشتہ کر کے وردی پہن ہی رہا تھا کہ میرے موبائل پر کال آ گئی۔ میں نے وردی پہن کر اپنا موبائل دیکھا تو کانسٹیبل مقصود لائن پر تھا۔ میں نے کال لیں کی تو مقصود نے بتایا کہ سر ایک بینک سے کال آئی ہے کہ ان کے بینک میں بہت بڑی ڈکیتی کی واردات ہوگئی ہے۔

بینک میں ڈکیتی کی واردات شب برأت کی رات کو ہوئی تھی۔ کیونکہ شب برأت کی رات کو بینک سے چھٹی ہوتی ہے اور ہر کوئی عبادت کرنے کی بجائے پٹاخے وغیرہ چلانے میں مصروف ہوتا ہے اور ڈاکوؤں نے ان پٹاخوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 250 فٹ لمبی سرنگ کھود کر بینک کے لاکر روم میں سے 727 لاکر توڑ کر پانچ کروڑ روپے اور دو کروڑ کے زیورات چوری کر کے لے گئے۔

میں جلدی جلدی وردی پہن کر تھانے پہنچا اور اپنے کانسٹیبل مقصود سے کہا کہ جلدی سے کچھ پولیس اہلکار تیار کرو بینک جانے کے لیے جہاں پر ڈکیتی ہوئی ہے۔ آدھے گھنٹے میں، میں اپنے پولیس اہلکاروں کے ساتھ بینک میں موجود تھا۔ بینک کے لاکر روم کا جائزہ لے رہا تھا۔ بینک کے ہال میں چار سی سی ٹی کیمرے لگے ہوئے تھے۔ لاکر روم میں سی سی ٹی کیمرہ نہیں لگا ہوا تھا۔ ایک بات نے ہم سب کو حیران کر دیا کہ لاکر روم کے فرش میں گڑھا کھلا ہوا تھا۔ میں اور کانسٹیبل مقصود اس گڑھے میں اترے تو ایک طرف سرنگ جا رہی تھی۔ ہم نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ ہر پانچ پانچ فٹ کے بعد ایک نشان لگا ہوا تھا کہ سرنگ اتنی ہوگئی ہے۔ پانچ بائی تین مربع میٹر کی سرنگ تھی۔ ہم سرنگ میں چلتے چلتے آگے جا رہے تھے۔ اتنی دیر میں سرنگ نوے ڈگری کے حساب سے نیچے جا رہی تھی جو کہ تقریباً پانچ فٹ تک نیچے جا کر اوپر جانے لگی۔

اوپر جا کر پھر سیدھا جا رہی تھی۔ ہم آگے چلتے گئے۔ چلتے چلتے ایک جگہ جا کر سرنگ ختم ہوگئی اور اب وہ سرنگ اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ جہاں پر ایک سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ ہم سیڑھی کے راستے اوپر چڑھ گئے۔ اوپر جا کے ہمیں ایک کمرہ نظر آیا جہاں سے یہ سرنگ شروع کی گئی تھی۔ مکان اتنا پرانا بھی نہیں تھا لیکن لگتا تھا کہ اس مکان میں کوئی بھی نہیں رہتا تھا۔

جگہ جگہ جالے لٹک رہے تھے۔ مکان کی کوئی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ مکان کافی بڑا تھا۔ میں نے سارے کمروں کو اچھی طرح چیک کرنے کے بعد صحن سے ہو کر باہر نکل آیا۔ مکان کے چاروں طرف بڑی اونچی دیواریں تھیں۔ ایک سائیڈ پر باہر جانے کے لیے گیٹ لگا ہوا تھا۔ مکان کے پچھواڑے ایک خوبصورت سا لان بنا ہوا تھا جہاں طرح طرح کے پھول مہک رہے تھے۔

میں نے جب اس مکان میں سے ہوتے ہوئے جو سرنگ دیکھی تھی جو سیدھی جا کر بینک کے لاکر روم میں نکلتی تھی۔ تو مجھے صاف محسوس ہو گیا کہ یہ پیشہ وروں کا کام ہے۔ نقب زنوں نے سرنگ کھود کر بینک کے لاکر روم میں سے تمام پیسے نکال کر لے جانا بڑے معنی رکھتا تھا۔ نقب زنوں نے اپنے فن کا نہایت اچھا مظاہرہ کیا تھا۔

اب مجھے اپنے فن کا مظاہرہ دکھا کر ان ڈاکوؤں کو پکڑ کر کیفر کردار تک پہنچانا تھا۔ انہوں نے مجھے چیلنج کیا تھا کہ ملک صاحب اگر ہمیں پکڑ سکتے ہو تو پکڑ لو۔ ایک بات میں مانوں گا کہ میری سروس کا یہ سب سے انوکھا ترین واقعہ تھا۔ آج کل تو ڈاکو سرعام بینک میں گھس کر بینک لوٹ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ آج کل کے مجرموں کو پولیس کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔

لیکن میں ذرا کھری ٹائپ کا تھانیدار تھا۔ میں اپنے کام میں کوتاہی نہ کرتا تھا اور نہ کوتاہی برداشت کرتا تھا۔ نہ میں کسی کی سفارش مانتا تھا۔ اسی وجہ سے میں زیادہ دیر کسی بھی تھانے میں ٹکتا نہیں تھا۔ میری تبدیلی کروا دی جاتی تھی۔ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی یہ میرا قصور نہیں یہ میرے بڑھاپے کا قصور ہے۔ میں اب پولیس کی نوکری سے ریٹائرڈ ہو چکا ہوں۔ پچاس برس زندگی کے گزار چکا ہوں اب تو زندگی کی شام بھی ختم ہونے کو ہے۔ پتہ نہیں کب موت کا فرشتہ آ جائے اور دم نکل جائے۔

میں نے اپنی پولیس کی نوکری بڑی بھرپور اور ہنگامہ خیز گزاری ہے۔ پولیس کی نوکری جتنی محنت طلب تھی اتنی ہی دلچسپ بھی۔ اپنی سروس کے دوران طرح طرح کے انسانوں سے واسطہ پڑا ہے۔

شیطان صفت انسان بھی دیکھے اور فرشتہ خصلت بھی۔ جہاں مکار اور چکر باز انسانوں سے واسطہ پڑا وہاں بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح انسان بھی دیکھے۔ غیرت مند بھی ملے اور بے غیرت بھی۔ ان مجرموں میں مردوں کی تعداد زیادہ تھی اور عورتوں کی کم۔ ایسی زندگی گزارنے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے عام لوگوں کے مقابلے میں زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھا ہے۔ یہ وہ عمر

ہوتی ہے جب گھر والے بھی بوڑھا سمجھ کر ہر قسم کے فرائض سے سبکدوش کر دیتے ہیں اور ایسے شخص کے لیے فراغت ہی فراغت ہوتی ہے۔ مجھے بھی ایسی ہی فراغت مل گئی تو میں پریشان ہوگیا کیونکہ فراغت مجھے راس نہیں آئی۔ جس شخص نے اتنی بھرپور زندگی گزاری ہو وہ فراغ کیسے رہ سکتا ہے۔

میں نے اپنی فراغت کو دیکھتے ہوئے اپنی پولیس سروس کے دوران جو وارداتیں ہوئیں اور جن کی میں نے تفتیش کی ان وارداتوں کو اپنے ایک دوست کے بیٹے کو اپنی ایک تفتیشی کہانی سنائی تو اس نے کہا کہ انکل میں آپ کی یہ تفتیشی واردات کو ایک کہانی کی شکل دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اسے بخوشی اجازت دے دی۔ اس نے کہا کہ نام ومقام سب فرضی ہوں گے۔

میرے والد محترم اللہ ان کو جنت نصیب کرے وہ بھی پولیس کی سروس کرتے تھے وہ مجھے بتاتے تھے کہ پتر میرے وقتوں میں اندھے قتل بہت کم ہوتے تھے اگر کبھی ایسی واردات ہو جاتی تو پولیس سخت محنت کرتی تھی اور تھانیدار جان لڑا دیتے تھے۔ بعض اوقات تو کئی کئی سال پرانے کیسوں کا سراغ بھی مل جاتا تھا۔

ویسے ان وقتوں میں اور آج کے وقتوں میں بڑا فرق بھی ہے۔ اب تو قتل وغارت کی اس قدر بہتات ہے کہ انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی اور نہ کوئی پرسان حال ہے کہ کس نے کس کو کیوں قتل کیا ہے۔ آج کل قتل کرنے کے لیے کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں۔ بس اسلحہ ہونا ضروری ہے۔ چوریاں، ڈکیتیں روزمرہ کا معمول ہے۔ آبادی بے تحاشا بڑھ گئی ہے۔ افغان مہاجرین کی آمد سے ایک دوسرے کی شناخت بھی ختم ہوگئی ہے۔ پولیس بے بسی اور ناکامی کی تصویر بن کر رہ گئی ہے۔

میں آپ سب قارئین کو ایک بینک ڈکیتی کی واردات سنا رہا تھا۔

جس مکان سے سرنگ کھود کر بینک کے لاکر روم سے روپے اور زیورات چوری ہوئے تھے اس مکان کے پچھواڑے ایک باغیچہ بنا ہوا تھا اور باغیچے کے ساتھ مکان کی دیوار تھی اور دیوار کے پار سڑک تھی اور سڑک کے بالکل سامنے وہی بینک تھا جس میں بینک لوٹنے کی واردات ہوئی تھی۔ بینک کا نام میں نے آپ کو نہیں بتایا اور نہ بتاؤں گا۔

میں اور میرا کانسٹیبل مقصود دوبارہ اسی کمرے میں آ گئے جہاں سے سرنگ شروع ہوتی تھی۔ میں اور کانسٹیبل مقصود اس کمرے کی ایک ایک چیز کو بڑی غور سے چیک کرنے لگے۔ شاید ڈکیتی کرنے والے اپنے پیچھے کوئی اہم سراغ چھوڑ گئے ہوں تاکہ ہم وہ سراغ پکڑ کر مجرموں تک پہنچ سکیں۔ لیکن ابھی تک ہمارے کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا تھا۔ ہم واپس تھانے آ گئے۔ میں اپنے آفس میں بیٹھ کر اس کیس کے بارے میں سوچنے لگا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا میں نے اپنے کانسٹیبل کو بلا کر اس سے تبادلہ خیال کرنے لگا کہ مقصود اب کیا کرنا چاہیے کیونکہ کانسٹیبل مقصود ایک تجربہ کار کانسٹیبل تھا۔

کافی سوچ و بچار کے بعد ہم نے ایک فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے اس مکان کے مالک کا پتہ کروایا جائے کہ یہ مکان کس کا ہے اور دوسرا اس کمرے کو ایک دفعہ پھر سے اچھی طرح چیک کیا جائے تاکہ کوئی کام کا سراغ ہتھے چڑھ جائے۔

اگلے دن ہم پھر اس مکان کے مین گیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ پولیس والوں کو دیکھ کر لوگ ویسے ہی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔

یہاں تو ایک بینک میں بہت بڑی ڈکیتی کی واردات ہوگئی تھی یہاں تو سارا شہر امڈ آیا تھا۔ میڈیا بھی اکٹھا ہوگیا تھا اور ہم سے مجرموں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ہم ان کو جلد از جلد پکڑنے کا کہہ رہے تھے اور ان کو یقین دلا رہے تھے کہ وہ کب تک قانون کی گرفت سے بھاگتے ہیں۔

اس مکان کے مین گیٹ کی دیوار کے اوپر ایک اشتہار لکھا ہوا تھا کہ اس مکان کا کیس ابھی عدالت میں چل رہا ہے۔ نیچے مالک مکان کا نام اور اس کا موبائل نمبر لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس موبائل نمبر پر کال کی تو جیسے ہی کال ریس کی تو آگے سے ایک مرد نے کہا کہ ہیلو جی کون۔

میں نے کہا کہ اے ایس آئی ملک محمد سلیم بول رہا ہوں کیا تم کبیر ہو تو آگے سے اس نے کہا جی میں کبیر ہی ہوں۔

میں نے کہا جلدی سے ضلع جہلم سول لائن کے تھانے میں پہنچو۔ تم سے بینک ڈکیتی کے بارے میں تفتیش کرنی ہے۔

اس نے کہا کہ میں آتا ہوں فون کرنے کے بعد میں اور کانسٹیبل اس مکان کی دیوار پھلانگ کر اس مکان میں داخل ہو گئے اور سرنگ والے کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ دیکھتے دیکھتے میری نظر اس کمرے کی دیواروں پر پڑی تو کھڑکیوں اور دروازوں پر بالکل نئی لکڑی کی پلائی لگی نظر آئی۔ میں نے کانسٹیبل مقصود کو بتایا وہ بھی کہنے لگا جی سر یہ بالکل نئی پلائی ہے۔ پلائی کے ایک کونے میں ایک دکان کا نام اور نمبر لکھا تھا۔

میں نے دکان کا نام اور موبائل نمبر اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا اور کوئی بھی کام کی چیز نظر نہ آئی تو ہم پولیس وین میں بیٹھ کر لکڑی کی پلائی کی دکان پر پہنچ گئے۔ پولیس کو دیکھ کر اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ کیونکہ پولیس کو دیکھ کر اچھے اچھوں کی ہوا نکل جاتی ہے۔

میں نے اس دکاندار سے کہا کہ کیا نام ہے تمہارا۔ وہ کہنے لگا کہ جی میرا نام اصغر ہے۔ میں نے کہا کہ دیکھ اصغر جو بات میں تم سے پوچھوں وہ سچ سچ بتانی ہے۔ نہیں تو تھانے لے جا کر اتنی چھترول کروں گا کہ تم کو نانی یاد آ جائے گی۔

اصغر کہنے لگا جی جی تھانیدار صاحب آپ پوچھیں جو پوچھنا ہے۔ میرا کانسٹیبل مقصود بڑا چالاک تھا وہ کہنے لگا دیکھ اصغر ہمارے تھانیدار بڑی سخت طبیعت کے مالک ہیں ان سے بچ کے رہنا۔

میں نے پوچھا کہ شب برأت کی رات یا اس سے پہلے کوئی بندہ تم سے کھڑکیاں اور دروازوں کے سائز کی پلائی کٹوا کے لے کر گیا تھا یا تم نے کسی جگہ جا کر لگائی ہو۔

وہ کہنے لگا کہ تھانیدار صاحب جھوٹ نہیں بولوں گا۔ شب برأت کی رات سے پچیس دن پہلے ایک آدمی آیا تھا کہ پلائی کے لیس کاٹ دو۔ میں نے پیمائش والی پرچی لے کر پلائی کے پیس کاٹ دیئے۔

میں نے کہا کیا تم نے اس بندے کا نام یا موبائل نمبر لیا تھا۔ وہ کہنے لگا سر دن میں پتہ نہیں کتنے گاہک آتے ہیں۔ میں کس کس کا نام یا نمبر لکھوں اور یہ بھی نہیں پتہ کہ گاہک اپنا نام اور نمبر ٹھیک لکھواتا ہے یا کہ نہیں۔

میں نے کہا کہ کیا تم کو اس کی شکل یاد ہے۔ وہ کہنے لگا کہ شکل میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ جس نے ریٹ کم کروانے میں میرا اتنا سر کھایا ہو۔

میں نے کہا کہ کل صبح آٹھ بجے تھانے آ جانا اور اس بندے کا سکیچ بنوا دینا۔

جب ہم تھانے پہنچے تو اس مکان کا مالک تھانے میں بڑی بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے دفتر میں بلا کر زمین پر بیٹھا دیا اور کہا کہ بس جلدی سے کہانی سنانی شروع کر دے کہ تمہارے ساتھ کتنے بندے تھے جنہوں نے سرنگ کھود کر بینک لوٹ لیا۔

وہ کہنے لگا تھانیدار صاحب مجھے کسی بات کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ میں نے کہا مکان تمہارا ہے اور تم کو کچھ پتہ نہیں ہے۔ تمہارا مکان سرنگ کھودنے میں استعمال ہوا ہے لیکن وہ انکار ہی کرتا رہا۔

میں نے اسے اپنے ایک اہلکار کے حوالے کر دیا۔ جس نے اسے اچھی طرح خاطر مدارت کی جب اس کو میرے آفس میں لے کر آئے تو اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میرا سوال اب بھی وہی تھا لیکن وہ اپنی بات سے

انکاری تھا کہ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

ساتھ یہ بھی کہا کہ تم یہ شہر چھوڑ کر نہیں جاسکتے اگر جانا ہوا تو تھانے اطلاع دے کر جانی ہے۔ وہ مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔ میں نے شہر کے نامی گرامی ڈکیتوں کو تھانے بلالیا اور ان پر تھرڈ ڈگری کا استعمال بھی کیا لیکن سبھی انکار کرتے رہے۔ اگلے دن میں اور میرا کانسٹیبل پھر سرنگ والے مکان میں پہنچ گئے۔

میں اور کانسٹیبل مقصود نے ایک دفعہ پھر سرنگ والے کمرے کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لینا شروع کر دیا۔ میں اس سے پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ کانسٹیبل مقصود بڑا قابل پولیس والا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کمرے کی کھڑکیوں پر بالکل نئی پلائی لگی ہوئی تھی جبکہ کمرہ دھول مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ جگہ جگہ جالے لٹک رہے تھے۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہ پلائی کھڑکیوں پر اس وجہ سے لگائی گئی ہے کہ سرنگ کی کھدائی کے دوران کسی قسم کی آواز اس کمرے سے باہر نہ جائے۔

اس دکاندار اصغر نے جو سکیچ بنوایا تھا سکیچ میں اس کے سر کے بال لمبے لمبے تھے اور داڑھی بھی تھی۔ میں نے اس کے سکیچ کے کافی سارے پرنٹ نکلوا کر سارے شہر میں جگہ جگہ لگوا دیئے اور مخبروں کو بھی کام پہ لگوا دیا کہ اس بندے کا جلد سے جلد پتہ کرواؤ۔

کیونکہ پولیس کے خلاف جلوس نکالے جا رہے تھے۔ نعرے بازی ہو رہی تھی کہ پولیس ایمانداری سے اپنا کام کر ہی نہیں رہی اوپر سے مجھ پر افسروں نے ناک میں دم کر رکھا تھا کہ ملک صاحب آج اتنے دن ہو گئے ہیں اور مجرم ابھی تک پکڑے نہیں گئے۔ اتنے دنوں میں تو مجرموں کو جیل میں بند ہونا چاہیے تم اور تمہارا سٹاف کیا کر رہا ہے۔ میں نے کہا سر میں بہت جلد مجرموں کو پکڑ کر آپ کو رپورٹ کرتا ہوں۔ تب جا کے افسر نے جان چھوڑی۔

میرے مخبر بھی مصروف تھے۔ ابھی کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ ایک بات خاص طور پر پیش نظر رکھیں کہ قتل کی تفتیش چوری کی نسبت آسان ہوتی ہے۔ قتل کا باعث معلوم ہو جائے تو قاتل تک پہنچنا آسان ہوتا ہے۔ چوری کا باعث چوری ہی ہوتا ہے مال غائب کر دیا جاتا ہے۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں مال لاپتہ ہوتا جاتا ہے۔

زیورات صرافہ بازار میں جاتے ہی پگھل کر سونے کی ایک ڈلی بن جاتے ہیں۔ سراغ اور کھرے کھوج غائب ہو جاتے ہیں اور چور سینے پر لات رکھ کے آپ کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔ پر آپ کو پتہ نہیں چلتا۔ چوری کی واردات میں تھانیدار کو اپنی عقل اور مخبروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ میں نے شہر کے تمام زیورات بنانے والے دکانداروں کو سختی سے خبردار کیا کہ اگر کوئی بندہ زیورات بیچنے آتا ہے تو فوراً مجھے اطلاع کرو۔ ہوسکتا ہے وہ زیورات وہی ہوں جو بینک کے لاکر سے چوری ہوئے ہوں۔

ایک بات میں اپنے پیارے قارئین کو بتانا چاہتا ہوں۔ شاید میرے کئی بھائی کو معلوم ہو کہ ہندوؤں کی دو بڑی قبیح رسمیں ہیں ایک یہ کہ ہندو کم عمری میں ہی لڑکیوں کی شادیاں کر دیا کرتے تھے۔ بارہ تیرہ سال کی لڑکی کو جوان کہا کرتے تھے۔ دوسری رسم یہ تھی کہ ہندو عورت بیوہ ہو جائے تو اس کی دوسری شادی نہیں کرتے۔ تنگ آ کر وہ بیوہ لڑکی کہیں بھاگ جاتی ہے یا خودکشی کر لیتی ہے۔

اب پڑھے لکھے ہندوؤں میں جنہوں نے نئی تہذیب کو قبول کر لیا ہے۔ یہ رسمیں نہیں رہیں لیکن کٹر ہندو اور دیہاتی ہندو آج بھی ان فضول رسموں کی پابندی سختی سے کرتے ہیں۔

میں بات کر رہا تھا کہ میں نے شہر کے سبھی سناروں کو تاکید کر دی کہ اگر کوئی بھی زیور فروخت کرنے کے لیے آتا ہے تو وہ فوراً مجھے کال کر کے اطلاع دے اور زیورات فروخت کرنے والوں کو بہانے سے روکے رکھے۔

ایک روز میرے موبائل کی بیل بجی۔ سکرین پر ایک

اجنبی نمبر تھا۔ میں نے کال لیں کی تو آگے کال پر میرا ایک مخبر تھا۔ اس نے جو بات مجھے بتائی میں وہ سن کر اپنی کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ جو سکیچ والی تصویر ہے اس کا پتہ چل گیا ہے۔

اس کا نام شوکت ہے لیکن سبھی اس کو بگا کہہ کر بلاتے ہیں۔ وہ ایک اینٹوں والے بھٹے پر کام کرتا ہے اور رات کو جوا کھیلتا ہے۔ چھوٹی موٹی وارداتیں بھی کرتا ہے۔ ریلوے پھاٹک کے ساتھ اینٹوں کا بھٹہ ہے۔ ادھر ہی وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ میرے مخبر نے بڑے کام کی خبر سنائی تھی۔ میں نے کہا کہ کل تھانے آ کر اپنا انعام لے جانا میں نے شوکت کو پکڑنے کے لیے ایک ٹیم تشکیل دی۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی اگلے دن صرافہ بازار سے ایک سنیارے کی کال آئی کہ تھانیدار صاحب ایک داڑھی والا شخص اور اس کے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔ برقعہ پہنے ہوئے کافی سارا زیور جو تقریباً چھ لاکھ کا ہے۔ فروخت کرنے آئے ہیں میں نے بہانے سے ان کو دکان پر بٹھایا ہوا ہے کہ لڑکا بینک سے کیش لے کے آتا ہے آپ جلدی سے آ جائیں۔ میں جلدی سے اپنے چند سپاہی ساتھ لے کے مطلوبہ دکان پر پہنچ گئے۔ ہمیں دیکھ کر وہ ایک دم گھبرا گیا۔

اسے دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا کہ یہی بگا ہے۔ اس کی بیوی کو اور ساتھ زیورات کے ان کو تھانے لا کر حوالات میں بند کر دیا اور رات کے ایک بجے میں حوالات میں جا پہنچا۔ بگا اور اس کی بیوی کو بہت سخت نیند آئی ہوئی تھی۔ جب بھی ان کی آنکھ لگنے لگتی تو کانسٹیبل مقصود ان کے اوپر تھوڑا سا پانی گرا دیتا۔ جس سے ان کی آنکھ کھل جاتی۔

میں جب حوالات میں داخل ہوا تو بگا کہنے لگا کہ تھانیدار صاحب ہم دونوں میاں بیوی کو کیوں بے گناہ پکڑ کر لے آئے ہیں اور میری بیوی کہاں ہے کیونکہ اس کی بیوی کو ہم نے علیحدہ بند کر رکھا تھا۔ میں نے کہا بگے تم کو تمہارے سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ اتنا کہہ کر میں اس کمرے میں چلا گیا جہاں اس کی بیوی کو بند کیا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کیا نام ہے تمہارا۔

وہ کہنے لگی کیوں تھانیدار جی میرے خلاف پرچہ کاٹنا ہے۔ وہ بڑے بے تکلفانہ موڈ میں تھی اور بالکل بے خوف ہو کے باتیں کر رہی تھی۔

میں نے کہا تم نے کوئی جرم کیا ہے تو وہ کہنے لگی کہ نہیں۔ میں نے کہا جب تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو میں تمہارے خلاف پرچہ کیوں کاٹوں گا میں نے اس کے حسن کی تعریف کرنی شروع کر دی۔ جس سے وہ آسمان میں اڑنے لگی۔

تعریف مرد اور عورت کی کمزوری ہے۔ اس طرح وہ مجھ میں گھل مل گئی اور کھل کر باتیں کرنے لگی۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ بگے نے مجھ سے پیار کیا اور شادی کی تھی۔ بگا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ ہمارے گھر والے نہ مانے تو بگا ایک دن مجھے گھوڑی پر بٹھا کر رات کے اندھیرے میں مجھے میرے گاؤں سے نکال کر لے آیا اور باقاعدہ گواہوں کی موجودگی میں مجھ سے شادی کر لی۔

بگے نے اپنے دوستوں سے مل کر بینک میں ڈکیتی کی۔ بگا مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ بگے نے اگر بینک میں ڈکیتی کی واردات کی ہے تو اس نے یہ کام میری محبت میں کیا ہے۔

کیوں کہ جس وقت ہم نے گاؤں سے بھاگ کر شادی کی تھی۔ میرے پاس کوئی زیور نہیں تھا۔ بگے کو پتہ تھا کہ مجھے زیور بہت اچھا لگتا ہے۔ اس نے مجھے خوش کرنے کے لیے یہ کام کیا ہے۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کو چھوڑ دیں اور مجھے پکڑ لیں۔ جو سزا دینی ہے مجھے دیں۔ بعد میں بگے نے بھی ساری واردات سنا دی۔ یہ واردات ڈکیتی کی تھی۔ عدالت نے ڈکیتی کرنے والوں کو چار چار سال قید با مشقت سنا دی۔

☆☆☆

واہ مولا تیرے رنگ

محسن علی طاب

کبیر شاہ صوفے پر لیٹا ناول پڑھ رہا تھا۔ وہ عملیات کی دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا۔ پہلے کالے علم کا ماہر رہا تھا۔ اب ایک نیک بندے کی وجہ سے کالے علم کی دنیا کو چھوڑ کر نورانی علم پڑھنے لگا تھا۔ اس کی والدہ حیات تھی والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔

آج کل وہ فارغ تھا۔ سردی میں ناول اور ٹی وی کا مزہ لے رہا تھا۔ اس کے موبائل کی رنگ ٹون بجی کبیر شاہ نے ناول ایک ہاتھ میں پکڑتے ہوئے موبائل کو اٹھا کر لیس کیا۔ آگے سے نسوانی آواز سنائی دی۔

اسلام علیکم! کبیر شاہ نے ناول ٹیبل پر رکھا اور وعلیکم السلام کہا۔ دوسری سائیڈ سے پوچھا گیا آپ کبیر شاہ ہیں؟

کبیر شاہ نے جواب دیا جی ہاں اسی خاکسار کو کبیر شاہ کہتے ہیں مگر میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔

نسوانی آواز نے کہا۔ میرا نام ماریہ ہے سنا ہے آپ عملیات کرتے ہیں۔ میرا بھی ایک مسئلہ ہے کیا آپ ٹائم دے سکیں گے؟

کبیر شاہ نے کہا ضرور.....

ماریہ نے کہا بات لمبی ہے اگر آپ میرے گھر آسکیں تو بہتر رہے گا۔ آرام سے بات ہو جائے گی۔

کبیر شاہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا ٹھیک ہے۔ آپ اپنا ایڈریس مجھے سینڈ کر دیں۔ کل صبح دس بجے کے بعد آؤں گا۔ انشاء اللہ

ماریہ نے کہا شکریہ مجھے انتظار رہے گا۔ خدا حافظ۔

کبیر شاہ نے سوچا کہیں کسی نئی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں خیر اللہ مالک ہے دیکھا جائے گا۔

دوسری صبح کبیر شاہ خاتون کے دیئے ایڈریس پر پہنچ گیا۔ بیل دی تھوڑی دیر بعد گارڈ نے دروازہ کھولا اور پوچھا کون؟

کبیر شاہ نے کہا یہ وزیٹنگ کارڈ ماریہ صاحبہ کو دیں اور کہیں وہ دروازے پر موجود ہیں۔ گارڈ دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور کہا آئیں صاحب۔

کبیر شاہ اندر داخل ہوا۔ گیراج میں لینڈ کروزر اور کرولا کو دیکھ کر حیران ہوا۔ اتنے امیر بندوں کو کبیر شاہ کی ضرورت کیسے پیش آئی۔ اس زمانے میں لینڈ کروزر رکھنے والے کو لارڈ سمجھا جاتا تھا۔ کبیر شاہ کو ڈرائنگ روم میں گارڈ بیٹھا کر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم بھی خوبصورت اشیاء سے مزین تھا۔

ایک کام والی لڑکی چائے اور لوازمات ٹیبل پر سجا کر واپس چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی ایک خوبصورت خاتون ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس نے کبیر شاہ کو سلام کیا اور بیٹھ گئی۔

کبیر شاہ نے سلام کا جواب دیا اور بولا۔ آپ تو بہت امیر ہیں۔ پھر کیسے اس حقیر و فقیر بندے کو یاد کیا۔

ماریہ مسکرائی اور بولی دولت سے ہر چیز ممکن نہیں کچھ چیزیں انسان کے بس سے باہر ہوتی ہیں۔ آپ چائے پئیں باتیں تو ہوتی رہیں گی۔

کبیر شاہ چائے پینے لگ گیا۔

کبیر شاہ بولا۔ آپ اپنا مقصد ساتھ ساتھ بتاتی جائیں تاکہ چائے میرے گلے سے اتر سکے۔ ورنہ مشکل

ہو جائے گی۔

ماریہ مسکرائی اور اس نے بتانا شروع کیا۔

ایک مرتبہ سکول سے چھٹی کے بعد میں گھر واپس آئی۔ تو اس کے ماموں اکیلے گھر تھے۔ اس نے ماریہ پر بہت تشدد کیا اور دھمکی دی کسی کو نہ بتائے ورنہ جان سے مار دے گا۔ ماریہ ڈر گئی تھی۔ اس لئے اس نے زبان نہ کھولی لیکن ماریہ میں انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ اس نے چند سالوں بعد ایک عامل سے رابطہ کیا۔ اس عامل نے ماریہ کا کام کر دیا اور ماریہ سے مالی فائدہ اٹھایا اور ماریہ کے ماموں کو اور اس کے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا۔ وہ عامل کالے علم کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر اس کام کے چند دن بعد اس عامل کا انتقال ہو گیا۔

ماریہ کی شادی ہو گئی مگر اولاد نہ ہوئی۔ اس نے بہت چیک اپ کروائے ڈاکٹر کہتے ہیں آپ دونوں نارمل ہیں پھر ماریہ نے ایک عامل حیدر شاہ سے رابطہ کیا۔

حیدر شاہ نے بتایا یہ اس عمل کی وجہ سے ہے جو آپ نے اپنے ماموں کے اوپر کروایا تھا۔ اس کا توڑ میرے پاس نہیں ہے۔ آپ طاغوتی قوتوں کے بے تاج بادشاہ کبیر شاہ سے رابطہ کریں وہی اس کا توڑ کر سکتا ہے۔ ماریہ نے یہ بھی بتایا کہ اس کا شوہر دوسری شادی کرنے کا سوچ رہا ہے۔ اس لیے آپ سے رابطہ کیا۔

کبیر شاہ نے جواب دیا نمبر ایک میں نے کالا علم چھوڑ دیا ہے۔ مگر آپ کو اس چکر سے نکال سکتا ہوں۔ اب نورانی علوم میں دلچسپی لیتا ہوں۔

ماریہ بولی وہ کیسے؟

کبیر شاہ نے اسے ایک آیت بتائی اور کہا آپ صدقہ خیرات کرو اور اپنے گناہ کی معافی مانگو اور بتایا کہ یہ پڑھو میں بھی آپ کے حق میں دعا کروں گا۔

ماریہ بولی کیا اللہ پاک مجھے معاف کر دے گا؟

کبیر شاہ بولا وہ رحیم ہے ضرور معاف کرے گا۔ بس آپ دل سے معافی مانگیں۔

ماریہ نے اس سے وعدہ کیا۔ ڈیڑھ مہینے بعد کبیر شاہ ایک جوس کارنر کی دکان پر دوستوں کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا۔ کبیر شاہ کے موبائل پر رنگ ٹون بجی۔ کبیر شاہ نے سیل نمبر دیکھا اور دوستوں سے فاصلے پر آ گیا اور کال اٹینڈ کی۔ دوسری طرف سے ماریہ کی آواز سنائی دی۔

اسلام علیکم! کبیر شاہ نے سلام کا جواب دیا اور بولا کیسے یاد کیا۔

ماریہ نے جواب دیا۔ میں نے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ میں نے آپ کی باتوں پر عمل کیا۔ مجھے ایک سہیلی نے بتایا تھا کہ آپ عملیات کی دنیا کے بے تاج بادشاہ رہے ہیں۔ اس لیے میں نے آپ کی باتوں پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس نعمت سے نوازا ہے۔ اب آپ بولیں آپ کو کیا گفٹ دوں۔

کبیر شاہ مسکرایا..... اور بولا۔ مبارک باد۔ آپ بس مجھے دعاؤں میں یاد رکھیں۔ میں تو معمولی سا انسان ہوں میری کیا اوقات ہے۔ خوش رہیں آباد رہیں۔

ماریہ نے کافی اصرار کیا گفٹ دینے پر مگر کبیر شاہ نے منع کیا۔

ماریہ نے شکریہ ادا کر کے کال کاٹ دی۔ کبیر شاہ مسکرایا اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

واہ مولا تیرے رنگ.....

☆☆☆☆

درد کا شہر

آغا سلیم

جو لوگ اپنے یقین کی ڈور خدا پر چھوڑتے ہیں
تو خدا بھی کبھی انہیں مایوس نہیں کرتا۔

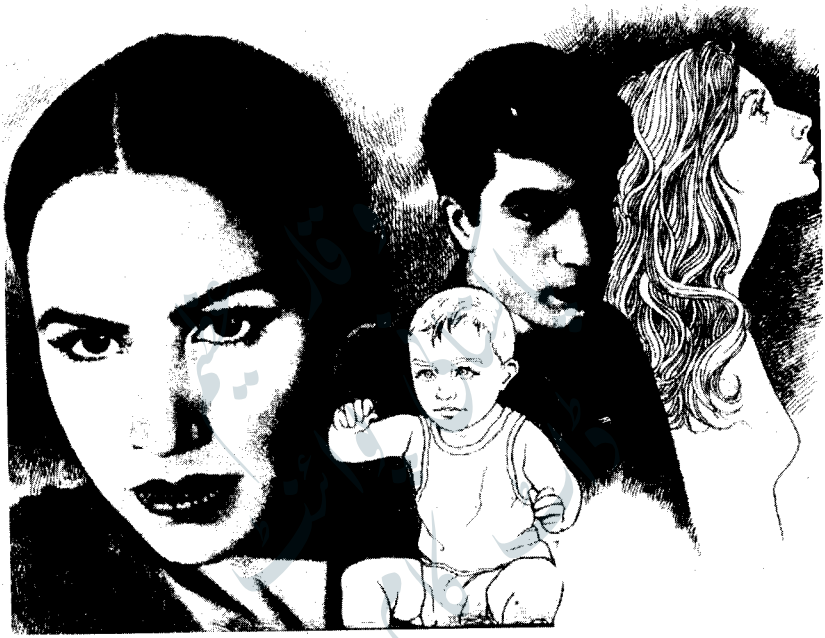

اک آگ غم تنہائی کی جو سارے بدن میں پھیل گئی
جب جسم ہی سارا جلتا ہو پھر دامن دل کو بچائیں کیا

یہ ایک ہوٹل کی کہانی ہے۔

جس ہوٹل کی میں آپ کو کہانی سنانے والا ہوں، وہ کہیں نہیں ہے لیکن شاید ہر جگہ ہے۔ شہر کے ہر بڑے چوراہے اور ہر بڑی شاہراہ پر ہے۔ آپ کسی چوراہے سے گزریں، یا کسی بڑی شاہراہ سے گزرتے وقت گردن اٹھا کر دیکھیں گے تو آپ کو ایک عالیشان عمارت نظر آئے گی، جس کی پیشانی پر لکھا ہوگا..... ہوٹل جس میں طعام و قیام کا اعلیٰ بندوبست ہے۔ اس ہوٹل کے دروازے پر ایک فولادی بدن کا چوکیدار بیٹھا ہوا ہوگا، جس کی کمر آپ کو دیکھ کر اور بھی دوہری ہو جائے گی۔ وہ جھک کر سلام کر کے آپ کو ہوٹل کے منیجر کے پاس لے جائے گا۔ منیجر کا چہرہ خوبصورت من بھاتا اور مہمان نواز ہوگا۔ اس کے کپڑے

صاف ستھرے، قیمتی اور بے داغ ہوں گے۔ آپ کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجائے گی۔ اس کی مسکراہٹ کو خوشی کی علامت نہ سمجھیے گا، کیونکہ نہ تو مسکراہٹ خوشی کا اظہار کرتی ہے اور نہ ہی آنسو دکھوں کا۔ اگر اس کا دل غموں سے چور چور بھی ہوگا، تب بھی وہ آپ کو دیکھ کر ضرور مسکرائے گا اور بے حد نیاز مندی، خوبصورتی اور مروت سے آپ کو پوچھے گا۔ ''سائیں! آپ کو کمرہ چاہیے۔'' لیکن آپ کو نہ تو کمرہ چاہیے نہ بستر اور پلنگ کیونکہ آپ تو گھر بار والے ہیں اور میں بے گھر ہوں۔ مجھے کمرے کی بھی ضرورت ہے، بستر اور پلنگ کی بھی۔ اس لئے میں..... ہوٹل کے 22 نمبر کمرے میں رہتا ہوں اور اس کمرے میں بیٹھ کر آپ گھر بار والوں کو اس ہوٹل اور ان بے گھروں کی بستی کی کہانی سنا رہا ہوں۔

دوسرے ہوٹلوں کی طرح اس ہوٹل کی عمارت بھی بڑی اور عالیشان ہے۔ عمارت کے باہر والے حصے میں جس میں ایک لانڈری کی دکان ہے اور ایک حجام کی۔ لانڈری والا، ہوٹل میں رہنے والوں کے گندے اور غلیظ کپڑے دھو کر اس طرح صاف کر دیتا ہے کہ ان کے پہننے سے داغدار اور غلیظ شخصیت بھی صاف ستھری ہو جاتی ہے۔ حجام اچھے خاصے مسافر کی اس طرح حجامت بناتا ہے جیسے ہم ایک دوسرے کی حجامت بناتے اور سر مونڈتے رہتے ہیں۔ ایک دکان میں ڈاکٹر کی ڈسپنسری ہے جو ہماری روح کے کوڑھ اور ضمیر کے فالج کو ختم کرنے کے بجائے نیند کی گولیاں دیتا ہے۔ ایک دکان میں پوسٹ آفس کی برانچ ہے جس کے دروازے پر لال رنگ کا پوسٹ بکس لٹکا ہوا ہے جو بچھڑے ہوؤں کو پریت کے پیغام پہنچاتا ہے۔ عمارت کے آخری کونے کے پاس پان والے کا کیبن (کھوکھا) ہے۔ جس میں سارا دن فلمی گانے اور اسپرو پر بھروسہ کریں..... جیسے اشتہار نشر ہوتے رہتے ہیں۔ کیبن کے پاس موچی بیٹھتا ہے جو پرانے جوتوں کو پالش کر کے ایسے چمکاتا ہے جیسے..... (کوئی تشبیہ ذہن میں نہیں آرہی ہے) موچی کے پاس ہی ہر روز تیل مالش کرنے والے لڑکے آکر بیٹھتے ہیں۔ ہوٹل کے دروازے کے پاس ایک مضبوط بدن والا سواتی پٹھان چوکیدار بیٹھتا ہے۔ دروازے کے بالکل پاس ہی منیجر کا آفس ہے۔ ہوٹل کا منیجر اتنا نازک، نفیس اور خوبصورت ہے کہ اس کو دیکھنے سے لگتا ہے جیسے کوئی خوبصورت اور نازک بدن لڑکی مردانہ کپڑے پہن کر بیٹھی ہو۔ وہ بہت شرمیلا ہے اور ہر وقت اس کے باریک اور خوبصورت ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ بات کرتے ہوئے اس طرح شرما کر نگاہیں نیچے کرتا ہے کہ اچھے بھلے صوفیوں کو معرفت کی منزل کے نشان مل جاتے ہیں، وہ ہمیشہ شرما کر حیا سے آنکھیں نیچی کئے صوفی منش مسافروں سے پیسے ادھار لیا کرتا ہے اور کبھی بھی واپس نہیں کرتا۔

منیجر کے آفس کے بعد ہوٹل کے کمرے شروع ہو جاتے ہیں۔ ہر کمرہ ایک کائنات اور ہر مسافر ایک زندہ کہانی۔ ہوٹل کے کل 66 کمرے ہیں اور میرا کمرہ سب کمروں سے الگ چھٹی منزل پر ہے۔ آس پاس کوئی دوسرا کمرہ نہیں ہے۔ سامنے بڑا صحن ہے، جو پانچویں منزل کی چھت ہے اور میرے کمرے کا آنگن ہے، اس میں چھوٹی سی چارد یواری بنی ہوئی ہے، میں وہاں شام کے وقت کرسی ڈال کر سگریٹ پیتا ہوں تو وہاں سے سب کچھ نظر آتا ہے۔ بلندیوں پر کھڑے ہو کر دنیا کو دیکھنے میں بھی عجیب مزہ ہے۔ بڑے بڑے قد آور اور صحت مند جوان ہوٹل کی نچلی منزلوں میں گھومتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے بونے گھوم رہے ہوں۔ کمرے کی کھڑکیاں ایسے رخ پر بنی ہیں کہ اپنی کھڑکی کا ایک طاق بھی اگر کھولتا ہوں تو ہوٹل کے ایک ایک کمرے اور ایک ایک مسافر کو دیکھ سکتا ہوں۔ دوسروں کی ذاتی زندگی میں تاک جھانک کر کے خواہ مخواہ خامیاں ڈھونڈتا ہوں کیونکہ دوسروں کی خامیاں دیکھ کر اپنی خامیوں کا جواز مل جاتا ہے اور اپنی اخلاقی برتری کا عجیب راحت بخش احساس ہوتا ہے۔ اس لئے سارا دن دوسرے

مسافروں کے کمروں میں تاک جھانک کرتا ہوں، باہر کی دنیا میں ہزاروں نقاب پہن کر گھومنے والے انسان جب اپنے کمروں میں تنہا ہوتے ہیں اور ..... اور اپنا سامنا کرتے ہیں، اپنا ایک ایک نقاب اتار کر کھونٹی میں لٹکا دیتے ہیں تو میں ان کا اصلی روپ دیکھ کر ڈر جاتا ہوں۔ اصل میں ہماری آنکھیں جھوٹ کی اتنی عادی ہوگئی ہیں کہ سچ کی صورت دیکھ کر ڈر جاتی ہیں۔ انہیں کھڑکیوں سے بیرے کو بلانے کے لئے بار بار بجنے والی برقی گھنٹیوں کی آوازیں بھی سن سکتا ہوں اور بیروں کو ''جی صاحب'' ''حاضر صاحب'' ''آیا صاحب'' کہتا روبوٹ کی طرح دوڑتے بھاگتے سیڑھیاں اترتے چڑھتے بھی دیکھ سکتا ہوں۔ کبھی کبھی رات کے پچھلے پہر شبنم سے بھیگی خاموشی میں چوڑیوں کی کھنک، قہقہوں کا ترنم روٹھنے اور منانے، انکار اور اقرار والی کیفیتوں میں ہونے والی گفتگو کی دبی دبی سرگوشیاں بھی سن سکتا ہوں۔ کبھی کبھی آدھی رات کو کوئی مسافر نشے میں بدمست ہو کر اچانک کسی کمرے کا دروازہ کھولتا ہے تو..... میں آپ کو قطعاً نہیں بتاؤں گا کہ دروازے کھلنے کے بعد میں کیا دیکھتا ہوں کتنے ہی دروازے ایسے ہوتے ہیں جن کا بند رہنا ہی بہتر ہوتا ہے، کیونکہ جب یہ دروازے کھلتے ہیں تو آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں..... اور جب آنکھیں کھل جاتی ہیں تو زبان بھی کھل جاتی ہے اور جب زبان کھل جاتی ہے تو.....

اس ہوٹل میں تین قسم کے مسافر رہتے ہیں۔ ایک وہ جو میری طرح بے گھر ہیں اور کمرے کا ماہانہ کرایہ دیتے ہیں۔ ایسے مسافروں کو ''بے گھر'' ہونے کے ناطے نے آپس میں اس طرح جوڑ دیا ہے کہ سب ایک دوسرے کو ایک ہی خاندان کا فرد سمجھتے ہیں۔ دوسری قسم کے وہ مسافر ہیں جو کسی کام کے سلسلے میں دور دراز کی جگہوں سے آتے ہیں اور ہوٹل میں دو چار راتیں گزار کر اپنا کام پورا کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ ایسے مسافروں کو ہم اپنا مہمان سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ میزبانوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ تیسری قسم کے وہ مسافر ہیں جو صرف عیاشی کرنے آتے ہیں۔ ایسے مسافر زیادہ تر ٹھیکیدار، وڈیرے، جاگیردار، چوہدری اور سرکاری محکموں کے افسر ہوتے ہیں، جو رشوت میں ملی دولت کا صحیح استعمال شراب اور کباب ہی سمجھتے ہیں۔ وہ ساری ساری رات شراب پیتے ہیں۔ پاگل کتوں کی طرح عورتوں کا گوشت نوچتے ہیں۔ ہسٹریائی قہقہے لگاتے ہیں اور چیختے چلاتے ہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر مشرقی تہذیب اور اخلاق پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے، کیونکہ ہم سرمایہ دار نہیں ہیں اور سرمایہ داروں کی طرح عیش نہیں کر سکتے۔

مسافروں کی طرح بیروں کا گھر بھی یہی ہوٹل ہے۔ سب بیرے ایک بڑے ہال میں رہتے ہیں۔ سارا دن گھنٹی کی آواز پر سیڑھیاں اترتے اور چڑھتے ہیں۔ رات کو تھکن سے چور ہو کر یا تو چرس پیتے ہیں یا تیل مالش کراتے ہیں۔ یہاں پر ان کا کوئی گھر بار نہیں ہے، کوئی رشتہ دار نہیں اور کوئی ایسی نگاہ نہیں ہے جو ان کے انتظار میں ہر گھڑی دروازے کی طرف اٹھتی ہو اور کوئی ایسی توتلی زبان نہیں ہے، جو گھر میں آتے دیکھ کر کہتی ہو ''بابا آ گیا، بابا آ گیا۔''

ہر مسافر انہیں الہ دین کے چراغ کا دیو سمجھتا ہے، جو گھنٹی کو چھونے سے حاضر ہو جاتا ہے اور ہر ضرورت پوری کر دیتا ہے۔ ان کی نگاہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ آپ کو دیکھتے ہی آپ کی جیب کی حالت، سماجی رتبہ اور شخصیت کی کمزوریاں پرکھ لیتے ہیں۔ آپ کتنے ہی صاف کپڑے پہن کر آئیں، لیکن ایک ہی نظر میں آپ کے اندر کی حالت دیکھ لیں گے۔

ہوٹل کو گھر سمجھ کر رہنے والوں میں سے، ایک تو میں خود ہوں۔ میں آپ کو اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔ ایک گمنام اور بے گھر ادیب ہوں اور جیتے جی زندگی سے فرار حاصل کر کے ذہنی طور پر بن باس اختیار کیا ہے۔ اپنی اجڑی ہوئی زندگی کے ڈھیر پر بیٹھ کر مٹی میں الٹی سیدھی لکیریں کھینچتا رہتا ہوں اور ان لکیروں کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا

ہوں۔ ٹھوکریں کھا کر ایم اے پاس کیا اور اب ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھاتا ہوں۔ پڑھائی کا پیشہ اس لئے اختیار نہیں کیا کہ میں اس پیشے کو مقدس سمجھتا ہوں، وہ دراصل اس لئے اختیار کیا ہے کہ سرکاری افسر نہیں بن سکا اس لئے اپنے پیشے اور سماجی رتبے پر شرمسار ہوں۔

دوسرا ایک صحافی رہتا ہے۔ چھوٹا قد سانولا رنگ اور جسم بھرا بھرا سا ہے وہ ایک مقامی اخبار میں نوکری کرتا ہے۔ تین سو روپے تنخواہ ملتی ہوگی، لیکن اس کا رہن سہن ایسا ہے جیسے نوکر شاہی ملازمت میں کسی ایسے سرکاری شعبہ میں افسر ہو، جہاں تنخواہ لینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس کے پاس ایک نیا اسکوٹر ہے اور شہر کی پوش کالونی میں بنگلہ بھی زیر تعمیر ہے۔ وہ بڑے بڑے راشی افسروں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ لوگوں سے پیسے لے کر ان افسروں سے ان کے کام کرواتا ہے۔ اس کو شہر کے سارے شراب خانوں، جوا کے اڈوں اور پرائیویٹ قحبہ خانوں سے ماہوار پیسے ملتے ہیں۔ ان ساری باتوں کے باوجود وہ بڑی معصومیت سے کہتا ہے ''صحافت کے اپنے اصول اور قدریں ہوتی ہیں اور صحافی ان اصولوں اور اقدار کا رکھوالا ہے۔''

تیسرا ایک ٹی بی کا مریض رہتا ہے۔ دبلا پتلا، خوبصورت اور جوان، اس کی ساری خوبصورتی اور جوانی کو ٹی بی کے جراثیم کھا گئے ہیں اور اب اس کے جسم پر صرف ہڈیاں باقی رہ گئی ہیں۔ جوانی اور خوبصورتی کے دنوں میں وہ موت کے سفر کی تیاری کر رہا ہے۔ ہر روز اپنے کمرے کے آگے آرام دہ کرسی ڈال کر بیٹھتا ہے اور دور افق میں گھورتا رہتا ہے۔ افق کے اس پار بھی تو ایک دنیا ہے جدھر سورج ہر روز شام ڈبکی لگا کر گم ہو جاتا ہے۔ جہاں جنت ہے، جہاں حوریں ہیں، سکھ ہے جہاں ٹی بی کا کوئی جراثیم نہیں ہے، کوئی درد نہیں ہے، کوئی رنج اور غم نہیں ہے، لیکن یہ دکھوں اور درد سے بھری ہوئی دھرتی اتنی پیاری کیوں ہے؟ کیوں روح افق کے اس پار والی دنیا میں جاتے ہوئے چیختی اور چلاتی ہے؟ اس کے پاس بھی تو کچھ خواب ہوں گے۔

اس کا دل بھی تو چاہتا ہوگا کہ کوئی ایسی پیاری آغوش ہو جہاں سر رکھ کر وہ زندگی کے ڈنک برداشت کر سکے۔ خوبصورت اور پیاری انگلیاں ہوں جو پیار سے اس کی پیشانی سے دکھوں کی دھول صاف کریں۔ اس کے لئے تو زندگی ایک بڑا پرانا زخم ہے اور زندگی کی ساری خوبصورتی، رنگ و روپ اس کے جسم سے ٹپکتا ہوا خون کا رنگ ہے۔ شفق کے رنگ، گلاب کے لال پھول اور کسی دوشیزہ کے گالوں پر لالی کی بہار، سب خون کے ہی تو رنگ ہیں۔

میں نے سنا ہے کہ وہ اپنی دولت مند اور بیوہ ماں کا اکلوتا لاڈلا بیٹا ہے۔ ابھی چھوٹا سا تھا کہ باپ مر گیا۔ چچا بہت زیادہ پیار کرتا تھا، جب جوان ہوا تو چچا نے اپنی خوبصورت اور سلجھی ہوئی بیٹی کا رشتہ دینا چاہا لیکن دو ر چار ماہ بعد ہی اسے ٹی بی ہوگئی پہلے تو اس نے بیماری کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور ٹی بی کے جراثیموں نے اس کے دونوں پھیپھڑوں کو زخمی کر دیا۔ جب وہ بستر پر پڑ گیا تو چچا نے اپنی خوبصورت اور سلجھی ہوئی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ پیار، دوستی، محبت، رشتے ناطے اور دوسرے اچھے اچھے اور پیارے پیارے رشتے کتنا بڑا جھوٹ ہیں۔ سچ تو صرف ٹی بی کے جراثیم ہیں جو ان جھوٹ پر چڑھے ہوئے خول کو کتر لیتے ہیں اور جھوٹ برہنہ ہو کر ظاہر ہو جاتا ہے۔

ہوٹل کا مالک بھی یہیں رہتا ہے۔ خود تو کوئی ریٹائرڈ پٹواری ہے لیکن اس کا باپ کسی تحصیلدار کے پاس چپڑاسی تھا اور وہ پٹواری کے بعد اس ہوٹل کا مالک ہے۔ وہ خود بدصورت ہے، مگر اس کے بچے بہت خوبصورت ہیں۔ اس کی پوری زندگی پیسوں کا حساب کرتے کرتے خود حساب کی کوئی کتاب بن گئی ہے..... جس میں تفریق، تقسیم اور جمع کے سوا کوئی حرف ہی لکھا ہوا نہیں ہے۔ ہر انسان کے دل کے کسی کونے میں کسی نہ کسی حسین تصور کا چاند ضرور چھپا ہوا ہوتا ہے، لیکن اس ہوٹل کے مالک کے دل کا کوئی روشندان کھول کر دیکھیں یا اس کے دل کے سارے دروازے کھول کر دیکھیں تو آپ کو ہر دروازے اور روشندان کے پیچھے

دولت کے ڈھیر نظر آئیں گے۔ ان میں مزید دولت حاصل کرنے کے لالچی اور زہریلے سانپ بل کھاتے نظر آئیں گے۔ کسی بھی دروازے کے پیچھے، کسی حسین تمنا کی دلہن، کسی حسین تصور کا چاند، کسی حسین یاد کا جلتا ہوا دیپ نظر نہیں آئے گا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا اور لالچ کے پھنکارتے ہوئے سانپوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے گا۔

صبح ہوتی ہے تو ایک اخبار والا لڑکا ایک ایک کمرے کے آگے آوازیں لگاتا گزرتا ہے۔

''پڑھو، آج کی تازہ خبر پڑھو! اندھے عشق کا اندھا کارنامہ، ایک عورت شوہر کو زہر دے کر عاشق کے ساتھ بھاگ گئی۔''

اس اخبار فروش لڑکے کی عمر مشکل سے آٹھ یا دس سال ہوگی۔ اس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون میں ابھی جوانی کا شعلہ سلگا ہی نہیں ہے، جو اندھے عشق کو اندھا کارنامہ انجام دلاتا ہے اور اس کو اندھے عشق کا پتہ ہے۔ اس کو مسافروں کی ایک ایک جنسی مسرت کا بھی پتہ ہے، جو ان کو ایسی خبروں سے حاصل ہوتی ہے اور وہ اس سے اخبار خریدتے ہیں۔

رات ہوتی ہے تو تیل مالش والا لڑکا آوازیں لگاتا پھرتا ہے۔ ''تیل مالش!.....تیل مالش!''

یہ لڑکے بھی تو کسی ماں کا خواب، کسی تخلیق کار درد اور کسی درد کی دواہوں گے۔ ان کی مامتا کی ماری ہوئی ماں نے ان کو نہلا دھلا کر تیل کنگھی کر کے آنکھوں میں سرمہ ڈال کر، ہاتھوں میں کتاب دے کر سکول بھیجا ہوگا۔ کس نے ان سے وہ کتابیں چھین کر ان کے ہاتھ میں تیل مالش کی شیشیاں اور اندھے عشق کے اندھے کارنامے والے اخبار پکڑا دیئے۔ یہ لڑکے جیتی جاگتی کہانیاں ہیں اور اگر میں آپ کو ان لڑکوں کی کہانیاں سنانا شروع کر دوں تو پھر اس ہوٹل کے 66 نمبر کمرے کی یہ کہانی ''الف لیلیٰ'' کی داستان بن جائے گی۔ آپ بھی ''الف لیلیٰ'' والے وہی بادشاہ تو ہیں جن کو کہانی سننے کا بہت شوق تھا اور جو ہر رات نئی کہانی سنتا تھا، لیکن میں ''الف لیلیٰ'' والی وہ رانی نہیں ہوں جو آپ کو بادشاہوں اور سند باد جہازی کی خوبصورت اور جھوٹی کہانیاں سناؤں۔ میں تو آپ کو ان بچوں کی کہانیاں سناؤں گا، جو ہیں تو پھول جیسے بچے لیکن جو پھول کی طرح کھل نہیں سکے۔ جن کے ہاتھوں میں کتابوں کے بجائے تیل کی شیشیاں اور اخبار ہیں۔ آپ یہ پیپ بھری، گندی، خراب اور کوڑھ زدہ کہانیاں سن کر مجھے زندگی کی بقا دینے کے بجائے قتل کر دیں گے۔ اس لئے کہ سچ ہمیشہ سولی پر ہی تو لٹکا ہے۔

جب فصل پک کر تیار ہوتی ہے یا گندم پکنے کا موسم آتا ہے، تب اس ہوٹل کے ایک ایک کمرے میں بہار آجاتی ہے۔ کسی کمرے میں قہقہوں کے پھول کھلتے ہیں تو کسی کمرے سے گھنگھروؤں کی ہلکی جھنکار سننے میں آتی ہے! دو تین بیروں کے سپرد صرف یہ کام ہوتا ہے کہ وہ مسافروں کے لئے شراب کباب اور شباب کا بندوبست کریں، ہوٹل کا مالک دو چار عورتوں کو ہوٹل میں لا کر ٹھہراتا ہے، جن کی صبح سے الاٹمنٹ ہوتی ہے۔ یعنی آج رات وہ فلاں..... فلاں کمرے میں جائے گی وغیرہ وغیرہ.....ایک دفعہ چار عورتیں آ کر ٹھہریں، ان میں سے ایک بہت خوبصورت تھی۔ اس کا نام زہری تھا، ویسے تو انگ انگ خوبصورت تھا، لیکن اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں، بڑی بڑی کالی اور لمبی پلکوں والی جو کٹاری کی طرح جہاں اٹھتی تھیں قتل کر دیتی تھیں۔ اس نے ایک طوطا پالا ہوا تھا، جس سے سارا دن باتیں کرتی تھی: ''پیارے طوطے.....سدا پھل پھولوں میں رہو۔''

میں بھی اس ہوٹل میں خود اپنی آنکھوں سے لوگوں کو عیش و طرب میں مشغول دیکھتا ہوں، لیکن خود کو شریک نہیں کر سکتا اس لئے نہیں کہ میں کوئی شریف آدمی ہوں، بلکہ اس لئے کہ میں ایک معمولی ادیب ہوں۔ میرے پاس دولت کے ڈھیر کے بجائے جذبوں کے خزانے ہیں۔ اس دنیا میں کھوٹہ سکہ تو چل سکتا ہے لیکن سچا جذبہ نہیں چل سکتا۔

تنخواہ ملتی ہے تو ہوٹل میں کھانے کے پیسے، چائے اور کمرے کا کرایہ ادا کرتا ہوں۔ سگریٹ والے کو پیسے دیتا ہوں، جو باقی بچتے ہیں، ان سے زندگی کی معمولی ضروریات پوری کرتا ہوں۔ ایک دفعہ تنخواہ ملی تو دل میں ایک حیوانی اور وحشی خواہش جاگ اٹھی کہ ان پیسوں سے کچھ عیاشی کرلوں۔ یہ خواہش اتنی شدید اور زبردست تھی کہ سیدھا منیجر کے پاس چلا گیا۔ پچھلے مہینے کا بل ادا کرنے کے بجائے زہری کی الاٹمنٹ کرائی۔ منیجر چونکا اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا..... اس کی خوبصورت اور شرمیلی آنکھوں میں ہوٹل کا حساب لکھا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر تک آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے ہوٹل کا حساب سمجھاتا رہا لیکن پھر میرے چہرے پر حیوانی اور وحشی خواہش کا سایہ دیکھ کر چپ ہوگیا۔ نیچی نظروں سے اس نے حیرانی اور لالچی نظروں سے پیسے لے کر رکھ لئے میں اپنے کمرے میں آکر اس گھڑی کے سپنے دیکھنے لگا جب میری وہ وحشی خواہش پوری ہوگی اور زہری میری ویران زندگی میں بہار بن کر آئے گی۔ میری مجبور خواہشوں کے پھول کھلیں گے، جس کی خوشبو انگ انگ میں سما جائے گی..... کس خوبصورت جملے سے مجھے اس کا استقبال کرنا چاہیے اور پھر اس کے ساتھ گفتگو کرتے وقت کون کون سے جملے استعمال کرنے چاہئیں؟ لیکن میری اس بدحواسی کا کیا ہوگا، جو کسی جوان اور خوبصورت عورت کو دیکھ کر مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔

سارا دن اس طرح کے خیالات کا جال بنتا رہا..... اور بے چینی اور بے قراری سے رات کا انتظار کرتا رہا..... تا آنکہ جب رات نے آکر پر پھیلائے تو اسی لمحے ستاروں کی آنکھیں ٹمٹمائیں اور اس طرح وہ گھڑی آگئی جب زہری نے میرے کمرے میں قدم رکھا اس کو دیکھتے ہی میں حواس باختہ ہوگیا..... اور احمقانہ سوال کیا۔

''آ گئیں.....؟''

''دکھائی نہیں دے رہا کہ آ گئی ہوں۔''

اس نے بے نیازی سے جواب دیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آنکھیں تو دیکھ رہی ہیں کہ تم آ گئی ہو لیکن پتہ نہیں دل کیوں نہیں مان رہا ہے۔''

''پیسے دیئے ہیں، پھر دل کیوں نہیں مان رہا ہے۔''

دراصل پیسوں سے خریدی ہوئی خوشی اتنی جھوٹی ہوتی ہے کہ اس کا یقین ہی نہیں آتا ہے۔''

''پھر کس نے کہا ہے کہ جھوٹی خوشی خریدو۔''

''دل نے کہا ہے اور کون کہے گا۔''

اس نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور چپ چاپ سگریٹ کے کش لینے لگی۔ میں نے اٹھ کر بتی بند کردی۔

''کیوں ابھی سے بتی کیوں بند کررہے ہو۔''

''اس لئے کہ تمہارے چہرے کے نور سے بلب بے نور لگ رہا ہے۔''

''اوہو.....!'' وہ بھنویں سکیڑ کر اقرار کے انداز میں سر ہلا کر اس انداز میں بولی جیسے میری بات کا مذاق اڑا رہی ہو۔ میں نے خفت مٹانے کے لئے اٹھ کر بتی جلائی اور خاموشی سے یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''اس طرح سے میری آنکھوں میں کیا دیکھ رہے ہو؟''

''تمہاری آنکھوں کی ان کٹاریوں کو دیکھ رہا ہوں جن سے تم روز قتل کرتی ہو۔''

''باتوں کے ماہر لگتے ہو۔''

''ماہر ہونے کی اس میں کیا بات ہے۔ اس میں جھوٹ تو نہیں تمہاری آنکھیں کٹاری کی طرح ہیں۔ تمہاری خوبصورتی دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ تمہیں تو رانی ہونا چاہیے تھا۔''

''اب رانی نہیں ہوں کیا؟ ذرا غور کرو، میں تو اب بھی تمہارے دل کی رانی ہوں۔''

''تمہیں تو کسی گھر کی رانی بننا چاہیے تھا لیکن تم.....''

''لیکن میں طوائف ہوں، یہی کہنا چاہتے ہو ناں؟''

''اگر تم طوائف ہو تو اس میں تمہارا کیا قصور ہے مجھے

یقین ہے کہ حالات سے مجبور ہو کر تم نے یہ پیشہ اختیار کیا ہو گا۔''

''حالات نے مجھے طوائف نہیں بنایا..... میں پیدائشی طوائف ہوں۔''

''مانتا ہوں کہ تم پیدائشی طوائف ہو، لیکن کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تمہارا ایک گھر ہو جس کے آنگن میں بیٹھ کر تم بچے کو لوری دو۔''

''اب سرمت کھاؤ اٹھو بتی بند کرو تا کہ نیند کریں۔''

اس نے میری بات کو بیچ میں کاٹ کر کہا۔

''تم بے شک سو جاؤ، لیکن میں نہیں سوؤں گا۔ میں تو ساری رات تمہاری خوبصورتی کو دیکھتا رہوں گا۔''

''جو پیسے خرچ کئے ہیں وہ وصول نہیں کرو گے۔''

''وہ تو اس وقت ہی وصول ہو گئے تھے، جب تم نے میرے کمرے میں قدم رکھا تھا۔''

''تمہاری مرضی۔''

''ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو.....''

تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟

''کیوں نہیں کی ہے۔ مجھے اچھے کپڑوں، زیوروں اور اپنے طوطے سے بہت پیار ہے۔''

''بھلا کسی مرد سے محبت کی ہے؟''

''مرد اس لائق ہے سہی کہ اس سے محبت کی جائے!!''

''اوہو.....!''

میں بھویں سکیڑ کر بولا اور اقرار میں سر ہلا کر اس کے انداز کی نقل کی۔ وہ مسکرا دی۔ ہم ساری رات باتیں کرتے رہے۔ میں اس کی خوبصورتی کی تعریف کرتا رہا اور وہ اپنی خوبصورتی کی تعریف سن کر مسکراتی رہی، یہاں تک ہوا میں خنکی رچ گئی۔ جب پو پھٹنے لگی، جب چاروں طرف روشنی پھیل گئی، تب وہ چلی گئی۔

دوسری رات بھی میں نے اسے بلایا اور پو پھٹنے تک اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ تیسری رات بھی میں نے اسے بلایا اور ہم صبح تک باتیں کرتے رہے لیکن..... چوتھی رات، اپنے ساتھ اندھیرا اور اکیلا پن لے آئی۔ تین راتوں میں تین سو روپے خرچ ہو گئے تھے۔ باقی پچاس روپے بچے تھے جن میں سے بیس پچیس روپے خرچ کر چکا تھا اور باقی بچے ہوئے پیسوں سے پورا مہینہ گزارنا تھا۔ ہوٹل کا اور سگریٹ کا بل دینا تھا، لیکن مجھے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ صرف اکیلے پن کا احساس تھا، اس دن پہلی بار مجھے اپنی غربت کا دکھتا ہوا احساس ہوا۔ کل رات اسی کمرے میں زہری کے چہرے کی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے انگ انگ سے خوشبو پھوٹ رہی تھی..... اور آج ..... اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو سامنے زہری کھڑی تھی۔

''زہری تم.....؟''

میں تیزی سے پلنگ پر سے اٹھا۔

''کیوں! نہیں آنا چاہیے تھا مجھے؟ کہو تو واپس چلی جاتی ہوں۔''

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف احمقوں کی طرح منہ کھولے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''اس طرح آنکھیں پھاڑ کر کیوں دیکھ رہے ہو؟''

میں نے پھر بھی اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ آہستہ آہستہ جب حیرت کم ہوئی اور یقین ہو گیا کہ زہری میرے سامنے کھڑی ہے، جس طرح چاندنی رات میں لہر اٹھ کر کنارے پر پڑی پیاسی ریت کو سیراب کرتی ہے اسی طرح میرے اندر بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وجود کے ایک ایک ذرے کو سیراب کر گئی۔

''کیا واقعی تم آ گئی ہو؟'' خوشی سے میری باچھیں کھل گئی تھیں۔

''کیوں آج بھی میرے آنے کا یقین نہیں آ رہا ہے؟''

''کیسے یقین آئے تم تو میرا وہ خواب ہو جس کی کوئی تعبیر نہیں ہے۔ وہ تمنا ہو جس کی کوئی تکمیل نہیں، اور وہ

خواہش ہو جس.....''

''اب بس بھی کرو خواہ مخواہ کی باتیں کر کے میرا سر مت کھاؤ۔'' اس نے سگریٹ سلگائی اور کش لیتے ہوئے بولی۔

''آج رات کیوں نہیں بلایا۔''

''پیسے ختم ہو گئے تھے اس لئے نہیں بلایا؟''

''کیا کرتے ہو؟''

''کالج میں پڑھاتا ہوں۔''

تنخواہ کتنی ملتی ہے؟

''کہتے ہیں کہ عورت سے عمر اور مرد سے تنخواہ نہیں پوچھنی چاہیے، لیکن خیر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ساڑھے تین سو روپے تنخواہ ملتی ہے۔''

''ساڑھے تین سو میں سے تین سو تو میں لے گئی ہوں۔ باقی پچاس روپے بچے ہوں گے۔ پچاس روپے میں مہینہ کیسے گزارو گے۔''

''سنا نہیں ہے، کہ دانے دانے پر کھانے والے کی مہر لگی ہوتی ہے۔ ان دانوں پر میرا نام لکھا ہو گا وہ کھاؤں گا۔''

اس نے پرس کھول کر سو روپے کے تین نوٹ نکال کر میری طرف بڑھائے اور بولی.....

''یہ لو.....''

''کیوں.....؟''

''تین راتیں تم نے صرف مجھ سے باتیں کی ہیں اور میں صرف باتوں کے پیسے نہیں لیتی۔''

''زہری تم پیسے واپس کر کے میری غربت کا مذاق اڑا رہی ہو۔''

''مذاق کی اس میں کون سی بات ہے۔''

''تم دوسروں سے پیسے لیتی ہو۔ میں اس لائق بھی نہیں کہ تم مجھ سے پیسے لو۔''

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔''

''تم مجھے غریب سمجھ کر، میری غربت پر ترس کھا کر پیسے واپس کر رہی ہو۔''

''تم بات کیوں نہیں سمجھ رہے ہو۔''

''میں کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتا۔ مہربانی کر کے پیسے اپنے پاس رکھ لو۔''

''جو تمہاری مرضی۔'' اس نے پیسے واپس اپنے پرس میں رکھے اور کمرے میں ناگوار سی خاموشی چھا گئی۔

اس رات بھی ہم صبح تک باتیں کرتے رہے، لیکن اس رات میرے دل میں کانٹا سا چبھتا رہا اور وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی جیسے مجھے منا رہی ہو۔

اس دن صبح کو میں کراچی چلا گیا اور ایک دوست سے پیسے لے کر دوسرے دن واپس آیا۔ سیدھا منیجر کے آفس میں گیا.....اور اس سے ہوٹل کا بل پوچھا۔ منیجر نے معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ''آپ کا بل ادا ہو چکا ہے۔''

''لیکن میں نے تو بل ادا ہی نہیں کیا!''

''آپ نے تو ادا نہیں کیا تھا، لیکن آپ کا بل ادا ہو چکا ہے۔''

اس نے اپنی مسکراہٹ مزید معنی خیز بناتے ہوئے کہا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی مسکراہٹ میرا مذاق اڑا رہی ہو۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں جب میں نے بل ادا ہی نہیں کیا تو پھر میرا بل کیسے ادا ہو گیا؟''

''آپ کا بل زہری نے ادا کر دیا ہے۔''

اس کے الفاظ بجلی بن کر میرے دل پر گرے اور جسم کی پوری بستی کو بھسم کر دیا۔

یوں محسوس ہوا جیسے بیچ چوراہے پر کھڑا ہوں اور لوگوں کا ہجوم میری ہنسی اڑا رہا ہو۔ میں نے منیجر کی طرف دیکھا، اس کے ہونٹوں پر ویسی ہی مسکراہٹ تھی اس کی مسکراہٹ مجھے سانپ بن کر ڈسنے لگی۔ پورے جسم میں زہر بھر گیا۔ نیم جان سی عزت نفس نے کالے سانپ کی طرح پھن اٹھایا اور پورا جسم آگ میں جلنے لگا۔ غصے میں ہانپتا کانپتا

سیڑھیاں پھلانگتا زہری کے کمرے میں پہنچ گیا۔ زہری بیٹھی طوطے سے باتیں کررہی تھی مجھے دیکھ کر مسکرائی، لیکن پھر میرے چہرے کو غصہ میں لال پیلا دیکھ کر اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ حیران ہوکر پوچھا۔

''کیابات ہے؟''

''تم نے یہ کیا کیا ہے؟''

''کیا کیا ہے؟''

''مجھے ذلیل اور خوار کرکے پوچھ رہی ہو کہ کیا کیا ہے؟ تم نے میرا ہوٹل کا بل کیوں ادا کیا ہے یہ بتانے کے لئے کہ تم امیر ہو اور میں مفلس ہوں اور تم مجھے پال سکتی ہو۔ کان کھول کر سن لو میں مفلس ہوں، غریب ہوں، لیکن عزت سے کما کر کھاتا ہوں تمہاری طرح دھندا نہیں کرتا! سمجھیں؟''

میری بات سن کر اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور میں ہانپتا کانپتا جیسے ہی کمرے کی طرف مڑنے لگا تو یوں محسوس ہوا جیسے ایک ایک قدم من بھر کا ہوگیا ہو۔ گلے میں کوئی چیز اٹکی اور سانس گھٹنے لگا۔ سارا جسم پسینے میں تر ہوگیا۔ جسم کی ساری رگیں اور شریانیں تبور کے تاروں کی مانند اس طرح کھنچ کر سختی سے تن گئیں کہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایک قدم بھی آگے بڑھا تو پورے جسم کی رگیں اور شریانیں کچے دھاگوں کی مانند ٹوٹ جائیں گی۔ جیسے تیسے کرکے زہری کے کمرے سے نکلا اور گرتا پڑتا اپنے کمرے میں پہنچا سوچنے لگا کہ.....

اچھا کیا کہ اسے ذلیل کیا۔ بڑی آئی مجھے پالنے والی! غریب ہوں تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ میری کوئی عزت نہیں ہے۔ اس سے زیادہ عزت دار ہوں۔ دو ٹکے کی طوائف خود کو پتہ نہیں کیا سمجھ رہی ہے۔ میری بے عزتی کی اور میں چھوڑ دیتا۔

اچھا کیا جو میں نے اس کو بے عزت کیا لیکن اس نے مجھے بے عزت کرنے کے لئے تو ایسے نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنا پیار دکھانے کے لئے میرا بل ادا کیا تھا۔ میں نے اس کے پیار کا اچھا بدلہ دیا ہے۔ اچانک کسی غیبی ہاتھ نے میرا دل جکڑ لیا اور پورا جسم سن ہوگیا پھر مجھے ہوش نہیں رہا جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو زہری کی گود میں سر رکھے روتے پایا۔

''مجھے معاف کردو زہری! میں نے تم سے بہت ذلیل برتاؤ کیا ہے۔ اس وقت مجھے پتہ نہیں کیا ہوگیا تھا۔ میں ہوش میں نہیں تھا۔ زہری مجھے تم سے محبت ہے۔ اتنی محبت کہ میں تمہارے لئے آسمان میں دراڑ ڈال سکتا ہوں۔ ہوٹل کی چھٹی منزل سے چھلانگ لگا سکتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ میں غریب ہوں اور تم امیر ہو۔ میں زمین کا ذرہ ہوں اور تم آسمان کا چاند ہو، لیکن پھر بھی مجھے تم سے محبت ہے اگر میں تم کو حاصل نہیں کرسکا تب بھی میں تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ زندگی جب بھی کوئی نیا زخم لگائے گی، جب بھی کسی نئے ظلم کی زنجیر پہنائے گی اور میں دکھ کی آگ میں جلنے لگوں گا، تب تمہاری یاد کی گود میں منہ چھپا کر روؤں گا اور تمہیں پکاروں گا۔ تم بھی جس وقت بہت زیادہ خوش ہو، زندگی کے عیش اٹھا رہی ہو، ہونٹوں پر قہقہے ہوں تب مجھے یاد کرنا، سمجھنا کہ کوئی غریب، مفلس اور نادار انسان تم کو یاد کررہا ہے۔ تمہاری مہربان یاد کی گود میں منہ چھپا کر رو رہا ہے۔''

''بس کرو خدا کے واسطے بس کرو۔ تم خود تو پاگل ہو لیکن مجھے بھی پاگل کردو گے۔''

پھر تو میرے آنسوؤں کا سیلاب بند توڑ کر بہہ نکلا جیسے جیسے وہ تسلی دیتی رہی، اتنا ہی میرا دل پھٹنے لگا۔

اور پھر زہری اپنے سامان سمیت میرے کمرے میں منتقل ہوگئی اور ہم دونوں ساتھ رہنے لگے۔ ہم نے زبان سے تو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا وعدہ نہیں کیا تھا، لیکن ہمارے دل میں جو پیار کے چراغ جل اٹھے تھے ان کی روشنی میں ہماری روحوں نے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے وعدے کرلئے تھے، اور میں پاتالوں میں رہنے والا انسان آسمان پھلانگ کر عرش پر جا

پہنچا۔ پاؤں میں ستاروں کے کنول تھے، گود میں چاند اتر آیا تھا اور بالوں میں شبنم کے قطرے تھے۔ زہری کی زندگی میں بھی عجیب انقلاب آ گیا تھا اس کی روح اور جسم پیار میں اتنا رچ گیا کہ اس کے انگ انگ سے پیار بہہ نکلا اور میری بے رنگ ازل سے پیاسی زندگی سیراب ہوگئی۔ اس کی بڑی بڑی کالی خوبصورت آنکھوں میں خوابوں کا جہان آباد ہوگیا تھا۔ پیار میں اس کا انگ انگ کھل اٹھا اس کو دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان چھوئی البیلی بوٹی تھی جسے میں نے اگر ہاتھ بھی لگایا تو شرم سے دوہری ہوکر اپنے کنوارے پن کے ہزار حجابوں میں چھپ جائے گی اور میں اس کو ڈھونڈ نہیں پاؤں گا۔ اس کا پیار اتنا اتھاہ اور بے پناہ تھا کہ میری ہستی ان کی وسعتوں اور گہرائیوں میں غرق ہوگئی۔ رات کے اندھیرے اور ستاروں کی ہلکی اور ٹھنڈی روشنی میں بیٹھ کر ہم دونوں باتیں کرتے رہتے، خواہ مخواہ کی اور بے معنی سی باتیں۔ جیسے دو بچے آپس میں بے کار سی اور بے معنی باتیں کرتے ہیں، لیکن ان باتوں کے ایک ایک لفظ میں ہمارے پیار میں رچی ہوئی روحیں چھپی ہوتی تھیں۔ ہمارا پیار ایک ایک لفظ کی صورت میں قطرہ قطرہ بن کر ہمارے دل کے پیالے میں ٹپکتا تھا۔ کبھی کبھی میں آسمان کی نیلی جھیل میں کھلتے ہوئے ستاروں کے کنول دیکھ کر کہتا تھا ''پتہ ہے یہ ستارے کون ہیں؟''

''کون ہیں؟''

''ان لوگوں کی روحیں ہیں، جنہوں نے ہماری طرح زندگی گزاری، جب ہم مر جائیں گے، تب ہماری روحیں بھی اسی طرح ستارے بن کر آسمان میں ٹمٹمائیں گی۔''

''میں مرجاؤں گی تو میری روح..... وہ بڑا ستارہ دیکھ رہے ہو ناں جو سب سے زیادہ چمک رہا ہے۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا ستارہ بن کے تمہاری طرف دیکھوں گی۔''

''ایسی باتیں منہ سے مت نکالو۔''

''واقعی کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں جلد ہی مر جاؤں گی میں اتنی خوش ہوں کہ ڈر لگتا ہے کہ اسی خوشی میں مر نہ جاؤں۔ سچ بتاؤ اگر میں مر جاؤں تو تم مجھے یاد کرو گے؟''

''میں تمہیں اکیلا نہیں مرنے دوں گا۔ تمہارے ساتھ میں بھی مر جاؤں گا۔''

زہری میری اتنی خدمت کرتی کہ میں دل ہی دل میں شرمسار ہوتا رہتا تھا۔ ایک دن جوتا لا کر میرے پاؤں کے پاس رکھا تو میں نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو۔''

''کیوں؟ کیا کر رہی ہوں؟ میں تمہاری خدمت کے لائق نہیں ہوں۔''

''اتنی خدمت کر کے شرمندہ مت کیا کرو۔''

''تم کس لائق ہو تمہیں کیا پتہ۔''

''مجھ سے پوچھو اگر میرے بس میں ہو تو میں تمہاری خدمت کروں کہ تمہیں تنکا بھی نہ اٹھانا پڑے، لیکن میں عورت ذات اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتی ہوں۔''

میں نے ایک دفعہ اس سے پوچھا ''زہری تم نے اپنا طوطا کیوں اڑا دیا؟''

''اب جو طوطا پالا ہے۔''

''کہاں ہے وہ طوطا۔ میں بھی تو دیکھوں۔''

''یہ ہیں ناں!'' وہ انگلی میرے سینے پر رکھتے ہوئے بولی۔

''اس طوطے پر اعتبار مت کرنا، موقعہ ملا تو اڑ جائے گا!''

''میں نے پر کاٹ دیئے ہیں، اب کہاں اڑ سکے گا۔''

''اور اگر پر دوبارہ نکل آئیں تو؟''

''تو پھر کاٹ دوں گی، اس کو تو ایک پنجرے میں بھی بند کیا ہے۔''

''کون سے پنجرے میں اس بے زبان کو بند کیا ہے؟''

''یہ دل کا پنجرہ جو ہے!''

''اوہو!'' میں نے بھی اس کے انداز کی نقل کر کے بھنویں سکوڑیں گردن کو اقرار میں ہلایا۔ ہم دونوں کا قہقہہ نکل گیا۔

ایک رات کالج سے لوٹا تو مجھے دیکھتے ہی زہری کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور پھر اس کے گالوں پر حیا کے دیئے جل اٹھے۔

''کیا بات ہے آج بہت خوش نظر آ رہی ہو؟''

''پہلے منہ میٹھا کراؤ تو پھر بتاؤں گی۔''

''یہاں آؤ تا کہ منہ میٹھا کراؤں۔''

''چھوڑو تمہیں تو ہمیشہ مذاق کی سوجھتی ہے۔''

''اچھا تو پھر ہم وہ خوش خبری نہیں سنتے۔''

''نہیں سنو گے تو پچھتاؤ گے۔''

''ابھی بتا دو گی، عورت کے پیٹ میں بات کہاں ٹھہرتی ہے۔''

''اس خیال میں مت رہنا، ہرگز نہیں بتاؤں گی۔''

''اچھا کیسے بتاؤ گی۔''

''مٹھائی کھلاؤ گے تو پھر بتاؤں گی۔''

''اچھا سائیں ہم مٹھائی کھلانے کا وعدہ کرتے ہیں، اب تو بتاؤ۔''

اس نے نگاہیں جھکا لیں اور اپنے آنچل کا پلو انگلیوں پر لپیٹنے لگی۔ اس کے دل میں کوئی بات تھی جو گلے میں اٹک گئی تھی اس کے اندر عجیب سی ہلچل تھی، جس کا سایہ حیا کی لالی کی صورت میں اس کے گالوں پر شفق بن کر کھل رہا تھا۔

''کیسے بتاؤں کہ میں..... ماں بننے والی ہوں۔''

''ہیں!'' میرے منہ سے بے اختیار چیخ سی نکل گئی اور ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔ وہ دوڑ کر پلنگ پر جا بیٹھی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ میرے تو ہوش ہی اڑ گئے تھے۔ بات ہی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، پھر جب بات سمجھ میں آئی تو دوڑ کر اس کے پہلو میں جا بیٹھا۔ اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تو اس کے چہرے پر فتح، حیا اور خوشی کی ملی جلی کیفیات مسکراہٹ بن کر چمکنے لگیں۔ میں نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

اس رات ہم ایک پل کے لئے بھی نہیں سوئے ساری رات باتیں کرتے رہے۔ ہر پل کوئی چھوٹا سا شیر خوار بچہ ہماری گود میں لیٹا ہمک رہا ہوتا تھا۔ آج کی رات کتنی حسین تھی۔ آج رات زندگی کے تکون کی تکمیل ہو گئی تھی۔ آج کی رات ہماری روحیں بدن کا قرض چکا کر ہلکی پھلکی ہو کر عرش کی طرف اڑ گئی تھیں کسی کے استقبال کے لئے عرش کے ایوانوں میں چراغاں کیا گیا تھا اور حوریں کسی بچے کو ستاروں سے جڑے ہوئے پالنے میں جھولا دے رہی تھیں۔

''اگر بیٹا ہوا تو کیا نام رکھو گے؟''

''ایسے ہی جمعہ، ہفتہ یا اس قسم کا کوئی نام رکھ لیں گے۔''

''مذاق مت کرو، کوئی اچھا سا نام بتاؤ۔''

میں نے اس کو کئی نام بتائے لیکن اسے پسند نہیں آ رہے تھے۔

''نام پھر سوچیں گے، پہلے بتاؤ ہمارے بچے کی شکل تمہاری طرح ہو گی یا میری طرح ہو گی۔''

خدا کرے تم جیسا ہو۔

''کیوں! میری طرح کیوں ہو۔ تمہاری جیسا کیوں نہ ہو؟''

''اگر تمہارے جیسا ہو گا پھر مجھے بہت اچھا لگے گا۔''

''اگر میری طرح ہو گا تو میں اس کو دن رات جوتے لگاؤں گا۔''

''کیسے مارو گے۔ میرے بچے کو ہاتھ تو لگا کر دیکھنا۔''

''پگلی اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ خدا کرے کہ تم جیسا ہو۔''

''اچھا اس کو پڑھاؤ گے کہاں؟''

''ایسے ہی کسی مدرسے میں داخل کرا دوں گا۔''

''میں تو اپنے بچے کو مدرسے میں داخل نہیں کراؤں گی۔ میں تو اس کو انگریزی پڑھاؤں گی۔ انگریزی پڑھ کر

بڑا افسر بنے گا، پھر شادی کراؤں گی لیکن..... اگر اس کو پتہ چل گیا کہ تم سے شادی سے پہلے میں ایک ..... میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔''

صبح کو وہ تیار ہو کر کھڑی ہوگئی۔

''چلو بازار چلیں۔''

''کس لئے.....؟''

''بچے کے کپڑے اور کھلونے خریدنے ہیں۔''

ابھی سے کپڑے اور کھلونے خرید رہی ہو۔

''پھر نہیں تو کب خریدیں گے۔''

میں اس کو بازار لے گیا اور اس نے اتنے کپڑے اور کھلونے خریدے کہ اٹھانے مشکل ہوگئے۔ ایک چھوٹا سا جھولا اور پلاسٹک کا گڈا بھی خریدا۔ ہوٹل میں واپس آئے تو وہ گڈے کو گلے لگا کر پیار کرنے لگی۔

اب وہ سارا دن اس گڈے کو جھولے میں جھلاتی رہتی اور لوریاں دیتی رہتی تھی اور توتلی زبان میں اس سے باتیں کرتی رہتی تھی میں شام کو کالج جاتا تھا اور رات کو واپس آتا تھا تو وہ گڈے کو اٹھا کر کہتی تھی ''وہ دیکھو تمہارے بابا آ گئے۔ بابا کو سلام کرو۔'' پھر گڈے کا ہاتھ سلام کے انداز میں پیشانی پر رکھ کر کہتی۔

''بابا سلام''

''وعلیکم السلام''

اگر کبھی بے خیالی میں سلام کا جواب نہیں دیتا تھا تو ناراض ہو جاتی تھی۔ ''تم نے میرے بچے کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا۔''

''سائیں غلطی ہوگئی، معافی مانگ رہے ہیں، پھر دوبارہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔''

زہری بہت خوش تھی۔ اتنی خوش کہ آج اس بات کا اعتراف کر رہا ہوں کہ مجھے اس کی خوشی سے حسد سا محسوس ہونے لگا تھا۔ جب سے وہ حاملہ ہوئی تھی، تب سے وہ اپنے بچے کے خوابوں میں اتنی گم ہوگئی تھی کہ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ میرے قریب ہوتے ہوئے بھی مجھ سے دور ہو، جیسے ہم دونوں کی زندگی کی راہیں تھوڑی دیر کے لئے ایک دوسرے سے ملیں اور پھر الگ ہو گئی ہوں۔ اس کی منزل دوسری تھی اور میری دوسری تھی۔ عورت تخلیقی منزل کی مسافر ہوتی ہے اور مرد اکیلے پن کا مسافر۔

پانچویں مہینے میں جب اس کے پیٹ میں بچے نے حرکت کی تو وہ بہت خوش ہوئی، جیسے پوری کائنات سمٹ کر اس کے پہلو میں بس گئی ہو اور.....

اور.....ایک دن جب میں کالج گیا تو پرنسپل (جو کالج کا مالک اور مینجنگ ڈائریکٹر بھی تھا) نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگے ''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے۔ ''آپ کہاں رہتے ہیں؟''

''ہوٹل میں رہتا ہوں۔''

''اکیلے رہتے ہیں یا بچوں کے ساتھ۔''

''اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہوں۔''

معاف کیجئے گا۔ میں آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھ رہا ہوں کہ آپ کی بیوی کون ہے؟''

''عورت ہے اور کون ہوگی۔''

میں تھوڑا بوکھلا سا گیا۔

''عورت تو ہے لیکن عورتوں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں میں نے سنا ہے کہ آپ کی بیوی.....معاف کیجئے گا۔''

''پہلے تھی، لیکن اب شریف بن گئی ہے۔''

''آپ نے نکاح کیا ہے۔''

''نہیں.....''

''آپ پڑھے لکھے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ معاشرے نے ہم کو ایک عظیم کام سونپا ہے۔ اپنی آنے والی نسل کے رکھوالے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ آپ کی ذاتی زندگی کا آپ کی نوکری سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن شاگرد کی نفسیات ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے استاد کی زندگی کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا ہے، اس لئے کہ استاد اس کا آدرش ہوتا ہے، اسی لئے استاد کی زندگی کا اس کی

نوکری سے براہ راست تعلق بن جاتا ہے۔ جب شاگردوں کو آپ کی ذاتی زندگی کے بارے میں پتہ چل جائے گا تو پھر آپ سمجھ رہے ہیں ناں کہ ان کے ذہنوں پر کیا اثر پڑے گا۔ جس نسل کے سامنے ان کا آدرش ہی اونچا نہیں ہوگا وہ نسل بڑی ہو کر اخلاق اور جنسی لاقانونیت کا شکار ہو جائے گی، اس لئے میں اپنی قوم کی آنے والی نسل کی اخلاقی پرورش کو سامنے رکھ کر بڑے افسوس کے ساتھ آپ کو بتا رہا ہوں کہ آج سے آپ کی نوکری ختم ہے۔ آپ جیسے قابل استاد سے یہ کالج محروم ہو جائے گا جس کا مجھے بہت زیادہ دکھ رہے گا..... لیکن کیا کیا جائے۔ کبھی کبھی کچھ کام اپنی مرضی اور خوشی کے خلاف بھی کرنے پڑتے ہیں۔''

اس کا ایک ایک لفظ سانپ بن کر میرے جسم سے میری سانس چوس رہا تھا اور مجھ میں اتنی طاقت بھی نہ رہی کہ اپنے بچاؤ کے لئے ایک لفظ بھی بول سکوں۔ پرنسپل نے اکاؤنٹنٹ کو بلایا اور مجھے ایک مہینے کا ایڈوانس دلا کر رخصت کیا تو اس کی آنکھوں میں ہمدردی کے آنسو تیر آئے۔

میں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح قدم اٹھاتا باہر نکل آیا اور کالج کی دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔ گردن موڑ کر آخری دفعہ کالج کی عمارت کو دیکھا۔ پہلے دن جب میں نے نوکری کرنے کے لئے یہ دہلیز پار کی تھی، تب کالج کی عمارت نے ماں کی طرح اپنی بانہیں پھیلا کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تھا، لیکن آج اس طرح دھتکار دیا تھا جیسے میں اس کا سوتیلا بیٹا تھا۔ شاید میں زندگی کا بھی سوتیلا بیٹا تھا۔ اس نشیب و فراز والے شہر کا بھی سوتیلا بیٹا تھا، آج سب نے مل کر مجھے دھتکار دیا تھا۔ میں اکیلا، بیگانہ اجنبی اور غیر محفوظ اس کالج کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ سامنے شہر کی شاہراہ پھیلی ہوئی تھی، جس پر کاروں، رکشا اور ایک دوسرے کو مارنے، کچلنے کی سازشیں کرنے والے خوبصورت چہروں اور دھواں ہوتے دل والے لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔

آخر یہ بھاگ دوڑ، چیخ وپکار، جدوجہد کس لئے ہے؟ کیا مجھ جیسے سوتیلے بیٹوں کو جینے کا حق نہیں؟ ہم نے تو سماجی سمجھوتہ اس لئے کیا تھا کہ سوتیلے بیٹے بھی قانون کی پناہ میں جی سکیں، لیکن یہاں تو آج بھی وہی جنگل کا قانون رائج ہے۔ آج بھی طاقتور کمزور کو چیر پھاڑ کر اس کی ہڈیاں تک چبا کر زبان سے باچھوں کا خون صاف کر کے بڑے آرام سے ڈکار لیتا ہے اور قانون اپنی ساری ہیبت دبدبے اور عظمت کے ساتھ آنکھوں پر پٹیاں باندھے ہاتھ میں انصاف کا وہ ترازو لئے کھڑا ہے، جس کے پلڑے کبھی برابر نہیں ہوئے اور جس میں ہمیشہ کمی ہی رہتی ہے۔

کمرے میں قدم رکھا تو زہری مجھے دیکھ کر ہراساں ہو گئی اور بڑی دہشت زدہ آواز میں بولی۔ ''میرے چھوٹے کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔''

''کیوں کیا ہو گیا ہے؟''

''رات سے حرکت نہیں کر رہا ہے۔''

میں اپنے دکھ لے کر اس کے پاس آیا تھا اور وہ اپنے بے کار دکھ لے کر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے غصہ آ گیا اس لئے چڑ کر بولا تمہارا دماغ خراب ہے۔ یہ بچہ تمہیں پاگل کر دے گا میں نے جو جھڑکا تو پگھل گئی روتے ہوئے کہا۔

''میرے بچے کو کچھ ہو گیا ہے۔ ویسے تو ہر وقت پیٹ میں حرکت کرتا رہتا تھا، لیکن رات سے حرکت ہی نہیں کی۔ کہیں..... کہیں اسے، کچھ ہو نہ گیا ہو۔''

میں نے اسے گلے لگایا اور دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔ ''پگلی کبھی کبھی بچے دم سادھ لیتے ہیں اور ہفتوں حرکت نہیں کرتے تم بے کار وہم کر رہی ہو۔''

''دل کو بہت سمجھا رہی ہوں لیکن دل نہیں مانتا۔ دل پر کوئی بوجھ سا آ پڑا ہے، یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی خوف ناک بات ہونے والی ہو، جیسے کچھ ہو چکا ہو یا ہونے والا ہو۔ خدانخواستہ میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو میں مر جاؤں گی، تباہ ہو جاؤں گی۔''

میرے سینے میں منہ چھپائے وہ کسی چھوٹے بچے کی

طرح ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

میں نے اسے کہا کہ ''حاملہ عورت کا کبھی کبھی دم سا گھٹنے لگتا ہے، دل پر غبار چڑھتے ہیں خواہ مخواہ کے وہم کر رہی ہو، کچھ نہیں ہے، خدا رحم کرے گا۔ اب ذرا ایک دفعہ ہنس کے تو دکھاؤ۔ میری وجہ سے ہنسو، نہیں ہنس رہی ہو؟ اچھا پھر میں بھی تم سے نہیں بولتا۔ اب بھی نہیں ہنس رہی ہو؟ اچھا دیکھتا ہوں کیسے نہیں ہنسو گی!''

میں نے اسے گدگدایا تو اس کے ہونٹوں پر سسکتی ہوئی مسکراہٹ آئی۔ میں اپنے دکھ بھول گیا اور اس کا دل بہلانے کے لئے اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ کسی وقت تو ہنس دیتی اور کسی وقت اس کے چہرے پر غم کے اندھیرے چھا جاتے۔ رات کو سوتے وقت میں نے بتی بجھائی تو فوراً اٹھ بیٹھی اور تیزی سے بولی۔ ''بتی جلاؤ اندھیرے میں میرا دل گھبرا رہا ہے، دم گھٹ رہا ہے۔''

میں نے اٹھ کر بتی جلائی اور وہ ساری رات سو نہ سکی اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی تھی۔ ''پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا ہے جانے حرکت کیوں نہیں کر رہا!''

دوسرے دن صبح ہی صبح میں ڈاکٹر کو لے آیا۔ ڈاکٹر نے جو اس کو سہما ہوا دیکھا تو اسے تسلی دینے لگی اور معائنہ کرنے کے بعد اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہنے لگی ''بے کار اپنی حالت خراب کر لی ہے کچھ نہیں ہوا، بچہ بالکل ٹھیک ہے تھوڑا کمزور ہو گیا ہے۔ اس لئے حرکت نہیں کر رہا اور اگر حرکت کر بھی رہا ہے تو اس طرح کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ باقی فکر کی کوئی بات نہیں۔''

ڈاکٹر کی بات سن کر وہ خوش ہو گئی۔ میں ڈاکٹر کے ساتھ نیچے اترا تو وہ کہنے لگی ''میرا خیال ہے کہ بچہ مر چکا ہے انہیں فوراً بڑے ہسپتال لے جائیں اگر دیر ہو گئی تو زہر پھیل جائے گا۔ ایک بات کا خیال رکھیے گا کہ انہیں پتہ نہ چلے کہ بچہ مر چکا ہے۔'' ڈاکٹر کی بات سن کر میرا دل ٹوٹ سا گیا۔ جسم کانپنے لگا، ٹانگوں میں کپکپاہٹ ہونے لگی اور سر گھومنے لگا، یوں لگا جیسے ابھی گر پڑوں گا۔ سیڑھی پر قدم رکھا تو دماغ اتنی زور سے چکرایا کہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر گزر گئی۔ بہت دیر تک میں دونوں ہاتھ سر پر رکھے وہیں سیڑھیوں پر بیٹھا رہا۔ اچانک خیال آیا کہ اگر زہری نے میری یہ حالت دیکھ لی تو سب کچھ سمجھ جائے گی، پھر کیا ہو گا۔ فوراً کھڑا ہو گیا اور بڑے اطمینان سے مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی مسکرانے لگی۔

''میں نے کہا تھا ناں کہ بے کار کے وہم مت کیا کرو۔''

''کیا کروں انسان کا اپنے دل پر بس تھوڑی ہوتا ہے۔''

''ارے سچ دوسری بات سنو۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بچہ بہت کمزور ہو گیا ہے اور اسے پوری خوراک بھی نہیں پہنچ رہی ہے۔''

''پھر.....؟'' وہ سہم گئی۔

''فکر کرنے کی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بچے کو ابھی پیدا ہونا چاہیے۔ آٹھ مہینے تو ویسے بھی اسے پیٹ میں ہو گئے ہیں ابھی ڈاکٹر تمہیں ایک سوئی لگائے گا پھر ہمارا چھوٹا ہماری گود میں ہو گا۔ اسے اتنا دودھ پلائیں گے کہ پہلوان بن جائے گا اور اپنے خم ٹوک کر کہے گا۔ ''بابا مجھ سے کشتی لڑو گے؟'' میں اسے کہوں گا ''نہیں بیٹا میں کمزور آدمی تم سے کشتی نہیں لڑ سکتا ہوں۔'' بات کرتے کرتے دل بھر آیا لیکن فوراً خود پر قابو پا لیا۔ میں نے اسے راضی کر لیا اور ہم اسی وقت بڑے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک ڈاکٹر مجھے پہچانتی تھی، اتفاق سے وہ مل گئی اس نے اچھی طرح زہری کا معائنہ کیا کہنے لگی کہ ''بچہ مر چکا ہے'' اس لئے فوری طور پر آپریشن کرنا پڑے گا، نہیں تو مریضہ کے اندر زہر پھیل جائے گا۔ ایک دوسری بات میں آپ کو بتا دیتی ہوں اور مریضہ کو شاید پھر کبھی اولاد نہ ہو سکے۔''

''مجھے بچے کی ضرورت نہیں ہے مجھے اپنی بیوی کی

زندگی عزیز ہے۔''

زہری کو اسی وقت آپریشن تھیٹر میں پہنچایا گیا۔ وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔ وہ اس طرح خوفزدہ آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی جیسے اسے مقتل کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔

آپریشن تھیٹر کا دروازہ بند ہوا اور میں برآمدے میں چکر کاٹنے لگا۔ عجیب خیال ذہن میں دوڑنے لگے۔ سر گھومنے لگا اور ٹانگوں میں کپکپی سی ہونے لگی۔ پورے جسم سے سانس نکلتی ہوئی لگی اور میں وہیں برآمدے میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا پھیلنے لگا، اور پھر رونا دھونا گلے سڑے گوشت کی بدبو، جیتا جاگتا خون چاروں طرف سے بے کفن مردوں کا ناچ ڈھاریں اور آدم بو، آدم بو کی آوازیں، چونک کر آنکھیں کھولیں تو سامنے نرس کھڑی تھی۔

''مبارک ہو آپریشن کامیاب ہوا ہے۔''

اتنے میں زہری کو آپریشن تھیٹر سے اسٹریچر پر باہر لے آئے۔ اس کی آنکھیں بے جان سی آدھی کھلی اور آدھی بند، گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی اور جسم ساکت تھا۔ زہری پلنگ پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی اور میں سگریٹ کے کش لگاتا بے چینی سے کمرے میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ زہری کا آپریشن کامیاب ہوا تھا کیونکہ اس کا بڑا آپریشن کیا گیا تھا۔ اس لئے اب وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ اب جب وہ آنکھیں کھولے گی اور اپنے بچے کا پوچھے گی، تب میں اسے کیا جواب دوں گا۔ اسے کیسے بتاؤں گا کہ اس کا بچہ جس کے لئے اس نے جاگتے سپنوں کے ہزار جہان بنائے تھے۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔ کسی ممتا کی ماری ہوئی ماں کو اس کے بچے کی موت کی خبر سنانا کتنی دل دہلانے والی بات ہو گی، لیکن حقیقت کو کیسے چھپایا جائے۔ آخر کار وہ گھڑی آ گئی، جس سے میں ڈر رہا تھا۔ زہری نے آنکھیں کھولیں اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''پانی..... پانی''

میں نے اسے گلوکوز پلایا۔ چند لمحوں میں وہ بالکل ہوش میں آ گئی۔ ڈھونڈتی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا بچہ کہاں ہے۔''

''بچے کو ڈاکٹر لے گیا ہے۔''

''کیوں لے گیا ہے؟ کہاں لے گیا ہے؟''

''بچہ بہت کمزور تھا، سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اسے آکسیجن دینے کے لئے گئے ہیں۔''

''تم جھوٹے ہو۔ جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، بتاؤ میرا بچہ کہاں ہے؟ کہاں کر دیا میرے بچے کو؟ ارے میں اس کی ماں ہوں، کم از کم مجھے اس کی صورت تو دکھاؤ۔ لے کر آؤ ایک بار میں اپنا دودھ تو پلاؤں اسے۔ تم نہیں لے کر آ رہے ہو تو میں خود جاتی ہوں۔''

وہ جلدی سے اٹھی اور چیخ مار کر ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھ دیئے۔ اس کے ٹانکے ٹوٹ گئے تھے خون بہنے لگا۔ نرس دوڑ کر ڈاکٹر کے پاس گئی اور میں حیران و پریشان اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ کمزوری اس پر غالب آتی گئی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور ہونٹوں سے ٹوٹی پھوٹی آواز نکلتی رہی ''میرا بچہ رو رہا..... ہوگا..... ایک دفعہ..... دودھ تو..... پلا دوں اسے'' اسے اسٹریچر پر ڈال کر جلدی جلدی پھر سے آپریشن تھیٹر کی طرف لے جایا گیا وہ بچ گئی۔

اب دو تین سال گزر گئے ہیں ہوٹل پہلے کی طرح چل رہا ہے۔ زندگی اسی طرح رواں دواں ہے۔ نئے نئے مسافر آتے ہیں اور دو چار دن رہ کر چلے جاتے ہیں، جانے کے بعد کوئی بھی کسی کو یاد نہیں کرتا، نہ کسی کو کسی کے آنے کی خوشی اور نہ جانے کا غم ہوتا ہے۔ ہوٹل کے سب رشتے کچے جھوٹے اور وقتی ہوتے ہیں۔

اب بھی بیروں کو بلانے کے لئے گھنٹی کی آوازیں گونجتی ہیں، اور بیرے ربوٹ کی طرح ''جی صاحب'' ''آیا صاحب'' ''حاضر صاحب'' کہتے دوڑتے بھاگتے

سیڑھیاں اترتے اور چڑھتے رہتے ہیں اور رات کو تھک ہار کر چار پائیوں پر جا کر گرتے ہیں۔ صبح سویرے اخبار والے لڑکے کی آواز گونجتی ہے اور شام کو تیل مالش والے لڑکے کی۔ بڑے بڑے سرکاری افسر اور ٹھیکیدار اب بھی آتے ہیں۔ ساری رات پیتے ہیں اور باولے کتوں کی طرح شباب پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

صحافی ہوٹل چھوڑ کر اپنے بنگلے میں رہنے لگا ہے۔ اس کے کمرے میں ایک سادہ دیہاتی رہتا ہے۔ ہر روز آرام کرسی پر بیٹھا دور افق کو گھورنے والا ٹی بی کا نوجوان مریض کبھی کا یہ بے درد دنیا چھوڑ کر افق کے اس پار پہنچ چکا ہے۔ ایک دن اچانک اس کی حالت خراب ہوگئی تھی اور جب اسے اس کے گاؤں لے جانے لگے تو راستے میں ہی اس کا دم نکل گیا تھا۔ اس کے کمرے میں ایک بہت بڑا دولت مند نوجوان ٹھہرا ہے، کسی مقامی کالج میں پڑھتا ہے اور سارا دن خواہ مخواہ ہی قہقہے لگاتا رہتا ہے۔

ان پرانے مسافروں کو اب کوئی یاد نہیں کرتا ہے۔ کسی کے دل میں بھی ان کی کمی کا کانٹا نہیں چبھتا ہے۔ ہر کوئی اپنے آپ میں ہی گم ہے۔ اپنی مسرتوں کی تلاش میں حیران اور سرگرداں۔ میں اور زہری اسی 66 نمبر کمرے میں رہتے ہیں۔ زندگی نے ہم سے سپنے اور سکھ چھین کر ہم کو ختم کر دیا ہے اور ہم دونوں اپنے خون میں لت پت تڑپ رہے ہیں۔

زہری نے اب تک اس حقیقت کو قبول نہیں کیا ہے کہ اس کا بچہ مر گیا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ اس کی ساری خوبصورتی اور جوبن کملا گیا ہے۔ اس کے گلاب کے پھولوں جیسا رنگ ماند پڑ گیا ہے۔ اس کی بڑی سیاہ خوبصورت پلکوں والی آنکھوں میں ادھورے خوابوں کی دھول اڑتی رہتی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے بھی ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے ہیں اور دونوں اکیلے بے گانے اور زخموں سے چور چور ہیں۔ وہ اپنے بچے کو یاد کرتے دن گزارتی ہے، کبھی پلاسٹک کے گڈے کو گود میں لٹائے لوریاں دیتے اور کبھی جھولے میں لٹا کے جھولے دیتے گزرتا ہے۔ اسے اس طرح کرتا دیکھ کر میں رو دیتا ہوں۔ اس کے برابر بیٹھ کر اس کے خشک اور الجھے بالوں میں انگلیاں پھیر کر پیار کرتا ہوں اور وہ اپنی اداس ویران خالی خالی آنکھیں اٹھا کر میری طرف یوں دیکھتی ہے، جیسے مجھے پہچانتی ہی نہ ہو، جیسے میں کوئی، پرایا ہوں میں اس کو اپنی طرف اس اجنبیت سے دیکھتا پا کر سوچتا ہوں کیا یہ وہی زہری ہے؟ جس کی آنکھیں خوبصورت، لمبی پلکیں اور قاتل کٹاریاں آنکھیں تھیں اور جس سے اس نے مجھے قتل کیا تھا۔ جن کے ساتھ میں نے خوابوں کا جہان اور محبت کی کائنات آباد کی تھی جس سے میں رات کے اندھیرے اور ستاروں کی روشنی میں بیٹھ کر دل کی باتیں کرتا تھا اور ہمارا پیار لفظوں کی صورت میں قطرہ قطرہ بن کر ایک دوسرے کے دل کے پیالے میں ٹپکتا تھا۔ کہاں گئے وہ دن، کہاں گئی وہ زہری؟ کس نے ہمارے دل کے پیالے توڑ دیئے۔

کبھی کبھی وہ مجھے پہچانتی ہے۔ میری گود میں سر رکھ کر اپنے بچے کو یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے، جب رو رو کر تھک جاتی ہے تب دور افق میں دیکھتے ہوئے اس پل کے خواب دیکھتی ہے جب وہ دوبارہ بچے کی ماں بنے گی، ایک دفعہ پھر پوری کائنات سمٹ کر اس کے پہلو میں سما جائے گی اور نئے سرے سے، نئی تخلیق کے لئے انگڑائی لے گی جب زندگی کے تیسرے تکون کی تکمیل ہو گی اور ہماری روحیں بدن کا بوجھ اتار کر ہلکی پھلکی ہو کر عرش کی طرف اڑیں گی، جب عرش کے ایوانوں کو روشن کیا جائے گا اور حوریں ہمارے بچے کو ستاروں سے ٹکے ہوئے جھولے میں جھلا کر لوریاں دیں گی اور میں اس کی باتیں سن کر رونے لگتا ہوں۔ میں اس کو کس طرح سمجھاؤں کہ اس کا وہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ وہ پل کبھی اس کی زندگی میں نہیں آئے گا اور وہ کبھی بھی ماں نہیں بن سکے گی۔

☆.....☆.....☆

کرائے دار

شاہد رفیق سہو

ہمارے نئے کرائے دار آئے تو دل میں ان سے ملنے کی خواہش جاگی۔ یہ گھرانہ تین افراد پر مشتمل تھا۔ ایک ماں ایک بیٹی زاہدہ جو میری ہم عمر تھی اور ایک زاہدہ کا بھائی جو دبئی میں ملازمت کرتا تھا اور تین چار ماہ بعد اس کا چکر لگتا تھا۔

زاہدہ خوبصورت تھی سونے پر سہاگہ فیشن بھی بڑے ڈھنگ سے کرتی تھی کہ اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگ جاتے تھے۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کی تھی۔ کالج میں پڑھتی تھی وہ اکثر کچھ نہ کچھ خریدنے گھر سے اکیلی نکل پڑتی تھی۔ ماں زیادہ دور تک چل نہیں سکتی ان کے گھٹنوں میں درد ہوتا تھا۔ یہ بات محلے والوں کو پسند نہ تھی کہ جواں سال لڑکی بار بار سودا سلف خریدنے وقت بے وقت گھر سے نکلے تاہم ان کے گھر میں مرد کوئی تھا نہیں اس لیے محلے والے چپ تھے۔

کچھ دن گزرے ایک شخص ان کے گھر آنے لگا۔ وہ جب آتا ہاتھوں میں شاپرز ہوتے جن میں سامان بھرا ہوتا۔ شروع میں یہ سمجھا گیا کہ یہ خاتون خانہ کا کوئی قریبی عزیز ہے جو سودا سلف دینے آتا ہے۔

ایک روز امی جان نے اس بارے میں پوچھا تو زاہدہ کی ماں بولی کہ یہ میرا سوتیلا بیٹا ہے اپنی ماں کے پاس رہتا ہے بہر حال اس کے طور طریقے ایک بھائی جیسے نہ تھا۔ یہ ہمیشہ اس وقت آتا جب زاہدہ کالج سے لوٹ کر گھر آچکی ہوتی۔ پھر دونوں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے یا باتیں کرتے۔ اب یہ ہونے لگا کہ اکثر زاہدہ بن سنور کر اس شخص کے ہمراہ جانے لگی۔ محلے کے کچھ لوگوں نے ان دونوں کو ریستوران میں بھی ساتھ کھاتے پیتے

دیکھا تو ان کا ماتھا ٹھنک گیا۔ محلے والے اب ان کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ جب آس پڑوس کی خواتین نے زاہدہ کی ماں سے باز پرس کی تو وہ خواتین کو بولی کہ یہ میری بیٹی کا منگیتر ہے۔ میں بہت جلد ان کی شادی کر رہی ہوں بس ندیم کے دبئی سے آنے کا انتظار ہے۔

محلے والے کچھ دن اور خاموش رہے لیکن کب تک۔ ان کے صبر و تحمل نے جواب دے دیا۔ اس شخص جس کا نام سہراب تھا اس کے گھر والوں کی کھوج میں لگ گئے اور اس کے باپ کے دفتر جا پہنچے اس کا نام سردار علی تھا اور وہ ایک امیر آدمی تھا جس کا گارمنٹس کا بزنس تھا۔ انہوں نے تمام حالات سے اس کو آگاہ کیا اور کہا آپ اپنے بیٹے کو روک لیں ورنہ ہم کسی دن پولیس کو اطلاع کر دیں گے۔ کیونکہ ہمارا شریفوں کا محلہ ہے۔ سردار علی نے کہا پولیس کی بات چھوڑیئے میں بھی ایک شریف آدمی ہوں میرا بیٹا شادی شدہ ہے بلکہ چار بچوں کا باپ ہے۔ میں جلد اسے روک لوں گا آپ بے فکر رہیے۔

اگلے روز سہراب کا باپ دوپہر کے بعد زاہدہ کے گھر آیا اس نے بیٹے کی گاڑی ان کے گھر کے باہر کھڑی دیکھ لی تھی۔ اس نے بیٹے کو برا بھلا کہا اور زاہدہ کی ماں کو کہا کہ دوبارہ آپ نے میرے بیٹے کو گھر آنے دیا تو نہ صرف یہ کہ آپ کے بیٹے کو دبئی فون کر دوں گا بلکہ آپ کو سخت نتیجہ بھی بھگتنا پڑے گا۔

سہراب نے باپ کے سامنے چوں نہ کی اور خاموشی سے ساتھ ہولیا۔ گھر آ کر باپ نے باز پرس کی تو اس نے صاف کہہ دیا کہ ابا جان مجھ کو زاہدہ پسند ہے اور میں اس سے دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔

باپ نے سمجھایا کہ ہوش کے ناخن لو یہ تمہارے وقتی جذبات ہیں تم چار بچوں کے باپ اور با وفا بیوی کے شوہر ہو جو میری بہن کی بیٹی ہے۔ میں ہرگز اپنی بھانجی پر یہ ظلم نہ ہونے دوں گا۔ اگر تم نے ان آوارہ خاندان سے رشتہ جوڑا تو میں نہ صرف تم کو جائیداد سے عاق کر دوں گا بلکہ اس خاندان کا بھی جینا دوبھر کر دوں گا۔

سہراب نے چند دن زاہدہ سے قطع تعلق رکھا لیکن پھر رابطہ ہو گیا کیونکہ عشق پر کسی کا زور نہیں۔ وہ دوبارہ آنے جانے لگا۔ جلد ہی سردار علی کو علم ہو گیا۔ اس نے بہو سے کہا۔

''بیٹی سمیرا سہراب ایک ایسی نوعمر لڑکی کے چکر میں پھنس رہا ہے۔ جس کا خاندان صحیح نہیں ہے۔ وہ قابل عزت لوگ نہیں ہیں تم کیا کہتی ہو میں اسے جائیداد سے عاق کرنا چاہتا ہوں۔'' سمیرا بے چاری پریشان ہو گئی اور کہنے لگی۔

'' ماموں جان جیسا آپ مناسب سمجھیں وہی کریں میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' سردار علی نے اس کے بعد زاہدہ کی ماں سے رابطہ کیا اور کہا کہ میرا بیٹا سہراب پہلے سے شادی شدہ اور چار بچوں کا باپ ہے۔ میری بہو سگی بھانجی ہے میں یہ شادی ہرگز نہ ہونے دوں گا اگر تم چاہو تو میں اپنے چھوٹے بیٹے کا رشتہ تمہاری لڑکی سے کرنے کو تیار ہوں۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ان کو امیر داماد درکار تھا۔ فوراً حامی بھر لی۔ ادھر سہراب دوسری شادی کی خوشی میں ان کو خوب شاپنگ کرا رہا تھا ادھر یہ دونوں ماں بیٹی سردار علی سے مل گئیں۔ جس نے بری کے نام پر کافی رقم ان کو دی اور ایک بیش قیمت سونے کا سیٹ بھی دیا کہ لڑکی کو نکاح کے دن پہنا دینا۔

ایک دن سردار علی نے زاہدہ کی ماں سے کہا کہ آج میرے بیٹے شہاب کی سالگرہ ہے آپ دونوں کو اس تقریب میں مدعو کر رہا ہوں وہاں شہاب سے زاہدہ کی منگنی اور نکاح کا اعلان کر دوں گا۔ سردار علی نے ایک دوست کی کوٹھی پر تقریب کا اہتمام کیا۔ جہاں شہاب کے ساتھ سہراب کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

باپ کے ہمراہ دونوں لڑکے پہنچے تو کچھ مہمان

موجود تھے اور سالگرہ کی تقریب کے لیے کیک وغیرہ بھی میز پر رکھا جا چکا تھا۔ بس خصوصی مہمانوں کے آنے کا انتظار تھا۔ شہاب نے محفل میں کہا کہ۔

''میں نے اپنے لیے ایک لڑکی پسند کی ہے آج ان کو مدعو کیا۔ والد صاحب کی اجازت سے منگنی کی رسم بھی ادا ہو گی۔''

اتنے میں زاہدہ اور اس کی ماں اندر آ گئیں۔ جن کو لینے سہراب کے باپ نے اپنی گاڑی اور ڈرائیور بھیجا تھا۔ ان کو اپنے سامنے پا کر سہاب کا سر چکرا گیا کہ یہ دونوں اس تقریب میں کیسے آ گئیں۔

سردار علی نے بیٹے کی پریشانی بھانپ لی اور بولا کہ ان کو میں نے مدعو کیا ہے کیونکہ شہاب نے زاہدہ کو پسند کیا ہے اور اس کے ساتھ شادی کا خواہشمند ہے۔ زاہدہ نے بھی شہاب کو پسند کیا ہے۔

یہ سن کر سہراب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ابا جان کیونکہ یہ خواتین صحیح نہیں ہیں۔ آپ میرے چھوٹے بھائی کی زندگی کو تباہ نہیں کر سکتے یہ کہتے ہوئے وہ چراغ پا ہو کر محفل سے نکل گیا۔ اس کے بعد سہراب نے گھر آ کر ہنگامہ کیا کہ شہاب کی شادی ہرگز اس آوارہ خاندان میں نہ ہونے دوں گا اور جہاں چاہیں اس کی شادی کر دیں۔

باپ نے بالآخر بات مان لی سردار علی کب زاہدہ کو بہو کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ تو سہراب کو اس راستے سے واپس لانا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

ہم لوگوں کو بھی معاملے کا علم ہو گیا تو ابا جان نے اپنا مکان ان کرایے داروں سے خالی کروا لیا۔ خدا جانے پھر یہ فیملی کہاں چلی گئی لیکن اس کے بعد میرے ابو نے کسی کو مکان کرایے پر دینے سے معذرت کر لی اور بعد ازاں اسے فروخت کر دیا۔

☆☆☆☆

حضرت انسان

انسان تمام مخلوقات میں افضل ہونے کی بناء پر کچھ زیادہ ہی غرور و تکبر کے مرض میں مبتلا نظر آتا ہے۔ زمین و آسمان پر حکمرانی کرنے کا تاج سر پر کیا سجا کہ اپنے آپے سے ہی باہر ہو گیا ہے اور اپنے حقیقی حکمران کی وحدانیت، اس کے جلوے، اس کی رحم دلی، اس کی انصاف پسندی، غرض کہ اس کی تمام صفات سے منہ موڑ کر بیٹھ گیا ہے۔

اگر ہم انسان کی حقیقت کا جائزہ لیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ انسان کا اصل نام ''مرحوم'' ہے۔ لباس ''کفن'' ہے اور گھر ''قبر'' ہے۔

چاہے جتنا بھی دنیا میں نام کما لیں، مرنے کے بعد ''مرحوم'' ہی کہلائیں گے۔

چاہے جیسا بھی شاہانہ لباس زیب تن کر لیں، آخر ایک نہ ایک دن ''کفن'' ضرور پہننا پڑے گا۔

چاہے بڑے بڑے سے عالیشان محل تعمیر کر لیں۔ چاہے جتنی ہی جائیداد بنا لیں، سب وارثوں کی میراث ہے۔ انسان کی آخری آرام گاہ ''قبر'' ہے۔

موت کو کس سے رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

(نبیلہ سہیل، لاہور)

صفی بھائی

سباس گل

نیکی اور بدی کا کھیل تو ازل سے جاری ہے
لیکن ہمیں اپنے سے جڑے رشتوں پر
اعتبار کرنا چاہیے اور کبھی بھی شیطان کے
بہکاوے میں آ کر انہیں ٹوٹنے نہیں دینا چاہیے

رشتوں کی ڈور سے باندھی ایک پر خلوص نوجوان کی کہانی

اپنوں سے کچھ ملا نہیں غیروں سے کوئی گلہ نہیں
میں غم کی وہ کتاب ہوں جسے کسی نے پڑھا نہیں

''سنو..... سنو..... سنو.....! آج کی تازہ خبر۔''

عدنان ناشتے کی میز پر آتے ہوئے باآواز بلند بولا تو عمران، سفیان عرف صفی بھائی، اماں حلیمہ بیگم، ابا احسان مرزا سبھی عدنان کی جانب متوجہ ہوئے تھے۔ باورچی خانے سے اٹھارہ سالہ روشنی پراٹھوں بھری پلیٹ لاتی ہوئی بولی۔

''تازہ خبر سے پہلے گرما گرم تازہ پراٹھے حاضر ہیں۔ صفی بھائی آپ کا من پسند آلو بھرا پراٹھا یہ رہا۔''

روشنی نے صفی بھائی کی پلیٹ میں ان کا پراٹھا رکھ دیا۔

''جیتی رہو، میری پسند کا اتنا خیال رکھتی ہو۔'' صفی بھائی نے مسکراتے ہوئے تشکر بھرے لہجے میں کہا۔

''خیال کیوں نہیں رکھے گی؟ تمہاری لاڈلی جو ہے۔''

اماں بولیں تو وہ روشنی کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے دھیرے سے ہنس کر بولے۔

''ہاں یہ تو ہے۔''

''ہاں بھئی، تمہاری تازہ خبر کیا ہے جلدی سے سناؤ اور ناشتہ شروع کرو ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' احسان مرزا نے عدنان کی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

''تازہ اور حیرت انگیز خبر یہ ہے کہ روشنی نے آج نماز فجر ادا کی ہے وہ بھی بنا کسی کے اٹھائے، جگائے، سمجھائے..... ہے ناں بریکنگ نیوز؟''

عدنان نے خبر سنا کر مسکراتے ہوئے سب کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا تو سب مسکرانے لگے مگر صفی بھائی بولے۔

''نہیں یہ بریکنگ نیوز تو ہرگز نہیں ہے یہ تو گڈ اینڈ ہیپی نیوز ہے۔''

''دیکھا اس گھر میں صرف صفی بھائی ہیں جو میرے کام و عمل کو، میری بات اور ذات کو پوزیٹو لیتے ہیں، پوزیٹو سمجھتے ہیں۔ ورنہ آپ دونوں بھائی تو میرے سلام میں بھی طعنہ و دشنام کے دس پہلو نکال لائیں۔''

''خیر اب اتنا نیگیٹو تو مت لو ہمیں۔'' عدنان بے کل ہو کر بولا تو عمران نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''بالکل..... صفی بھائی تو سیدھے سادھو سے انسان ہیں۔''

''سیدھے سادے ہوتا ہے اتنا بھی نہیں پتا۔''

روشنی نے عمران کی بات سن کر درستگی کرتے ہوئے کہا۔ صفی بھائی خاموشی سے اس کے ہاتھ کا بنا آلو بھرا پراٹھا کھا رہے تھے۔ اماں، ابا بھی ان کی نوک جھونک سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ناشتے کے دوران میں نے ''سادھو'' ہی کہا ہے۔ سیدھے ''سادھو'' نہ ہوتے تو ہمیشہ تمہاری طرف داری اور فیور نہ کرتے۔''

عمران نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا تو وہ صفی بھائی کو دیکھتے ہوئے روہانسی ہو کر بولی۔

''صفی بھائی! سنا آپ نے یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ یعنی آپ اگر ''سیدھے سادھو'' نہ ہوتے تو آپ بھی میری فیور میں کبھی نہ بولتے اور میں اکیلی ان سب کے طنز و تمسخر کے نشتر سہتی رہتی۔''

''ارے نہیں روشنی! تم تو ناحق دکھی ہوتی ہو۔ یہ سب تو تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔''

صفی بھائی نے اس کی شربتی آنکھوں میں اشکوں کی سے لبالب دیکھی تو بے کل ہو کر پیار سے سمجھانے لگے۔

''لیکن آپ سے کم۔'' وہ فوراً بولی۔

''وہ اس لیے تم اس گھر کی سب سے چھوٹی بیٹی ہو اور میں بڑا بیٹا ہوں لہٰذا بڑے کا چھوٹے سے پیار تو الگ ہی ہوتا ہے ناں.....''

''جی.....'' اس نے سر ہلایا۔

''تمہاری آخرت بھلی ہو اسی لیے تمہیں سمجھاتے رہتے ہیں۔'' عدنان نے شرارت بھرے لہجے میں کہا تو عمران بھی اسے تنگ کرنے کی غرض سے بولا۔

''اب کسی کو کیا پتا کہ ہماری روشنی نماز روزے سے

باغی ہے پتا چل گیا تو تمہاری مسلمانی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''ارے خوامخواہ، لوگ کون ہوتے ہیں میری مسلمانی پہ سوال اٹھانے والے؟'' روشنی تیزی سے بولی۔

''میرے اور اللہ کے بیچ آنے والے ہونہہ..... یہاں لوگوں کو تو اپنی دنیا اور دوسروں کی آخرت کی فکر کھائے جاتی ہے۔ خود اگر دو وقت مصلے پہ جا کھڑے ہوتے ہیں تو دوسروں کو پانچ وقت کی نماز ادا کرنے کی تلقین و نصیحت کرنے لگتے ہیں، کبھی کبھار جو مسجد کا منہ دیکھ لیتے ہیں خود کو نیک، پارسا، مولوی سمجھنے لگتے ہیں اور دماغ میں یہ خیال لیے پھرتے ہیں کے دوسرے لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کرلیں خود کو پیر ولی بھی سمجھنا شروع کر دیتے ہیں..... امام کے پیچھے نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں اور دماغ میں دنیاوی کام دھندوں اور حساب کتاب، نفع، نقصان کی سی ڈی، چل رہی ہوتی ہے، آئے بڑے میری مسلمانی پر سوال اٹھانے اور میری آخرت بھلی کرنے والے۔''

روشنی کی اتنی لمبی تقریر ختم ہوئی تو اس نے دیکھا کہ سب اسے بہت غور سے دیکھ رہے ہیں یعنی سن بھی غور سے ہی رہے تھے۔ اس کے دیکھنے پر سب مسکرانے لگے۔ صفی بھائی نے تالی بجائی تو سب نے تالیاں بجا کر اس کی ستائش کی۔

''بھئی اتنی لمبی تقریر پر، بلکہ واعظ پر تالیاں تو بنتی ہیں ناں۔'' عمران بولا۔

''تالیاں بنتی نہیں ہیں ''تالیاں'' بجتی ہیں آپ کو اتنا بھی نہیں پتا؟''

روشنی نے پھر اس کی غلطی پکڑ کر اصلاح کرتے ہوئے کہا تو سب کو ہنسی آ گئی۔

☆☆☆

احسان مرزا زمیندار تھے۔ مگر تعلیم یافتہ زمیندار اور وکیل تھے۔ شہر میں رہائش پذیر ہونے کی بڑی وجہ اپنی وکالت اور بچوں کی تعلیم تھی۔ ان کی بیوی حلیمہ بیگم آٹھویں پاس تھیں۔ کتابیں پڑھتی رہتی تھیں اس وجہ سے کافی معلومات رہتی تھی۔ اخبار پڑھنا ان کا معمول تھا۔ کبھی کبھار لکھ بھی لیتی تھیں۔ اپنے بچوں کو خود ہی پڑھایا کرتی تھیں۔ سکول مڈل کلاس..... سفیان مرزا ان کے سب سے بڑے بیٹے تھے جو اس وقت پینتیس برس کے تھے اور مقامی کالج میں انگلش کے پروفیسر تھے۔ بہت خوش شکل اونچے لمبے شہزادوں کی سی آن بان والے، کم گو، نرم طبع اور قابل انسان تھے۔ ان سے سات سال چھوٹے عمران مرزا اور عدنان مرزا تھے جو جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ احسان مرزا اور حلیمہ بیگم نے تو سفیان مرزا کی پیدائش کے اتنے سال گزرنے کے بعد مزید اولاد کی آس ہی چھوڑ دی تھی۔ جب اچانک سات سال کے بعد انہیں یہ خوشخبری دوبارہ ملی تھی اور جڑواں بیٹوں کی پیدائش پر گاؤں میں خوب جشن منایا گیا تھا۔ پورے گاؤں کو کھانا کھلایا گیا تھا۔

سفیان مرزا ان دونوں کے لاڈلے اور بڑے بیٹے تھے۔ احسان مرزا اور حلیمہ بیگم کو ان کی شادی کا بہت ارمان تھا چونکہ وہ لوگ گاؤں میں رہتے تھے اور وہاں کم عمری میں شادی کا رواج عام تھا۔ لہٰذا سفیان مرزا سولہ برس کی عمر میں چودہ سال نور بانو کے دولہا بن گئے۔ خوشیوں کے انوکھے رنگ ان کی زندگی میں بکھرنے لگے تھے مگر یہ خوشیاں بس سال بھر کی مہمان تھیں۔ ان کی زندگی میں نور بانو شادی کے پہلے سال ہی پہلے بچے کی پیدائش پر بچے سمیت چل بسی۔ سفیان مرزا کی تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔ کم عمری کی شادی کا روگ اور دو انسانی جانوں کا ضیاع اور نقصان کیا ہوتا ہے یہ کوئی سفیان مرزا سے پوچھتا وہ تو اس سانحے کے بعد چپ سے ہو گئے تھے۔ بس اپنی تعلیم پر توجہ دینے لگے تھے اور حلیمہ بیگم کو اللہ نے بیٹی سے نوازا تھا۔ جس کا نام سفیان مرزا نے ''روشنی'' رکھا تھا وہ ''روشنی'' سے بہت پیار کرتے تھے اور اکثر کہا کرتے

تھے۔

''میری زندگی کے اندھیروں میں واحد روشنی یہ بچی ہے جو مجھے جینے کی امنگ دیتی ہے۔''

عدنان اور عمران بھی روشنی سے بہت پیار کرتے تھے اسے ستاتے بھی خوب تھے۔ جب بھی وہ دونوں اسے پریشان کرتے وہ روٹھ کر سفیان مرزا عرف صفی بھائی کے پاس جاتی ان دونوں کی شکایت لگایا کرتی، انہیں ڈانٹ پڑوا کر خوش ہوتی گو کہ وہ ڈانٹ جھوٹ موٹ کی ہوتی جو ''صفی بھائی'' اس کا دل رکھنے کے لیے انہیں ڈانٹا کرتے تھے۔

وقت گزرتا رہا بچے بڑے ہو گئے۔ عمران مرزا نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر لی اور عدنان مرزا نے شوگر مل سنبھال لی۔ زراعت میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ احسان مرزا کی شوگر مل چلا رہا تھا۔ احسان مرزا نے اب وکالت کو خیر باد کہہ دیا تھا اور شوگر مل کو ہی ٹائم دے رہے تھے۔ وہ کنال کے بنگلے میں یہ خوشحال اور خوشگوار فیملی رہ رہی تھی۔ کام کاج کو دو چار ملازم بھی موجود تھے۔

عدنان مرزا اور عمران مرزا کی شادیاں بھی ان کی مرضی اور پسند کے مطابق طے کر دی گئی تھیں۔

سفیان مرزا نے تو جیسے دوبارہ شادی نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اپنے بارے میں وہ سوچتے ہی نہ تھے۔ گھر میں روشنی ان کی آنکھوں کی روشنی بنی رہتی تھی اور کالج میں وہ علم کی روشنی پھیلانے میں مگن رہتے۔ کتابوں کے علاوہ کوئی شوق تھا نہ دل بہلانے کے حیلے بہانے کرتے تھے۔ بس ایک لگی بندھی سی روٹین تھی۔ جس میں کوئی ہلچل یا شوخی نہیں تھی۔ احسان مرزا اور حلیمہ بیگم کو ان کی زندگی کا یہ خالی پن بہت محسوس ہوتا تھا اور بہت تکلیف بھی دیتا تھا وہ اپنے بڑے بیٹے کو خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا گھر بسا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔

مگر سفیان مرزا عرف ''صفی بھائی'' کا دل شاید اب تک نور بانو کی محبت اور جدائی میں ہی ڈوبا ہوا تھا۔ یا شاید وہ یہ سمجھتے تھے کے شادی زندگی میں صرف ایک بار ہی ہوتی ہے جو ان کی ہو گئی تھی۔

وہ اپنی زندگی میں مگن تھے، مطمئن تھے۔ ان کے لیے یہی بہت تھا۔ ان کے دل کی دنیا تو روشنی کے دم سے آباد رہتی تھی۔ وہ اپنی ہی بات ان سے شیئر کرتی، کوئی کام ہوتا تو فوراً ''صفی بھائی'' یاد آ جاتے۔ کبھی کہتی۔

''صفی بھائی! مجھے کاپی، پین اور پین والی نیلی سیاہی کی شیشی لا دیں۔''

''صفی بھائی! مجھے آئس کریم کھانی ہے۔''

''صفی بھائی! باہر گلی میں گول گپے والا گزر رہا ہے پلیز جلدی سے میرے لیے گول گپے لا دیں ناں!.....''

'' گلا خراب ہو جائے گا تمہارا کٹھا پانی پینے سے.....'' صفی بھائی کہتے تو وہ فوراً لاڈ سے کہتی۔

''نہیں خراب ہو گا میرا گلا، آپ اپنے ہاتھ سے گول گپے کھلائیے گا مجھے۔''

اور وہ اس کی اس معصوم فرمائش پر اسے اپنے ہاتھوں سے گول گپے میں کٹھا پانی بھر بھر کے اسے کھلاتے وہ کٹھاس کی وجہ سے عجیب و غریب سی شکلیں بناتی اور وہ اسے دیکھ دیکھ کر ہنستے جاتے۔

کبھی کہتی.....

''صفی بھائی! مجھے چوڑیاں پہننے جانا ہے۔''

''چوڑیاں میں خرید لاؤں گا تمہارے لیے گھر میں پہن لینا باہر بازار میں دکاندار کے ہاتھوں سے چوڑیاں پہننا انتہائی نامعقول اور غیر اسلامی حرکت ہے۔ نامحرم مردوں کے ہاتھوں چوڑیاں پہننا ایک مسلمان لڑکی یا عورت کو زیب نہیں دیتا۔'' صفی بھائی اسے سمجھانے لگتے اور وہ سمجھ بھی جاتی۔

'' بالکل درست کہا آپ نے کتنی غلط بات ہے ناں..... چاند رات کو لڑکیاں اور عورتیں چوڑیوں کے اسٹالز اور دکانوں پہ جا کر غیر آدمیوں کے ہاتھوں میں

اپنے ہاتھ دے کر چوڑیاں چڑھواتی ہیں۔ اف! کتنا گناہ ہوتا ہوگا ناں انہیں..... تھینک یو صفی بھائی کے میری لائف میں آپ ہیں ورنہ مجھے اس غلط کام سے کون روکتا، کون سمجھتا؟''

وہ معصومیت اور سادگی سے کہتی انہیں بہت پیاری لگتی۔

''صفی بھائی! عدنان بھائی اور عمران بھائی اپنی شادی کے بعد بدل جائیں گے ناں؟ وہ اپنی پسند کی شادی کر رہے ہیں پھر تو وہ مجھے پوچھیں گے ہی نہیں۔''

آج کل روشنی کو یہ نئی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ بالآخر ''صفی بھائی'' سے بھی کہے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ اس کی بات سن کر ہنس کر بولے۔

''ان دونوں کی شادی سے تمہارا ان کا رشتہ تھوڑی ختم ہو جائے گا تمہاری الگ جگہ ہے جو کوئی بھی نہیں لے سکتا۔''

''ہاں لیکن پھر بھی پہلے والی بات نہیں رہے گی۔ اب ان کے پاس ان کی بیویاں ہوں گی میرا درجہ نیچے چلا جائے گا۔'' روشنی اداسی سے بولی تو وہ اس کے سر پر دست شفقت رکھ کر بولے۔

''کوئی بات نہیں! میں ہوں ناں تمہارے پاس، تمہارے ساتھ میں تو شادی نہیں کر رہا۔ میری زندگی میں تو صرف تم ہو۔''

''لیکن آپ کو بھی تو شادی کر لینی چاہیے صفی بھائی! آپ بڑے ہیں آپ کی شادی تو سب سے پہلے ہونی چاہیے تھی۔'' روشنی نے انہیں محبت سے دیکھتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

''تمہیں کیسے بتاؤں کہ میری شادی تو سب سے پہلے ہی ہوئی تھی۔ بس چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیری رات۔'' صفی بھائی نے دل میں کہا۔

''ہاں مگر مجھے شادی نہیں کرنی۔'' وہ مسکرا کر بولے۔

''کیوں نہیں کرنی شادی؟ میں نے آپ کے لیے اپنے کالج میں ایک میم کو پسند کیا ہے میری اردو کی لیکچرار ہیں۔ مس مہر النساء بہت نیک ہیں اور پیاری بھی اور بہت نرم لہجے میں بات کرتی ہیں وہ ان کی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے ہمیشہ آپ یاد آجاتے ہیں۔ آپ دونوں ایک ساتھ بہت اچھے لگیں گے صفی بھائی! پلیز آپ بھی شادی کے لیے راضی ہو جائیے ناں.....'' روشنی نے سنجیدگی سے کہا تو وہ ہنس کر بولے۔

''میری شادی بھی ہوگئی تو تم اکیلی ہو جاؤ گی۔''

''اور جب میری شادی ہو جائے گی تب آپ بھی تو اکیلے ہو جائیں گے..... آخر کو ایک دن میری شادی بھی ہوگی ناں.....؟ پھر آپ کیا کریں گے؟''

روشنی نے تیزی سے بولتے ہوئے انہیں حقیقت کا آئینہ دکھاتے ہوئے سوال کیا تو وہ لمحے بھر کو اسے دیکھ کر رہ گئے۔

''واقعی کل کو روشنی بھی تو بیاہی جائے گی تب وہ کیا کریں گے کس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کریں گے کس کے ناز نخرے اٹھائیں گے؟''

''میں..... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں ہے۔ میں شاید صرف تمہاری خوشیوں کی، تمہاری صحت مند زندگی کی دعائیں کیا کروں گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''دعائیں تو آپ اب بھی کرتے ہیں میرے لیے..... بس شادی کر لیں آپ میرے لیے۔''

''کوئی اور بات کرو چندا.....!''

''نہیں صفی بھائی! آپ ایک بار مس مہر النساء سے مل تو لیں مجھے یقین ہے وہ آپ کو پسند آئیں گی میں نے انہیں بھائیوں کی شادی پر انوائٹ کر لیا ہے وہ میری فیورٹ ٹیچر ہیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے وہ شادی میں ضرور آئیں گی۔''

روشنی نے انہیں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو وہ اس کی سوچ اور پلاننگ پر حیران رہ گئے۔

''تو تم نے انہیں اس خیال سے شادی میں انوائٹ

کیا ہے؟''

''جی ہاں.....'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''دیکھا کتنی فکر ہے اسے تمہاری یہ سب سے چھوٹی ہے گھر میں لیکن اسے بھی تمہاری تنہائی پریشان کرتی ہے۔ جبھی تو اس نے تمہارے لیے لڑکی پسند کرلی ہے۔''

اسی وقت حلیمہ بیگم ادھر آنکلیں تو ان کی باتیں سن کر صفی بھائی سے کہنے لگیں۔

اماں! یہ تو بچی ہے اسے کیا معلوم کیا صحیح ہے کیا غلط ہے؟ آپ تو سمجھتی ہیں ناں..... مجھے نہیں کرنی شادی۔'' صفی بھائی نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بولیں۔

''صفی بیٹے! ایسے کب تک رہو گے؟ تم ہمارے بڑے بیٹے ہو ہم تمہیں ہنستا، مسکراتا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں ساری عمر یادوں اور باتوں کے سہارے نہیں گزارا کرتی۔ آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ ہم سب کی خوشی کے لیے بیٹا! تم مہر النساء سے مل لینا میں ملی ہوں اس سے وہ بہت سلجھی ہوئی اور مہذب لڑکی ہے تمہارے ساتھ ایسی ہی لڑکی کا شریک زندگی ہونا ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے میں مل لوں گا ان سے.....'' صفی بھائی نے سر جھکا کر کہا تو وہ دونوں خوش ہوگئیں۔

''یاہو..... تھینک یو صفی بھائی.....؟''

روشنی دوڑ کر مارے خوشی کے ان سے لپٹ گئی۔ انہوں نے ہنستے ہوئے اس کے سر کو تھپکا تھا۔ باہر صحن کی صفائی کرتی بوا نے یہ منظر دیکھا تو بڑبڑانے لگی۔

''توبہ توبہ بے شرمی کی حد ہے بھئی، جوان جہان لڑکی ایک غیر مرد سے لپٹ رہی ہے اور ماں دیکھ دیکھ کے خوش ہو رہی ہے۔ قیامت کے آثار ہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو بوا.....؟''

قریب سے گزرتے عمران کے کانوں میں بوا کی آواز پڑی تو وہ دھچکا کھا کر رہ گیا اور پلٹ کر پوچھا تو ساٹھ سالہ بوا سٹپٹا گئی۔

''کک..... کچھ..... نہیں بیٹا! مجھے تو اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت ہے..... ایسے ہی بک بک کرتی رہتی ہوں۔''

بوا اس گھر کی پرانی ملازمہ تھیں۔ ان کا یوں بات کر کے بات گھما دینا عمران کو ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

''آپ نے صفی بھائی کے بارے میں کچھ کہا تھا۔ جانتی بھی ہیں وہ کون ہیں؟ بڑے بھائی ہیں ہمارے باپ کا درجہ دیتے ہیں ہم ان کو..... اور آپ کو وہ غیر لگتے ہیں۔'' عمران غصے سے بولا تو سہم کر کہنے لگی۔

''معاف کرنا بیٹا! میں نے تو سنا تھا کہ صفی میاں اس گھر کے بیٹے نہیں ہیں یا شاید روشنی آپ کی سگی بہن نہیں ہے۔''

''آپ نے ایک سنی سنائی فضول بات پر اتنی بڑی کہانی گھڑ لی اگر ایسا کچھ ہوتا تو اماں، ابا اور صفی بھائی محتاط رہتے..... تم لوگوں کی تو سوچ میں ہی فتور ہے جو ایسا کہتے ہیں۔''

عمران غصے سے بولتا اندر کمرے میں چلا گیا۔ جہاں وہ تینوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

''کیا ہوا عمران بھائی! آپ کے منہ پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟'' روشنی نے اس کی شکل دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''لوگوں کی باتیں سن کر آرہا ہوں۔'' وہ تپے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیسی باتیں.....؟'' حلیمہ بیگم نے پوچھا۔

''یہی کہ تمہارے صفی بھائی شادی کیوں نہیں کرتے؟ بڑے ہیں خوش شکل، خوش مزاج، خوشحال ہیں پھر کیا کمی ہے جو شادی کو دل نہیں کرتا ان کا یا آپ لوگ ہی ان کی شادی نہیں کرنا چاہتے۔ چھوٹے بھائیوں کے سر پر سہرا سج رہا ہے اور بڑے بھائی کے نکاح کے چھواروں کا کچھ پتا ہی نہیں ہے۔''

عمران بوا پر غصے تھا اور نجانے کیسے اس نے اپنی طرف سے یہ ساری باتیں لوگوں کا نام لے کر صفی بھائی کو سنا ڈالیں۔

''تم لوگوں کی پروا مت کیا کرو انہیں تو زبان کے چسکے کو روز نئی کہانی چاہیے۔ تم دونوں کی شادی ہو جائے تو پھر دیکھنا لوگوں کے نئے تجسس اور ٹوہ بھرے سوال۔ بیوی کیسی ہے؟ جہیز میں کیا کیا لائی ہے؟ پاؤں بھاری کیوں نہیں ہوا اب تک؟ کوئی ان بن تو نہیں ہو گئی میاں بیوی میں؟ ایسے ہزار سوال لوگوں کی زبان سے نکلیں گے تم کیا یونہی اپنا خون جلاتے رہو گے؟''

صفی بھائی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے سمجھایا۔

وہ سمجھ تو گیا تھا مگر بوا والی بات اس سے ہضم نہ ہو پائی تو عدنان سے کہہ کر دل ہلکا کر لیا۔

''روشنی ہماری اکلوتی بہن ہے اور ہم سے بہت چھوٹی ہے عمر میں۔ اس لیے سب کی لاڈلی ہے۔ ہمارے لیے تو بیٹی جیسی ہے ناں وہ.....؟ عدنان نے عمران کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بالکل اور صفی بھائی تو جان چھڑکتے ہیں روشنی پر۔'' عمران بولا۔

''جان تو وہ ہم پر بھی چھڑکتے ہیں مگر وہ شادی کیوں نہیں کرتے؟ کہیں انہیں کسی سے پیار تو نہیں ہو گیا اور وہ ناکام ہو گئے ہوں اپنے پیار کو پانے میں؟'' عدنان نے قیاس لگایا۔

''نہیں یار، اپنے صفی بھائی انتہائی شریف انسان ہیں وہ ان چکروں میں نہیں پڑ سکتے۔'' عمران نے اس کا قیاس مسترد کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں شریف انسان کا دل نہیں ہوتا کیا؟ اور آج کل جو جتنا شریف ہوتا ہے ناں وہ اندر سے اتنا ہی کمینہ اور ذلیل نکلتا ہے۔ کبھی اخبار پڑھو تو پتا چلے کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔'' عدنان نے تیزی سے کہا تو وہ چڑ کر بولا۔

''اچھا بھائی! ہو رہا ہو گا بہت کچھ بس تم صفی بھائی کو بخشو میرے لیے وہ آئیڈیل ہیں اور بہت شریف النفس، نیک انسان ہیں صفی بھائی۔''

''سیم ہیئر.....'' عدنان بولا۔

''میں اماں سے کہوں گا کہ بوا کو ان کے گاؤں بھیج دیں بہت بکواس کرنے لگی ہیں گاؤں جا کر آرام کریں۔'' عمران نے پرسوچ انداز میں کہا تو عدنان بولا۔

''بکواس تو وہ گاؤں جا کر بھی بہت کریں گی بہتر یہی کہ ان کا فتور ادھر ہی نکل جائے وہ اس گھر کی سب سے پرانی خادمہ ہیں۔ اللہ جانے کیا سوچ کر انہوں نے اتنی بڑی بات کہہ دی۔''

''بڑی بات نہیں، بری اور گری ہوئی بات کہی۔ میرا تو خون کھول گیا تھا اور میں صفی بھائی سے بھی نجانے کیا کچھ بول آیا۔''

عمران نے بے بسی اور غصے سے بھرے لہجے میں کہا۔

''ابے بھائی! کیا بول دیا صفی بھائی کو؟''

عدنان کو صفی بھائی کا دل دکھنے کا خیال بے کل کر گیا۔ فوراً پوچھا۔

''ایسا کچھ نہیں بولا۔ جس سے وہ ہرٹ ہوں بس شادی کرنے کا بولا سب کی طرح۔''

''شکر ہے میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ کہیں تم نے بوا کی بکواس سن کر صفی بھائی کو بتا دی ہو۔'' عدنان نے کلمہ شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔ تو وہ بولا۔

''لیکن ہر بات کی تہہ میں کوئی بات ہوتی ضرور ہے۔ رائی ہوتی ہے جبھی پہاڑ بنتا ہے ناں.....؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''بھئی اب دیکھو ناں، صفی بھائی عمر میں ہم سے سات آٹھ برس بڑے ہیں اور روشنی ہم سے دس برس چھوٹی ہے تو اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟'' عمران نے سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے کہا تو عدنان بولا۔

''یہی کہ ہمارے ابا اماں نے بہت لمبی فیملی پلاننگ کی تھی۔''

''ارے بدھو، یہ بھی تو ہوسکتا ہے ناں کہ ہم دونوں ہی اماں ابا کی سگی اولاد ہوں اور روشنی اور صفی بھائی ان کے کسی بھائی بہن کے بچے جو اپنے والدین کے انتقال کے بعد ہمارے ہاں رہنے لگے۔ ہمارے والدین نے انہیں اپنی اولاد کی طرح پالا ہو ایسا بھی تو ہوسکتا ہے ناں.....؟'' عمران سنجیدگی سے بولا۔

''ہونے کو تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم لائٹ آف کردو تاکہ میں سوسکوں صبح مجھے بہت سے کام کرنے ہیں بھائی۔''

عدنان نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا تو وہ بدمزہ ہو گیا۔

''اچھا بھئی، سو جاؤ تم نے صبح اٹھ کر دنیا فتح کرنی ہے۔ شب بخیر۔'' عمران طنز کا نشتر چلا تا لائٹ بند کر کے اس کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

گھر میں عمران اور عدنان کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ صفی بھائی نے تمام کاموں کی ذمے داری سنبھال رکھی تھی۔ بڑا بھائی اور بڑا بیٹا ہونے کا پورا فرض ادا کر رہے تھے۔ حلیمہ بیگم نے بیٹوں کی شادی پر سارے ارمان نکالنے کا اہتمام کیا تھا۔ مایوں، مہندی کی رسمیں بھی بہت دھوم دھام سے منائی جا رہی تھیں۔ آج عدنان اور عمران کی ''رسم حنا'' تھی۔ گاؤں سے بھی عزیز رشتے دار شرکت کے لیے آئے تھے اور شہری مہمان بھی موجود تھے۔

عدنان، عمران کے ساتھ ساتھ صفی بھائی نے بھی سفید کرتے شلوار کے ساتھ گلے میں سرخ اور پیلا کف ذدہ ململ کا دوپٹہ ڈال رکھا تھا۔ روشنی سبز رنگ کے چوڑی دار پاجامے پر پیلا اور ہرا گوٹے کناری والا فراک، دوپٹہ پہنے ہاتھوں پر مہندی سجائے، کلائیوں میں پیلی، ہری چوڑیاں اور موتیے کے گجرے پہنے، بالوں کی چٹیا میں موتیے کے ہار پہنے، پاؤں میں ہرے اور گولڈن رنگ کا کھسہ پہنے اپسرا دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا کم سن، معصوم، کومل حسن دیکھنے والی ہر آنکھ کو خیرہ کر رہا تھا۔ اماں اور صفی بھائی نے تو اسے دیکھتے ہی اس کی نظر اتار دی تھی۔

''صفی بھائی! سچ بتائیں کیسی لگ رہی ہوں میں؟''

روشنی نے بچوں کی طرح اپنی فراک پکڑ کر گھومتے ہوئے ان سے پوچھا تو وہ ہنس کر بولے۔

''دنیا کی سب سے حسین اور معصوم لڑکی لگ رہی ہے میری روشنی! اللہ نظر بد سے بچائے۔''

''آپ بھی بہت ہینڈسم لگ رہے ہیں۔ آپ کو بھی کسی کی نظر نہ لگے۔''

''آمین'' روشنی نے ان کے وجیہہ سراپے کو رشک سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ شرارت بھرے لہجے میں بولے۔

''نظر لگوانے کے لیے تم نے بلایا تو ہے اپنی اردو کی مس کو۔''

''ہاہاہا.....'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''میرے صفی کو کسی کی نظر نہیں لگ سکتی کیونکہ میں ہر روز صبح کو آیت الکرسی پڑھ کر ان پر دم کرتی ہوں۔''

''کیا واقعی؟'' صفی بھائی خوش ہو کر تحیر آمیز لہجے میں بولے۔

''روشنی! بہنا! آج کے دن تو صفی بھائی کی جان چھوڑ دو آج کے دن تو ہم وی آئی پی ہیں ہمیں بھی لفٹ کرادو۔''

عمران اور عدنان بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر وہیں چلے آئے ان کی باتیں سن کر عمران نے روشنی سے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

''فکر نہ کریں بھائی! آپ دونوں کو لفٹ کرانے والی حسینائیں کل آپ کے ساتھ ہوں گی انشاء اللہ۔''

روشنی نے شوخ و شریر لہجے میں کہا تو وہ دونوں ہنس پڑے۔

پھر مہندی کی رسم شروع ہوئی۔ خوب ہلہ گلہ ہوا، ڈھولک کی تھاپ پر مہندی اور ملن کے گیت گائے گئے۔

تصویریں اتاری گئیں، مووی بنائی گئی۔ ہنسی خوشی یہ رسم ادا ہوئی۔ مہمان اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوئے کچھ مہمان گھر میں رکے ہوئے تھے۔ مہندی کی رسم کے لیے رکھی گئیں مہندی کی تھالیاں اٹھائے روشنی اوپر والے پورشن میں جا رہی تھی کے اچانک کسی مہمان بچے نے تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے روشنی کو ٹکر ماردی اور روشنی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ لڑکھڑاتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے آ گری۔

اس کی چیخ سن کر لان میں سے کرسیاں اٹھواتے صفی بھائی نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔

''روشنی'' صفی بھائی بھاگے، روشنی تک پہنچے۔ روشنی کے سر پر چوٹ لگی تھی جس کی وجہ سے خون بہہ کر اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔

''روشنی..... روشنی.....'' صفی بھائی پاگلوں کی طرح اسے پکار رہے تھے۔ اماں، ابا، عمران، عدنان بوا سبھی وہاں دوڑے چلے آئے اور روشنی کے چہرے پر خون دیکھ کر گھبرا گئے۔

''ڈرائیور..... گاڑی نکالو۔''

صفی بھائی نے چلا کر کہا اور روشنی کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گاڑی کی جانب بھاگے تھے۔ عدنان نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

''یہ صفی بھائی روشنی کو کہاں لے جا رہے ہیں؟''

''ظاہر ہے ہسپتال لے جا رہا ہے۔ زخمی روشنی کو اور کہاں لے جائے گا؟'' حلیمہ بیگم فکر اور برہمی سے بولیں تو وہ خجل سا ہو گیا۔

''لو ساتھ رہنے کا ایک اور بہانہ مل گیا۔'' بوا نے پھر سے زبان سے زہر اگلا تھا اب کی بار عمران کے ساتھ عدنان نے بوا کی بات سنی تھی۔

''کیا مطلب ہے بوا؟'' عدنان نے پوچھا۔

''دیکھتے جاؤ میاں! مطلب وطلب سب اپنے آپ سامنے آ جائے گا۔'' بوا بھوسے میں چنگاری پھینک کر یہ جا وہ جا۔ عمران اور عدنان ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

''یہ نہیں ہوا کسی سے کہ صفی کے ساتھ چلا جاتا وہ اکیلا گیا ہے بچی کو لے کر۔'' حلیمہ بیگم پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلتی ہوئیں عمران اور عدنان کو خفگی سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''اماں! صفی بھائی کوئی بچے تو ہیں نہیں کے روشنی کو سنبھال نہ سکیں اور ڈرائیور ہے تو سہی ان کے ساتھ۔''

عمران نے بے زاری سے کہا اس کے دماغ میں بوا کا لگایا ہوا شک کا کانٹا چبھ رہا تھا۔ جبھی اس کا دل کھٹا ہو رہا تھا صفی بھائی کی طرف سے۔

''ہسپتال لے جانے کی کیا ضرورت تھی بھلا؟ ذرا سا سر ہی تو پھٹا تھا روشنی کا گھر میں مرہم پٹی کی جا سکتی تھی یا ڈاکٹر کو بھی گھر بلایا جا سکتا تھا۔ مگر نہیں صفی بھائی تو روشنی کو اٹھا کے چل دیئے ہسپتال..... یہ نہیں سوچا کے شادی والا گھر ہے سو کام باقی ہیں یوں ہسپتال میں جانے کا وقت کس کے پاس ہے یہاں؟'' عدنان نے بھی ناگوار اور بے حس لہجے میں کہا تو احسان مرزا اور حلیمہ بیگم دونوں بیٹوں کے لب و لہجے اور الفاظ پر ششدر رہ گئے۔ یہ زبان وہ صفی بھائی کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ وہ صفی بھائی جسے وہ اپنے باپ سے بڑھ کر چاہتے تھے۔ فرشتہ صفت سمجھتے تھے۔

انہیں اپنی شادی میں رخنہ پڑنے کا ڈر تھا شاید، کتنے خود غرض لگ رہے تھے وہ دونوں اس وقت جو صرف اپنی شادی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ روشنی جسے اپنی بیٹی جیسا کہا کرتے تھے اسے دل و جان سے چاہتے تھے اس کی تکلیف کی، اس کی حالت کی انہیں رتی برابر بھی پروا نہیں تھی۔

''ہم نے تو سنا تھا کہ بیٹے شادی کے بعد بدل جاتے ہیں، بیوی کے غلام ہو جاتے ہیں اور والدین اور بھائی بہنوں کو بھی بیوی کا غلام بنا کے رکھتے ہیں، نظر انداز کرتے ہیں..... مگر یہاں تو الٹا ہی ماجرا ہے بھئی، ہمارے بیٹے تو

شادی سے ایک دن پہلے ہی بھائی، بہن سے لاپروا ہو گئے..... جس بہن کو وہ اپنی بیٹی کہتے رہے آج وہ بیٹی زخمی ہے، بے ہوش ہے تو ان نام نہاد باپوں کے دل میں ہلکی سی چوٹ نہیں پڑی، ذرا سا بھی احساس نہیں جاگا اس کی تکلیف پر افسوس صد افسوس.....'' احسان مرزا نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو وہ دونوں نظریں چرا گئے۔

''صفی بھائی ہیں ناں روشنی کے ساتھ وہ کافی ہیں اس کا خیال، احساس کرنے کے لیے۔'' عمران نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''ہاں صفی کے ہوتے ہوئے روشنی کو تم دونوں کی دکھاوے کی محبت اور ہمدردی کی بھی ضرورت نہیں ہے..... توبہ..... توبہ..... تم دونوں کے اندر کا فتور سامنے آ گیا..... اپنی شادی کے فنکشن میں کچھ گڑبڑ نہ ہو۔ انہیں تو بس یہ فکر ہے بہن کی فکر نہیں ہے۔''

حلیمہ بیگم نے تاسف اور دکھ سے عدنان اور عمران کو دیکھتے ہوئے کہا تو عدنان بے کل ہو کر بولا۔

''اب ایسی بھی بات نہیں ہے اماں! ذرا سی بات کیا کہہ دی آپ دونوں ہماری محبت پہ شک کرنے لگے۔ اکلوتی بہن ہے روشنی ہماری۔ ہمیں اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہے۔''

''ہاں بالکل گھر کی رونق اسی کے دم سے ہے اماں!'' عمران نے بھی فوراً کہا ایسا نہیں تھا کہ وہ روشنی اور صفی بھائی سے پیار نہیں کرتے تھے۔ پیار تو بہت کرتے تھے بس بوا کی باتوں میں آ کر الٹا سیدھا سوچ رہے تھے۔

''بس رہنے دو تم جاؤ اپنے کمرے میں اور دولہا بننے کی تیاری کرو۔'' حلیمہ بیگم نے ان دونوں کو جھڑکا۔ وہ شرمندہ ہو گئے۔

''اجی آپ صفی کو فون کر کے معلوم تو کریں کہ ہسپتال میں لے گیا ہے کیسی ہے میری روشنی؟'' حلیمہ بیگم نے احساس مرزا کو گم صم بیٹھے دیکھ کر کہا۔

''ہاں معلوم کرتا ہوں تم پریشان مت ہو انشاء اللہ ہماری روشنی خیر سے ہی ہو گی۔'' احسان مرزا نے اپنے موبائل پر صفی بھائی کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

''انشاء اللہ.....!'' ان تینوں نے ایک ساتھ کہا۔

''ہیلو صفی بیٹا.....!'' احسان مرزا نے دوسری جانب سے صفی بھائی کی آواز سنتے ہی کہا اور پھر روشنی کی موجودہ حالت کے بارے میں معلوم کرنے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

رات کے پونے دو بجے کا وقت تھا جب صفی بھائی، روشنی کو اپنے ساتھ لگائے گھر میں داخل ہوئے۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چہرے سے اس کے درد اور تکلیف کی شدت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ مرہم پٹی کے علاوہ اسے انجکشن بھی لگایا گیا تھا۔ دوائیں بھی دی گئیں تھیں جو صفی بھائی نے گھر آتے ہوئے راستے میں میڈیکل سٹور سے خرید لی تھیں۔ حلیمہ بیگم لپک کر روشنی کے پاس پہنچیں تھیں۔

''کیسی ہے میری بیٹی؟ درد زیادہ تو نہیں ہے ناں.....؟''

''نہیں اماں! اب کم ہے درد۔ صبح تک بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی اور اپنے بھائیوں کی بارات لے کر جاؤں گی۔''

روشنی نے انہیں دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''سن رہے ہو عمران، عدنان یہ ہوتی ہے محبت۔ بہن تکلیف میں ہے لیکن اپنے بھائیوں کی خوشی کا خیال ہے اسے۔''

حلیمہ بیگم نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ شرمندہ سے ہو گئے۔

''آپ دونوں سو جائیں ناں صبح دولہا بننا ہے آپ نے۔''

روشنی نے عدنان اور عمران کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہاری وجہ سے جاگ رہے ہیں شکر ہے تم ٹھیک ہو۔'' عدنان نے اس کے قریب آ کر کہا تو وہ شرمندگی سے بولی۔

''سوری میری وجہ سے آپ سب کو پریشانی ہوئی۔''

''ارے تم کیوں سوری کر رہی ہو تمہاری غلطی تھوڑی تھی گرنے میں..... چلو تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو اور صبح جلدی اٹھنے کی ضرورت نہیں ہے آرام سے اٹھنا۔'' احسان مرزا نے اس کا سر تھپک کر پیار سے کہا۔

''میں روشنی کے کمرے میں سو جاتی ہوں آج۔'' حلیمہ بیگم بولیں تو صفی بھائی نے انہیں سہولت سے منع کر دیا۔

اماں! آپ بھی آرام کریں ورنہ صبح شادی کے فنکشن میں طبیعت بوجھل رہے گی..... میں ہوں اپنی روشنی کے پاس۔''

''ٹھیک ہے بیٹا! تم اسے اس کے کمرے میں لے جاؤ۔'' حلیمہ بیگم نے نرمی سے کہا تو وہ روشنی کے شانوں کے گرد اپنا بازو حمائل کیے اسے اس کے کمرے کی طرف لے گئے۔

''بنا شادی کیے ہی جس کی ہر خواہش اور ضرورت پوری ہو رہی ہو بھلا اسے کیا ضرورت ہے بیاہ شادی کے چکر میں پڑنے کی۔''

بوا کی زہریلی زبان نے شک اور تہمت کا ایک اور انگارہ عمران اور عدنان کے دل و دماغ میں ڈال دیا تھا اور ان کے پیار، اعتبار کی ساری کھیتی جل کر راکھ ہو گئی تھی۔

اگلے دن عمران، عدنان کی سہرا بندی اور شادی کا فنکشن تھا۔ روشنی کے سر کی پٹی صفی بھائی نے اس طرح سے سر پہ باندھی کے اس کا زخم بھی کور رہے اور کسی کو پٹی نظر بھی نہ آئے۔ روشنی نے سر پر دوپٹہ پنوں سے سیٹ کر لیا تھا۔ صفی بھائی نے خود اسے ناشتہ کرایا، دوا کھلائی اور ایک ملازمہ کو بھی اس کے آس پاس رہنے کی ہدایت کی اور خود سہرا بندی کے انتظامات دیکھنے چلے گئے۔ سبھی مصروف تھے۔ صفی بھائی کا دھیان روشنی کی طرف ہی تھا۔ انہوں نے اس کا صدقہ دیا تو سکون آیا۔

''ایکسکیوزمی، یہ روشنی کا گھر ہے ناں.....؟''

ایک نسوانی آواز نے صفی بھائی کو اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے ایک پچیس چھبیس سالہ بہت خوبصورت، سفید رنگت والی لڑکی کھڑی تھی۔ سفید اور گلابی امتزاج کا لباس پہنے ہلکے میک اپ میں بہت دلکش اور بہت سوبر دکھائی دے رہی تھی۔

''جی ہاں یہ روشنی کا گھر ہے آپ کی تعریف۔ آئی من آپ کا تعارف.....؟'' صفی بھائی نے پوچھا۔

''جی میں مہر النساء ہوں روشنی کی ٹیچر انہوں نے مجھے اپنے بھائیوں کی شادی پر انوائٹ کیا تھا۔ میں اس کی مبارکباد دینے آئی ہوں اور معذرت بھی کرنے آئی ہوں کیونکہ فنکشن میں، میں شریک نہیں ہو سکوں گی کیونکہ اچانک مجھے اپنی فیملی کے ساتھ حیدر آباد جانا پڑ رہا ہے چند روز کے لیے.....''

''کوئی بات نہیں آپ تشریف لائیں بہت شکریہ، لیجیے ہماری روشنی آ گئی۔''

مہر النساء نے انہیں اپنے آنے کی وجہ بتاتے ہوئے معذرت بھی کر لی۔ وہ مسکرا دیئے۔ سمجھ گئے تھے کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے روشنی نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔

''اسلام علیکم میم! کیسی ہیں آپ؟''

روشنی انہیں دیکھتے ہی حیرت اور خوشی سے بولی۔

''وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں۔'' وہ مسکرائی۔

''صفی بھائی! یہ میم مہر النساء ہیں اور میم یہ ہمارے پیارے صفی بھائی ہیں۔''

روشنی نے ان دونوں کا تعارف کرایا تو دونوں نے خیر سگالی کے طور پر ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' مہر النساء رسماً بولی۔

''مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ روشنی بیٹے! اپنی میم کو اماں سے ملواؤ میں کچھ کام دیکھ لوں۔'' صفی بھائی

نے روشنی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی صفی بھائی!'' وہ مسکراتے ہوئے بولی اور مہر النساء کو اپنے ساتھ اندر لے گئی۔

سہرا بندی، بارات کی روانگی، شادی سے لے کر ولیمے تک تمام تقریبات بہت عمدگی سے انجام پذیر ہوئیں۔ صفی بھائی کے اچھے انتظام کی تعریف عدنان اور عمران بھی کیے بنا نہ رہ سکے۔ شکریہ ادا کر کے ہی اپنی دلہنوں کے پاس چلے گئے۔ اس سارے ہنگامے کے دوران روشنی کو آرام کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ایک، دو بار دوا بھی نہ کھائی تھی۔ صفی بھائی کے پوچھنے پر بھی جھوٹ بول دیا تھا کہ ''دوا کھالی ہے'' وہ بھی مطمئن ہو کر شادی کے کاموں میں لگ گئے اور روشنی کی بے آرامی اور لاپروائی کا نتیجہ یہ نکلا کے اسے شدید بخار نے گھیر لیا۔ ولیمے کی رات جب سونے کے لیے اپنے کمروں میں جا چکے تو وہ بھی اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے چکرا کر لاؤنج میں بیٹھ گئی۔ صفی بھائی باہر کا گیٹ لاک کر کے آئے تو اسے یوں بے سدھ دیکھ کر فکر مندی سے اس کے پاس چلے آئے۔

''روشنی! تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ اپنے کمرے میں جا کر سونا.....''

''جی صفی بھائی.....!'' وہ نقاہت بھرے لہجے میں بولی۔

''طبیعت کیسی ہے؟'' انہوں نے اس کی پیشانی کو چھوا تو انہیں احساس ہوا کہ وہ تو تیز بخار میں جل رہی تھی۔

''مائی گاڈ.....! اتنا تیز بخار ہے اور تم نے ہمیں بتایا تک نہیں۔''

''سب کی شادی کی خوشی خراب ہو جاتی ناں اس لیے نہیں بتایا۔'' روشنی نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

''چلو اٹھو، اپنے کمرے میں چلو میں فیملی ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔'' صفی بھائی نے اسے شانوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور اسے اس کے کمرے میں لا کر بیڈ پر لٹا دیا، کمبل کھول کر اس پر پھیلا دیا۔

فیملی ڈاکٹر، ڈاکٹر حماد یزدانی گھنٹہ پہلے ولیمہ اٹینڈ کر کے گئے تھے۔ صفی بھائی کے فون کرنے پر دوبارہ چلے آئے۔ روشنی کا معائنہ کرنے کے بعد بخار اور درد کی دوا اسے کھلائی اور سونے کا مشورہ دیا۔

''انشاء اللہ! صبح تک بخار اتر جائے گا پھر بھی اگر بخار ہو تو یہ دوا کھلا دیجئے گا آرام آجائے گا۔'' ڈاکٹر حماد یزدانی نے صفی بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو حماد انکل! آپ کو اتنی لیٹ نائٹ گھر بلایا اصل میں روشنی دیکھ کر میں سچ میں گھبرا گیا تھا۔'' صفی بھائی سنجیدگی سے بولے۔

''میں سمجھ سکتا ہوں آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یقیناً گھبرا جاتا ایک سو تین بخار کوئی معمول نہیں ہوتا۔ خیر آپ روشنی بیٹی کا دھیان رکھیے گا۔ میں صبح کلینک جاتے ہوئے دوبارہ یہاں آ کر روشنی بیٹی کو چیک کر لوں گا۔ اب چلتا ہوں۔'' ڈاکٹر حماد یزدانی سنجیدگی سے بولے۔

''شکریہ انکل! اللہ حافظ!''

صفی بھائی انہیں گیٹ تک چھوڑ کر واپس روشنی کے کمرے میں آ گئے۔ روشنی سر کی چوٹ کے علاوہ بخار کے درد کی وجہ سے بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدل رہی تھی اور صفی بھائی اس کی حالت دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔

''روشنی گڑیا! میری جان! زیادہ درد ہو رہا ہے کیا؟'' صفی بھائی اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئے اور پریشانی کے عالم میں پوچھا تو روشنی انہیں اپنے لیے یوں فکر مند دیکھ کر مدھم آواز میں بولی۔

''نن..... نہیں تو..... بس سر میں..... ہلکا سا درد ہے..... نیند آجائے گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میری بہادر روشنی! جیتی رہو، انشاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' صفی بھائی نے محبت سے اس کی پیشانی چوم کر پیار سے کہا۔

''جی'' وہ دھیرے سے بولی اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ جب گہری نیند میں چلی گئی تو صفی بھائی وضو کر کے آ گئے اور جائے نماز بچھا کر پہلے عشاء کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد نماز حاجت ادا کر کے روشنی کی صحت یابی اور لمبی زندگی کی دعائیں مانگیں۔ رات کا آخری پہر تھا۔ صفی بھائی نے روشنی کی پیشانی کو چھو کر اس کی نبض کو تھام کر بخار چیک کیا۔ انہیں بخار کی حدت میں کمی محسوس ہوئی تو اللہ کا شکر ادا کیا اور اس کے بیڈ کے قریب ہی کرسی رکھ کر بیٹھ گئے اور یا سلام اور آیت الکرسی کا ورد کرنے لگے۔

''بوا! پانی کا جگ تو بھر کے رکھ دیا ہوتا کمرے میں پتا بھی ہے صفی کو رات کو کمرے سے نکلنا پڑتا ہے پانی کے لیے۔''

حلیمہ بیگم فجر کی نماز ادا کر کے لاؤنج میں آئیں تو خالی جگہ گلاس میز پر رکھے دیکھ کر بولیں۔ بوا وہیں کارپٹ پر بستر لگا کے سو رہی تھیں۔ ان کی آواز سن کر آنکھیں ملتیں، کسمساتی ہوئی اٹھ بیٹھیں اور جمائی لے کر بولیں۔

''بیگم جی! کمرے سے تو تب نکلیں گے ناں جب کمرے میں جائیں گے صفی میاں تو..... اپنے کمرے میں گئے ہی نہیں..... روشنی بٹیا کے سنگ رات گزار رہے ہیں۔''

''کیا اول فول بکے جا رہی ہو بوا.....؟''

حلیمہ بیگم نے غصے میں آتے ہوئے کہا۔ اسی وقت عمران اپنے کمرے سے باہر آیا۔ بوا کی بات اس نے پورے حواسوں سے سنی تھی۔ وہیں ٹھٹک کے رک گیا تھا۔

''سچ بولوں بیگم جی! یقین نہ آئے تو روشنی بٹیا کے کمرے میں جھانک لو، صفی میاں ابھی تلک وہیں ہیں۔''

بوا نے بے نیازی سے بات کا مزاج بدلتے ہوئے کہا۔

''ضرور روشنی کی طبیعت زیادہ خراب ہوگی میں دیکھتی ہوں، میں بھی اپنی تھکن میں بھول ہی گئی کے روشنی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ بچی سو گئی کے نہیں۔''

حلیمہ بیگم فکر مندی سے بولتی روشنی کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

''شادی کی تھکن تھی سب تھکے ہارے، نیند کے مارے اپنے اپنے کمروں میں جا کے سو رہے..... اور بڑے بھیا کو مل گیا موقع بٹیا کے کمرے میں گھسنے کا۔ بھئی ہم تو جو دیکھیں ہیں وہی بولیں ہیں۔''

بوا بڑبڑا رہی تھیں وہ بھی با آواز بلند..... عمران کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے اسی کیفیت میں عدنان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ وہ چند لمحوں میں آنکھیں ملتا باہر آ گیا۔

''کیا ہو گیا یار..... اتنی صبح صبح کیوں جگا دیا؟''

''ہم سوئے رہے اور صفی بھائی نے رت جگا منا لیا۔''

عمران نے زہر اگلا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے کمرے کا دروازہ آہستہ سے بند کیا تاکہ آواز اندر نہ جائے اس کی دلہن کے کانوں تک۔

''کیا کہہ رہے ہو؟ دماغ درست ہے تمہارا؟''

''میرا دماغ تو درست ہے مگر صفی بھائی کا دماغ درست کرنا پڑے گا ابھی اور اسی وقت چلو میرے ساتھ۔''

عمران غصے سے بولتا عدنان کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا۔

''کہاں لے جا رہے ہو؟ صفی بھائی کا کمرہ تو اس طرف ہے۔'' عدنان اپنی نیند ٹوٹ جانے پر چڑ کر بولا تو عمران نے بتایا۔

''اور صفی بھائی پوری رات سے روشنی کے کمرے میں ہیں۔''

''کیا.....؟''

''ہاں، اب سمجھ آ گئی یا سمجھانا پڑے گا۔'' عمران نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''سمجھانا تو صفی بھائی کو پڑے گا۔ ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے اب تک اور ہم سمجھ ہی نہ سکے۔''

عدنان اس کے ساتھ روشنی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

صفی بھائی نے آیت الکرسی اور چاروں قل، یا سلام پڑھ کر پانی پر دم کیا پھر سوئی ہوئی روشنی پر دم کیا اور اس کی معصوم صورت کو پرنم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اس کے سر پر نرمی سے اپنا دایاں ہاتھ پھیرتے ہوئے جھک کر اس کی روشن پیشانی پر بوسہ دیا۔

''صفی بھائی!'' دھاڑ سے دروازہ کھلا تھا اور عمران، عدنان غصے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ روشنی کی ڈر سے آنکھ کھلی تھی مگر فوراً ہی آنکھیں موند لی تھیں۔ اس نے صفی بھائی کی موجودگی محسوس کر کے۔

''کیا ہوا؟ آہستہ بولو روشنی۔''

صفی بھائی نے تحیر آمیز نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو عمران ان کی بات کاٹ کر غصے سے بولا۔

'روشنی کی آڑ لے کر کب تک اپنی ناجائز خواہشات پوری کرتے رہیں گے شرم نہیں آتی آپ کو بھائی بن کر بہن کی عزت سے کھیلتے ہوئے۔''

''عمران...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

صفی بھائی حیرت اور صدمے سے اسے دیکھتے ہوئے دکھ سے بولے۔

حلیمہ بیگم کمرے سے ملحق باتھ روم میں ہاتھ دھونے گئیں تھیں۔ وہ بھی اندر چلی آئیں۔ عمران کی زبان سے جو الفاظ ادا ہوئے تھے ان کو بھی اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ان کا بیٹا کہہ رہا ہے اپنے فرشتہ صفت بھائی کے بارے میں۔

''وہی کہہ رہے ہیں جو سب کو نظر آ رہا تھا مگر ہم نے اب تک اپنی آنکھوں پر آپ کی محبت کی پٹی باندھ رکھی تھی۔'' عدنان غصیلے لہجے میں چلایا۔ تو روشنی پوری طرح بیدار ہو گئی۔

''آپ کو روشنی کے ساتھ ہی رات گزارنا تھی شرم سے ڈوب مرنا چاہیے تھا آپ کو۔''

عمران نے صفی بھائی کا گریبان پکڑ کر غصے اور جوش غیرت میں ڈوبے لہجے میں کہا۔ صفی بھائی پر جیسے ساتوں آسمان آن گرے تھے۔

''شادی نہ کرنا تو صرف ایک بہانہ تھا اصل میں موصوف نے معصوم بہن پر بری نظر رکھی ہوئی تھی۔'' عدنان نے زہر اگلا۔

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم دونوں؟''

اسی وقت احسان مرزا کمرے میں داخل ہوئے اور شدید غصے کے عالم میں بولے۔ روشنی ہراساں سی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ صفی بھائی تو جیسے زندہ درگور ہو گئے تھے۔ اپنے بھائیوں کے گھٹیا اور سنگین الزامات نے انہیں بے جان کر دیا تھا۔

''بکواس نہیں کر رہے ابا جی! ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے روشنی کا بوسہ لیتے۔'' عدنان بولا۔

''تو......تم نے کبھی روشنی کا بوسہ نہیں لیا؟''

''ہم تو بھائی ہیں روشنی کو پیار کرتے ہیں۔'' عدنان نے کمزور سی دلیل پیش کی۔

''تو صفی کا حق بھی ایسا ہی ہے اگر اس نے روشنی کو پیار کر لیا تو کون سی قیامت آ گئی؟'' احسان مرزا گرجے۔

''صفی بھائی نے رات گزاری ہے روشنی کے کمرے میں اس کے ساتھ۔'' عمران کی زبان سے یہ جملہ ادا ہوا ہی تھا کہ احسان مرزا کا زوردار تھپڑ اس کے گال پر اپنے نشان چھوڑ گیا۔

''بدبختو! کچھ احساس بھی ہے کہ تم کیا تہمت لگا رہے ہو اپنے فرشتہ صفت بھائی پر؟''

''روشنی، صفی بھائی کی بہن نہیں ہے لہٰذا انہیں کوئی حق نہیں ہے روشنی کے آس پاس پھٹکنے کا۔''

عدنان نے تیز لہجے میں کہا تو صفی بھائی نے دیوار کو تھام کر خود کو گرنے سے بچایا تھا۔ ان کے سگے بھائیوں نے ان کے کردار پر کیسی تہمت لگائی تھی۔ ان کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔

حلیمہ بیگم دل تھامے بہت کرب و ضبط کے عالم میں کھڑی سب دیکھ اور سن رہی تھیں۔ صفی بھائی کی حالت پر

دکھی تھیں۔ روشنی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟

''بہن نہیں ہے تو کیا ہے؟ بتاؤ، بتاؤ ناں.....؟''

احسان مرزا نے عدنان کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے استفسار کیا تو وہ نظریں چرا گیا۔

''ہمیں تو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔''

''ہاں مجھے ضرور اب تم دونوں کو اپنا بیٹا بتاتے ہوئے شرم آئے گی'' احسان مرزا نے عدنان کو پیچھے دھکیلا اور غصے سے بولے۔

''کیوں؟ ہم دونوں کے لیے شرم کیوں ابا؟ آپ کو اور اماں کو کیا صفی بھائی کی بے شرمی دکھائی نہیں دیتی۔ انہیں بیٹا کہتے ہوئے آپ کو شرم کیوں نہیں آتی؟''

عمران نے تلخ، گستاخ اور تیز لہجے میں کہا۔

''کیوں کیا جرم ہے صفی کا کہ ہمیں اس کو اپنا بیٹا کہتے ہوئے شرم آئے۔ ایک باپ اگر اپنی بیمار بیٹی کی رات بھر تیمارداری کرتا ہے تو تمہاری نظر میں یہ گناہ ہو گیا، شرم کی بات ہو گئی..... شرم سے ڈوب مرو تم دونوں..... صفی پہ تہمت لگاتے ہوئے تمہیں ذرا بھی حیا نہ آئی..... بدبختو! صفی باپ ہے روشنی کا سگا باپ ہے روشنی کا.....''

''کیا.....؟'' حلیمہ بیگم نے عدنان اور عمران کو غصے سے دیکھتے ہوئے حیرت انگیز انکشاف کیا تو ان دونوں کے ساتھ ساتھ روشنی اور بوا کے سر پر بھی جیسے ایٹم بم پھٹ گیا تھا۔

''ہاں صفی اور روشنی کے بیچ باپ، بیٹی کا پاک رشتہ ہے۔ ایک باپ اپنی بیمار بیٹی کے سرہانے رات بھر پریشان بیٹھا رہا، اس کی تیمارداری میں لگا رہا جو اس کا حق بھی ہے فرض بھی ہے..... اور تمہیں باپ تو کیا صفی کے عمل میں ایک بھائی کا پیار بھی دکھائی نہ دیا..... اتنا کیسے گر گئے تم دونوں؟ بولو کس نے بھرا ہے تمہارے دماغ میں یہ خناس.....؟'' حلیمہ بیگم نے سخت، تیز اور غصیلے لہجے میں کہا۔ تو بوا کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

''بوا نے.....'' عمران اور عدنان کی زبان سے بیک وقت بوا کا نام ادا ہوا تو بوا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ احسان مرزا اور حلیمہ نے خونخوار نظروں سے بوا کو دیکھا۔

''دکھا دی ناں تو نے اپنی اوقات رہی نا کم ذات کی کم ذات تجھے ہم نے نالی سے اٹھا کے گھر میں جگہ دی مگر تو نے اپنی گندگی پھیلا دی ہمارے گھر کے آنگن میں..... ترس کھایا تھا تجھ پہ، مگر تو اپنی گندی سوچ اور زہریلی زبان کو آج تک قابو نہ کر سکی..... یہ صلہ دیا تو نے ہماری مہربانیوں کا..... چپ کیوں ہے بوا؟ تجھے ایسا کیا نظر آیا جو تو نے صفی پہ اتنا بڑا الزام دھر دیا اور عمران، عدنان کی عقل پر بھی پردہ ڈال دیا۔''

احسان مرزا بہت غصے میں گرج رہے تھے۔ سب نے پہلی بار انہیں اتنے غصے میں دیکھا تھا۔ عمران، عدنان تو شرم کے مارے پانی پانی ہوئے جا رہے تھے۔ صفی بھائی کا روشنی سے جو حقیقی رشتہ تھا وہ ان کے رشتے سے گہرا اور مضبوط تھا۔

''غلطی ہو گئی صاحب جی!'' بوا نے کانپتی آواز میں کہا۔

''یہ غلطی نہیں ہے تہمت ہے تہمت اور اس کی سزا تمہیں ضرور ملے گی بوا، تم نے اس گھر کو توڑنے کی کوشش کی، ہمارے رشتوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی ہے تم معافی کے لائق نہیں ہو بوا۔ دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔''

عمران نے غصے سے بوا کو دیکھتے ہوئے کہا گھر میں موجود گاؤں کے مہمان اور دونوں نئی نویلی دلہنیں بھی شور سن کر روشنی کے کمرے میں آ گئیں تھیں۔

''معافی دے دو صاحب جی! خمیر میں خناس بھرا تھا پورا سکھ کسی کا دیکھا نہیں جاتا۔'' بوا نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''ابا..... اماں!''

روشنی نے ہمت کر کے انہیں مخاطب کیا تو وہ تڑپ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ صفی بھائی تو سر جھکائے بت بنے بیٹھے تھے۔

ہماری غلطی تھی صفی سولہ برس کا ہوا تو چودہ برس کی نور بانو سے بیاہ دیا۔ دونوں کم عمر تھے نور بانو شادی کے پہلے برس میں روشنی کو جنم دے کر اللہ کو پیاری ہوگئی اور صفی نے نور بانو اور اپنی بیٹی کو میری گود میں ڈال کر کہا۔

''اماں! آج سے یہ آپ کی بیٹی ہے۔ آپ کو اللہ نے بیٹی نہیں دی تھی ناں..... یہ میری روشنی ہے اماں! میرے زندہ رہنے کا سہارا اور امید ہے۔ اسے اپنی بیٹی کی طرح پالنا اماں! میری روشنی کو ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دینا۔''

''میرے ہاں تب مردہ بچہ پیدا ہوا تھا۔ ہم نے اسے نور بانو کا بچہ بنا کر دفن کر دیا تھا اور روشنی کو اپنی بیٹی بتایا تھا سب کو تاکہ یہ بچی ماں کی کمی محسوس نہ کرے رشتوں کے بیچ الجھ کے نہ رہ جائے۔''

حلیمہ بیگم نے روشنی کو اپنے ساتھ لگا کر اصل بات بتاتے ہوئے دکھ سے کہا تو سب حیرت زدہ رہ گئے۔ عمران، عدنان تو شرمندگی سے زمین میں گڑ گئے تھے۔

''صفی نے آج تک شادی نہیں کی کیونکہ یہ نور بانو سے بہت پیار کرتا تھا اور روشنی میں تو اس کی جان ہے۔ روشنی کی خاطر اس نے دوبارہ شادی نہیں کی اور تم لوگوں نے پتا نہیں کیا کیا قصے گھڑ ڈالے۔'' احسان مرزا سنجیدگی سے بولے۔

''بہت عظیم ہیں صفی بھائی!'' عدنان کی دلہن بولی۔

''واقعی ایسے انسان تو نایاب ہیں آج کل۔'' عمران کی دلہن نے بھی سراہا۔

''بوا! سن لی اصل حقیقت؟'' احسان مرزا نے بوا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی صاحب جی! میں کم ذات، کم ظرف ہوں..... معافی دے دو۔'' بوا ہاتھ جوڑ کر بولیں۔

احسان مرزا سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

''تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے بوا۔ غلطی تو ہماری ہے کہ ہم نے تم پر بھروسہ کیا، احسان کیا اور تمہارے شر کا شکار ہوئے۔ اب تمہارے لیے اس گھر میں تو کیا اس خاندان میں بھی کوئی جگہ نہیں ہے..... ہم اپنی غلطی سدھارنا چاہتے ہیں..... تم جاؤ بوا۔ ہمیشہ کے لیے اس گھر سے چلی جاؤ۔ فوراً اپنا بوریا بستر سمیٹو اور چلتی پھرتی نظر آؤ۔ میں تمہیں اپنے گھر میں مزید گندگی اور شر و فساد پھیلانے کا موقع نہیں دے سکتا۔''

''میں اس عمر میں کہاں جاؤں گی صاحب جی.....؟''

بوا روتے ہوئے بولیں تو احسان مرزا کی گاؤں سے آئی ہوئیں رشتے دار خاتون بولیں۔

''جہنم میں جاؤ گی تم، کیونکہ تم نے جو پاپ کیا ہے اس کی سزا جہنم ہی ہے بوا! اور گاؤں میں تو پاؤں رکھنے کا سوچنا بھی مت تجھ جیسی فتنہ پھیلانے والی عورت کو ہم اپنے گاؤں میں گھسنے نہیں دیں گے۔ غضب خدا کا قبر میں پیر لٹک رہے ہیں تیرے اور اعمال کی سیاہی جمع کیے جا رہی ہے۔ اللہ کو کیا منہ دکھائے گی بوا! کوئلے جیسا منہ لے کر جائے گی اور جہنم کا ایندھن بنا دی جائے گی کیونکہ یہ تیرے کالے اعمال کی سیاہی ہے یہ تجھے آخرت میں بھی اندھیرا ہی بخشے گی۔''

''صفی میاں! معافی دے دو۔ پر مجھے گھر سے نہ نکالو، مجھے یہیں مرنے دو۔''

بوا، صفی بھائی کے آگے آ کر ہاتھ جوڑ کر فریاد کرنے لگی۔

''مرگئی ہو تم ہمارے لیے، جاؤ چلی جاؤ یہاں سے ورنہ تمہارے بڑھاپے پر بھی رحم نہیں کھائیں گے ہم۔''

عمران نے غصے سے کہا تو وہ سب کو باری باری ملتجی نظروں سے دیکھتی روتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''صفی بھائی! معافی کے لائق نہیں ہیں ہم..... مگر پھر بھی آپ سے معافی کے طلب گار ہیں..... پلیز اپنی روشنی کی خاطر ہمیں معاف کر دیں۔''

عدنان نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر شرمندگی سے

کہا۔عمران نے بھی ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''روشنی کی خاطر.....''صفی بھائی کے لب ہلے۔

''پلیز.....صفی بھائی! ہمیں معاف کردیں۔''

عمران بھیگتے لہجے میں کہتا ہوا ان کے قدموں میں جھکا تھا۔عدنان نے بھی اس کی پیروی کی تھی۔

''یہ.....یہ تم دونوں کیا کررہے ہو؟ پاگل ہوگئے ہو کیا؟'' روشنی کی خاطر تو میں ہر اندھیرے کا مقابلہ اور سامنا کرسکتا ہوں۔

اٹھو دونوں.....معاف کیا میں نے تمہیں۔

صفی بھائی ٹھہرے سدا کے رحم دل اور تحمل مزاج، درگزر کرنے والے دونوں کو اٹھاتے ہوئے سینے سے لگالیا۔

''تھینک یو صفی بھائی.....!'' عمران ان کے گلے سے لگ گیا۔

''آپ بہت عظیم ہیں صفی بھائی۔''

عدنان شرمندگی سے روتا ہوا ان کے گلے سے لگ گیا تھا۔ وہ گم صم سی روشنی کو دیکھ رہے تھے جو اس ساری صورتحال پر ششدر سی بیٹھی تھی۔

''تم دونوں روشنی کے بھائی بننے کے لائق ہی نہیں تھے یہ خیال رکھا ہے تم نے اپنی بہن کا.....اپنی شادی کی خوشی میں بہن کی تکلیف اور درد کو بھول گئے.....دیا بھی تو دکھ دیا بہن کو.....''

حلیمہ بیگم نے دونوں بیٹوں کو لتاڑا تھا وہ مزید شرمندگی میں گھر گئے۔

''اماں! ہم شرمندہ ہیں۔'' عدنان شرمندگی سے بولا۔

بھاڑ میں گئی تمہاری شرمندگی، جو گھاؤ تم دونوں نے صفی کے دل پر لگایا ہے ناں وہ ساری زندگی اسے درد دیتا رہے گا۔حلیمہ بیگم کا غصہ کسی طور کم نہیں ہورہا تھا۔

صفی بھائی نے ان دونوں کی پیٹھ تھپک کر انہیں تسلی دی۔

''کوئی بات نہیں.....ہو جاتا ہے ایسا.....انسان، شیطان کے بہکاوے میں آجاتا ہے۔نیکی، بدی کا کھیل تو ازل سے جاری ہے۔ انسان کو خود پر اپنے سے جڑے رشتوں پر اعتبار ہونا چاہیے بس۔

صفی بھائی نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا وہ دونوں شرمساری کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

''صفی.....بھائی.....''

روشنی نے روتے ہوئے اٹک اٹک کر انہیں پکارا تھا۔اس کے لہجے کی تڑپ نے صفی بھائی سمیت سب کو تڑپا کے رکھ دیا۔

''روشنی! میری گڑیا، میری جان، میری بیٹی''

صفی بھائی روشنی کو اپنے سینے سے لگا کر رو پڑے۔

''ابو! آپ.....میرے ابو ہیں۔''

روشنی روتے ہوئے بولی۔حلیمہ بیگم اور احسان مرزا بھی آبدیدہ ہوگئے۔

''ہاں میں تمہارا بدنصیب باپ ہوں جو تمہیں ابو کہنے کا حق نہیں دے سکا۔ مجھے معاف کردینا بیٹی۔''

صفی بھائی روتے ہوئے بولے اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر کر اس کی پیشانی چوم لی۔

''مگر.....یہ تو.....نئے ہیں.....اور.....مجھے تو وہ بہت اچھے لگتے ہیں، بہت پیار کرتی ہوں میں ان سے۔ میں.....ان کو نہیں بھول سکتی۔ وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔''

روشنی روتے ہوئے بولی تو انہوں نے تحیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

''وہ.....کون؟''

''صفی بھائی.....!'' روشنی نے بے اختیار کہا اور روتے ہوئے ان کے سینے میں چہرہ چھپا کر بلک بلک کر رونے لگی۔صفی بھائی بھی تڑپ تڑپ کر رو دیئے۔آن کی آن میں بدل جانے والا رشتہ، پرانے رشتے کی رخصتی پر سب کو رونے پر مجبور کرگیا تھا.....!''

☆☆☆☆

سلسلے وار ناول

قسط نمبر 6

جب پیار کی رُت بدل جائے

عابدہ سبین

رشتے انسان کی پہچان ہوتے ہیں اور ضرورت بھی
ایسے ہی رشتوں سے جڑے ایک ایسے شخص کی کہانی
جس نے اپنی ہر خواہش اور ہر خوشی رشتوں پر قربان کردی۔

معاشرتی ناہمواریوں کی ترجمان ایک پُر اثر تحریر

خلاصہ

آشیانہ صدیقی ، آصف صدیقی اور شعیب صدیقی دو بھائیوں کا محبت بھرا آشیانہ ہے جہاں اکیسویں صدی کے اس دور جدید میں بھی جب محبت کا وجود ناپید ہو چکا ہے آشیانہ میں محبتوں کی اعلیٰ مثال قائم ہے۔ آصف صدیقی جنہوں نے ہمیشہ اپنے رشتوں کی اہمیت برقرار رکھی نا صرف بچوں کی تربیت میں محبت شامل تھی بلکہ خاندانی اقدار اور روایات کی پاسداری بھی بدرجہ اتم بچوں کی تربیت میں موجود تھی ان کے تین بچے ذیشان احمد، عمیر اور بیٹی افشین صدیقی جبکہ چھوٹے بھائی کی اکلوتی حریم صدیقی ہی آشیانہ صدیقی کی کل کائنات تھی۔ آصف صدیقی نے ہمیشہ خود سے وابستہ رشتوں کو خود سے جوڑے رکھا ان کی دونوں بہنیں دور ہوتے ہوئے بھی ان کی ہر خوشی ہر دکھ میں شامل ہوتیں اور اپنے رشتوں کی مضبوطی کے لیے انہوں نے بڑی بہن کے بیٹے کے ساتھ افشین کو منسوب کر رکھا تھا جبکہ چھوٹی بہن سائرہ رحمان کی اکلوتی اور تین بھائیوں کی لاڈلی زینب شیرازی کو اپنے بیٹے ذیشان سے منسوب کر رکھا تھا۔ ذیشان احمد صدیقی کہانی کا سب سے اہم کردار ہے جس کی فطرت میں خاندانی اقدار اور روایات کی پاسداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی مگر مزاج اس کا بہت شوخ اور چلبلا تھا۔ اس کی پھوجی کے بیٹے محسن سے ان سب بہن بھائیوں کی اچھی دوستی تھی وہ اکثر اسے سمجھاتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ شانی کے مستقبل سے ان کی بہن بھی وابستہ ہے..... زینب شیراز اس کی منگیتر تھی مگر اسے شانی قطعی پسند نہ تھا اس کی وجہ شانی کا مزاج اور عادت نہیں تھی مگر وہ سب پر ظاہر یہ ہی کرتی کہ اسے شانی کی عادات سے اختلاف ہے۔ بہت جلد ہی شانی کو علم ہو گیا تھا کہ ذینی کے رویے کے پیچھے کیا راز ہے..... ذینی اپنے کلاس فیلو کو چاہتی تھی مگر ماموں کی محبتوں اور احسانات کی وجہ سے وہ منع نہ کر سکی مگر وہ شانی کی خامی کو ایشو بنا کر سب کے سامنے اسے برا ثابت کرنے کی کوشش میں تھی۔ کہانی کا دوسرا اہم کردار حریم صدیقی جس نے آشیانہ میں شہزادیوں کی طرح زندگی بسر کی تھی گھر بھر کی لاڈلی تھی..... کی تقریب میں اسے دیکھ کر اثبار حسن اس کا دیوانہ ہو گیا اور یوں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کر وہ اثبار حسن کی دہا میں آ گئی۔ افشین صدیقی کی منگنی بڑی پھوپھو کے بیٹے سے طے تھی جو آسٹریلیا میں مقیم تھا اور خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا اسے افشین قطعی ناپسند تھی مگر وہ چاہتا تھا کہ خود افشین اس رشتے سے انکار کرے وہ اکثر اسے کال اور میسجز پر دھمکایا کرتا تھا۔ شعیب صدیقی اور نازیہ صدیقی کو افشین کی ذہنی تکلیف کا علم ہو گیا تھا اور وہ افعان کی حقیقت سب کے سامنے لانا چاہتے تھے کہ ایک دن افشین کو افعان کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ افعان نے آسٹریلیا میں پہلے ہی شادی کی ہوئی ہے اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ شعیب صدیقی اور نازیہ صدیقی اچانک ایک دھماکہ میں جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ زینب شیراز اور شانی کی شادی کے دن تاریخ طے ہو جاتی ہے اور ادھر زینب شیراز نے سوچ لیا تھا کہ وہ کسی بھی صورت شانی سے شادی نہیں کرے گی اسی لیے اس نے فہیم عباسی کے ساتھ مل خفیہ نکاح کر لیا۔

آگے پڑھیے

قیامت ہی تو برپا ہوئی تھی جو طیارہ حادثے کا شکار ہوا تھا اس میں اثبار حسن بھی موجود تھے۔

صبح ہی تو ہنی گئی تھی کیونکہ آج اثبار نے لوٹنا تھا مگر یہ کسے معلوم تھا کہ وہ اب کبھی نہیں لوٹے گا..... ہنی کی تڑپ اس کی حالت دیکھ کر آصف صدیقی اور شازیہ صدیقی کو اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا..... ہوش و ہواس سے قطعی

بیگانہ ہو رہی تھی۔

''کاش اماں میں انہیں روک لیتی مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ مجھے اور ارید کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائیں گے.....''

''صبر کر میری بچی.....صبر کر.....''

انہوں نے کلیجے سے لگا لیا۔ رابعہ بیگم کی حالت دیکھتیں تو دل تڑپ جاتا جواں بیٹے کی موت نے انہیں جیتے جی ہی مار ڈالا تھا.....بہنیں کیسے بلک رہی تھیں بھائی کے لیے.....

''میں بھی مر جاتی ان کے ساتھ سر سے سائیں اٹھ جائیں تو کیا بچتا ہے میرے لیے تو دنیا ختم ہوگئی اماں.....''

وہ تڑپ تڑپ کر بے ہوش ہوگئی۔

ڈاکٹر کو دکھانا پڑا انہوں نے سکون کا انجکشن دے دیا.....مگر بھلا جس کا سہاگ اجڑ جائے جس کا ہنستا بستا گھر اجڑ جائے اسے سکون کیسے آسکتا ہے..... چند گھنٹوں بعد اس کی پھر وہ ہی حالت تھی۔ تین دن کے بعد جا کر چوتھے روز اثبار احسن کی ڈیڈ باڈی انہیں دی گئی تھی اور ڈیڈ باڈی دیکھ کر ہنی پھر ہوش کھو بیٹھی تھی۔ ایسے تڑپ کر روئی کہ ہر شخص کا دل دہل گیا۔ رابعہ بیگم نے اسے خود سے بھینچ لیا.....میت کو اٹھانا مشکل کر دیا تھا اس نے۔ شانی اور عمیر نے پوری طاقت سے اسے پکڑا تھا۔

''بس کر دے ہنی وہ اب ہماری تڑپ، ہماری آہیں نہیں سن سکتا بہت دور چلا گیا ہے وہ ہم سے.....'' رابعہ بیگم نے دونوں بانہوں میں اسے سمیٹا۔

''مجھے کس کے سہارے چھوڑ کر چلے گئے..... مجھے بھی ساتھ لے جاتے میرا کیا بچا ہے اب.....''

''نہ میرا بچہ یوں نہیں کہتے۔ حوصلہ کر دعا کر و اثبار کے لیے.....''

اس کی تڑپ نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ شازیہ صدیقی سے وہ خود رو رو کر بے حال ہو رہی تھیں۔ بار بار اثبار احسن کا چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا۔

جب اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا تو بھلا ہنی کو کیسے وہ حوصلہ دیتیں.....

اگلے دن قل خوانی کے بعد ان کی خواہش تھی کہ وہ ہنی کو گھر لے جائیں مگر رابعہ بیگم نے منع کر دیا۔

''میں نے مانا کہ اب میرا اس پر وہ حق نہیں رہا مگر شازیہ ہنی عدت کے دن یہیں مکمل کرے گی۔ اس کے بعد میں آپ کو منع نہیں کروں گی.....'' شازیہ صدیقی نے انہیں گلے لگا لیا۔

''اللہ کریم کی ذات آپ کو ہمت اور حوصلہ عطا کرے آپا.....اور ہم سب کو صبر عطا کرے۔''

''آمین.....''

وہ کتنی دیر رابعہ آپا کو گلے لگائے آنسو بہاتی رہیں.....

☆☆☆

آصف صدیقی جو خود اندر سے ریزہ ریزہ تھے ہنی کو خود سے لگائے حوصلہ دے رہے تھے..... کتنے دن سے ان کے من میں بے کلی اور بے چینی تھی جو خود ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ مگر اب انہیں پتہ چلا کہ ایسا کیوں تھا؟

ان کی بچی کا گھر اجڑ گیا کم عمری میں بیوگی کی چادر سر پر آن دھری تھی۔ بھلا ماں باپ کے لیے اس سے بڑا دکھ اور کیا ہو سکتا ہے۔ جس اولاد کی خوشی کے لیے وہ دن رات دعائیں کرتے ہیں ان پر کبھی آنچ نہیں آنے دیتے اور وہ ہی اولاد جب دکھوں کے سمندر میں غوطہ زن ہوں تو بھلا ماں باپ کے وجود میں کیا باقی رہ جائے گا۔

''ہم بے بس ہیں بچے قطعی بے بس وگرنہ اپنے بچوں کی خوشیاں اور سکھ تو ہمیں کسی سے چھیننے بھی پڑ جائیں تو ہم چھین کر لے آتے مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ قطعی لاچار ہیں اس خالق حقیقی کے سامنے۔ صرف صبر کر سکتے ہیں اور تمہیں بھی صبر کی تلقین کر سکتے ہیں۔ اثبار احسن جہاں چلے گئے ہیں وہاں سے واپسی ناممکن ہے بچے ہم سب نے دیر سویر وہیں چلے جانا ہے۔ رومت میرا بچہ اثبار احسن کے لیے دعا کرو، قرآن پاک پڑھو.....''

''ابا جانی زندگی کا یہ باب تو بہت کٹھن ہے۔ کیسے سہ پاؤں گی میں؟ میں نے زندگی کا ہر باب پوری ایمانداری سے نبھانے کی کوشش کی ہے مگر مجھے نہیں لگتا کہ اثبار کے بغیر میری زندگی میں اب کچھ باقی بچا ہے۔'' وہ سسک رہی تھی۔

''بچے زندگی تو وہ کتاب ہے جب تک ختم نہیں ہوتی ہر پل نیا سبق دیتی ہے۔ ہر دن نیا باب کھلتا ہے۔ اور ہمیں وہ باب گزارنے پڑتے ہیں مضبوطی اور ہمت کے ساتھ اس کے ہر کٹھن مرحلے سے گزرنا ہوگا یہ ہی تو انسان کا امتحان ہے۔''

ہولے ہولے اس کا سر تھپکتے وہ کہہ رہے تھے۔

''تم تو میری بہت بہادر بیٹی ہو ناں..... دیکھو رونے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا بہادر تو وہ ہی ہوتا ہے ناں جو کڑے سے کڑے حالات کو بہت ہمت سے فیس کرے یہ تمہارا امتحان ہے بچے اگر تم یوں ہی روتی رہیں تو زندگی کے اس امتحان میں فیل ہو جاؤ گی۔'' انہوں نے ہنی کا سر چوما۔

''اللہ پاک اپنے بندوں کو آزماتا ہے مگر ان پر برداشت سے زیادہ مشکل کبھی نہیں ڈالتا وہ غفور ہے رحیم ہے۔ تم کوشش کرو وہ خود تمہارے لیے آسانیاں پیدا کر دے گا۔''

اثبار احسن نہیں رہے مگر بچے تم تنہا نہیں ہو..... ہم ہیں ناں تمہارے ساتھ ہمارے لیے ارید کے لیے اپنا خیال رکھو میرا بچہ..... رویا مت کرو۔''

بھلا ان آنسوؤں پر اختیار کب تھا۔ اثبار کی دو ڈھائی سالہ سنگت میں گزرا ایک ایک لمحہ اس کے ذہن کے پردوں پر ہر وقت چلتا رہتا تھا۔ گھر کے ہر کونے سے اسے جیسے اثبار احسن کی آوازیں گونجتی سنائی دیتیں تھیں۔

☆☆☆

''افشین میری بچی اس طرح رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا..... نماز کے بعد اثبار کے لیے دعا کیا کرو۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے اور آگے کی منزل آسان بنائے اور ہنی کے لیے صبر کی دعا کیا کرو۔''

''پھوجی ابھی تو ہمیں ہی صبر نہیں آ رہا بھلا ہنی کو کیسے آئے گا جس کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی ہے..... پھوجی ہنی کے لیے سوچتی ہوں تو دل بھر آتا ہے۔ اتنی لمبی زندگی ہے بھلا وہ کیسے.....؟''

''وقت اور حالات انسان کو سب سکھا دیتے ہیں افشین زندگی سے ملنے والا ہر سبق ہمیں کٹھن لگتا ہے مگر جیسے جیسے زندگی کا یہ سفر طے کرتے ہیں سب خود بخود آسان ہو جاتا ہے۔''

''امی ٹھیک کہہ رہی ہیں افشین اللہ بہتر کرنے والا ہے تم پلیز اپنا خیال رکھو۔ اس حالت میں تمہارا یوں ذہنی طور پر اپ سیٹ رہنا ٹھیک نہیں ہے۔''

لبنیٰ بھابی نے پیار سے سمجھایا ان کی شادی کو کئی سال کا عرصہ گزر گیا تھا مگر اولاد نہیں تھی اور اب جبکہ افشین

تخلیق کے خوبصورت مراحل طے کر رہی تھی تو ان کی خوشی ناقابل بیان تھی۔ وہ خود سے بڑھ کر اس کا خیال رکھتیں تھیں۔ خوش تو سائرہ رحمان بھی بہت تھیں کہ ان کے آنگن میں بچوں کی قلقاریاں گونجنے والی تھیں۔

''کیا کروں بھابی جب بھی ہنی سے مل کر آتی ہوں پھر سے سارا حوصلہ، ساری ہمت بکھر جاتی ہے.....'' افشین نے چہرہ صاف کیا۔

''کیا ہوا.....؟''

اندر آتے محسن نے افشین کی روئی آنکھیں دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں بس میں اور افشین ہنی سے ملنے گئے تھے۔ اس کا دل بھر آیا بہن کی حالت دیکھ کر۔''

محسن بھی لب بھینچ گیا یہ صدمہ تو اس کے لیے بھی کم نہ تھا۔

''مجھے پتہ ہے افشین تم لوگوں کے لیے یہ دکھ سہنا بہت مشکل ہے۔ اپنے بہن بھائیوں کی خوشی کے لیے تو ہر انسان دعا کرتا ہے مگر شاید کچھ چیزیں انسان کے اختیار سے باہر ہوتی ہیں۔ آج کا انسان کتنا بھی ترقی کر لے چاند اور مریخ تک کا سفر طے کر لے مگر موت کے آگے ہمیشہ ہی بے بس رہا ہے۔''

''جس رب نے ہنی کو اس امتحان میں ڈالا ہے اسے صبر اور حوصلہ بھی وہ ہی دے گا مگر ہر کام کے لیے وقت درکار ہے چھوٹا سا زخم بھی بھرنے میں وقت لیتا ہے۔ افشین یہ تو بہت گہرا زخم ہے دو سال کی رفاقت و محبت تھی بھرتے بھرتے ہی زخم بھریں گے، ہمیں تو ہنی کی ہمت بڑھانی ہے اگر ہم خود ہی حوصلہ چھوڑ دیں گے تو اسے کیسے سنبھالیں گے۔''

محسن نے اس کا سر تھپکا۔

''اتنی کم عمری میں اتنا بڑا گھاؤ محسن بھلا کیسے گزرے گی زندگی ننھے سے ارید کا ساتھ اور تنہا ہنی جس میں وہ چالاکی بھی نہیں ہے جو لوگوں میں ہوتی ہے۔'' وہ پھر آنکھیں صاف کرنے لگی۔

''اللہ پر بھروسہ رکھو وہ ہی مسبب الاسباب ہے.....'' محسن نے اسے تسلی دی وہ چپ سی ہوگئی۔

☆☆☆

''یہ سراسر ظلم ہے ابا جانی وہ ہماری بہن ہے اور رابعہ آنٹی نے اس سے ملنے پر پابندی لگا دی.....''

عمیر اماں جانی سے لپٹا سسک رہا تھا۔ اشبار احسن کی دائمی جدائی اور اب رابعہ بیگم کا یہ کڑا فیصلہ کہ عدت کی مدت میں شانی اور عمیر کے سامنے نہیں آنا ان پر جیسے ستم ڈھایا گیا۔

''تم ابھی بچے ہو بہت سی باتیں ہیں جن کی باریکیاں تم نہیں سمجھتے..... شریعت میں غیر محرم کے سامنے آنا منع ہے عدت کے ان دنوں میں ہنی کسی کے سامنے نہیں آ سکتی.....''

''ابا جانی ہم غیر محرم ہیں..... وہ ہماری بہن ہے.....'' شانی تڑپ گیا۔

''ہاں بچے وہ تمہاری بہن ہے کیونکہ ہم نے کبھی تم میں یہ تفریق نہیں رکھی مگر شانی یہ معاشرہ اسے قبول نہیں کرتا..... یہاں دل کے حال کوئی نہیں جانتا۔ تم کچھ بھی کر لو..... لاکھوں دلائل دے دو مگر اس حقیقت سے منکر نہیں ہو سکتے کہ ہنی تمہاری ماں جائی بہن نہیں ہے چچا زاد بہن ہے.....''

''مگر ہمارے لیے وہ سگی بہن سے بھی بڑھ کر ہے.....'' شانی کا لہجہ بھیگ گیا۔

''بچے اوپر جو بیٹھا ہے وہ دلوں کے حال جانتا ہے انسان کے دل میں صرف اس کا ڈر ہونا چاہیے۔ مشکل وقت

ہے گزر جائے گا یہ بھی..... مگر ایک بات یاد رکھنا بچے ہنی اب تم دونوں بھائیوں کی ذمہ داری ہے اس گھر میں کبھی اسے کسی کمی کا احساس نہ ہو..... ہم رہیں نہ رہیں مگر ہنی کا مقام اس گھر میں وہ ہی رہنا چاہیے۔''

''ہنی کے سامنے ایک طویل عمر پڑی ہے اور ایک ننھے بچے کے ساتھ زندگی تنہا گزارنا بہت کٹھن ہے جب تک ہم ہیں اس کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے مگر زمانے کی نگاہیں بدلتے کب دیر لگتی ہے ساری عمر محبت وخلوص سے ایک چھت کے نیچے رہنے والے بہن بھائی کب نگاہ پھیر لیں زمانے کی بے مروت ہوا کب انہیں لپیٹے میں لے لے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آصف، ہم ہنی اور ارید کو زمانے کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔'' شازیہ صدیقی کی تلخ باتوں نے شانی کو ہلا دیا تھا۔

''آپ کو ہم پر بھروسہ نہیں ہے اپنے خون، اپنی تربیت پر بھی اعتبار نہیں رہا اماں جانی۔'' اسے حقیقتاً رنج ہوا تھا۔

''بات ہماری تربیت کی نہیں ہے شانی مگر ڈر لگتا ہے زمانہ جس تیزی سے بدل رہا ہے آنے والے وقت کی ہم قسم تو نہیں کھا سکتے ناں کہ کینا ہو، وقت اور حالات ہر انسان کو بدل دیتے ہیں۔''

''مگر میں قسم کھاتا ہوں کہ میرے احساسات میری بہن کے لیے کبھی نہیں بدلیں گے میں آپ دونوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ زمانے کی ہوا کتنی ہی تلخ ہو جائے میں ہنی پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ اپنی آخری سانس تک ذمہ داری نبھاؤں گا۔'' وہ جذباتی ہو رہا تھا۔

''مائی سن! ہمیں آپ پر بھروسہ ہے اور بہنوں کا خیال رکھنا تمہارا فرض بھی ہے..... تم دل چھوٹا نہ کرو تمہاری اماں دراصل تمہیں معاشرے کا وہ کڑوا پہلو بتانا چاہ رہی تھیں جو ہمارے ماحول کا حصہ بنتا جا رہا ہے..... جہاں خون حقیقتاً سفید ہو چکے ہیں..... مگر ہم جانتے ہیں ہمارے بچوں میں کبھی ایسا نہیں ہوگا.....''

ابا جانی کی باتوں نے اس کی ہمت بڑھائی تھی۔ وہ مطمئن سا ہو گیا۔

☆☆☆

''یہ سچ ہے کہ حلق سے غذا اترنا مشکل ہے مگر مرنے والے کے ساتھ ہم مر نہیں سکتے زندہ رہنے کے لیے بہر حال ہمیں خوراک کی ضرورت ہے ہنی..... اور تم امی کا حوصلہ تو دیکھو انہوں نے بھی تو جواں بیٹا کھویا ہے..... ان کی خاطر ہی ہمت باندھ لو تمہیں دیکھ کر ان کا کلیجہ پھٹتا ہے.....'' اریشہ بھابی اس کے لیے کھانا کمرے میں ہی لائیں تھیں مگر وہ کھانے سے انکاری تھی۔

''اثبار نہیں رہے مگر ان کی نشانی تمہارا اور ان کا بیٹا تو تمہارے پاس ہے ناں اندازہ ہے تمہیں اس کی کیا حالت ہے۔ اپنا خیال رکھو اس پر توجہ دو ہنی..... تم اس طرح اپنی ذات سے بے خبر رہو گی تو اس ننھی جان کو کون سنبھالے گا۔ باپ کے سائے سے تو وہ محروم ہو چکا ہے مگر ماں کی توجہ اور محبت سے تو محروم نہ کرو اسے..... اپنی ذات کا اعتماد بحال کرو تاکہ تم اس کی تربیت میں بھی اعتماد پیدا کر سکو.....''

''اریشہ بھابی مجھے تو اثبار کے بغیر رہنے کی عادت ہی نہیں ہے اثبار ساری ذمہ داری مجھے اکیلی کو سونپ گئے مجھے تو قدم قدم پر ان کی کمی پھر سے وہیں لا کر کھڑا کر دے گی۔''

''عادت تو مشکل سے پڑے گی ہنی اس کے بغیر جینے کی مگر مجبوری یہ ہے کہ اب تمہیں یہ عادت ڈالنی ہو گی۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر چہرہ بھگو رہے تھے۔

اریشہ بھابی نے زبردستی اسے چند نوالے کھلائے تھے ان کے جانے کے بعد وہ وضو کر کے ظہر کی نماز ادا کرنے لگی۔ نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے تو پھر سے آنسو جاری ہو گئے۔

''اے میرے مالک تو رحمٰن ہے کریم ہے بے شک تجھے ہر بات کا علم ہے بھلا پھر میں تجھ سے کیا مانگوں سوائے اس کے کہ تو میرے دل کو صبر اور سکون عطا فرما دے۔ مجھے حوصلہ دے کہ میں اثبار کے بنا اس دنیا میں جی سکوں۔ اپنے بچے کی پرورش اور تربیت احسن طریقے سے انجام دے سکوں اور اسے یہ احساس بھی ناں ہونے دوں کہ وہ باپ کے سائے سے محروم ہے۔''

دعا مانگنے کے بعد وہ کتنی ہی دیر ہچکیوں سے روتی رہی کہ اچانک رابعہ بیگم نے کمرے میں آ کر اس کے وجود کو بانہوں میں بھر لیا۔

☆☆☆

ٹیرس پر تنہا بیٹھا اس وقت وہ بہت افسردہ تھا۔ خوبصورت موسم ٹھنڈی ہوا اور نیچے لان کا خوشگوار ماحول کچھ بھی اسے متاثر نہیں کر رہا تھا کیونکہ اس کا دل بے حد اداس تھا اور دل کا موسم افسردہ ہو تو کوئی بھی موسم اثر نہیں جما سکتا۔ شاید اداسی تو بہت معمولی لفظ تھا جو اس وقت اس کے دل کی کیفیت تھی۔ جب سے وہ کراچی سے لوٹا تھا بس یوں ہی تھا۔ انسان کو محبت نہ ملے تو مقدر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتا ہے مگر محبت اگر سچی ہو تو محبوب کا سکھ اور خوشی بھی دل کو سکون عطا کرتے ہیں مگر.....!''

''امی نیچے بلا رہی ہیں ویرے.....''

''وینی! پلیز مجھے اس وقت صرف تنہائی درکار ہے.....''

سعد ملک کے چہرے پر آنکھوں میں تیرتا کرب وینی کو یکدم ہراساں کر گیا۔

سعد ملک اکثر اداس رہتا تھا مگر کبھی بھی ایسا کرب اور بے چینی نظر نہیں آئی آج کیا ہوا تھا کہ وہ اتنا رنجیدہ تھا۔

''تم بھول کیوں نہیں جاتے اسے سعد.....؟''

شاید وہ جانتی تھی کہ سعد کے من میں کیا ہے۔

''بھول ہی تو گیا تھا مگر وقت نے پھر اسے میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے اور اس بار وہ بھی میری طرح تہی داماں ہے میں اپنی تکلیف سہہ سکتا ہوں مگر اس کا دکھ میرے دل کو کاٹتا ہے۔ میرا بس چلتا تو میں اس کے سارے دکھ اپنی ذات میں سمو لیتا اور صرف اس کے پاس خوشیاں ہی خوشیاں رہ جاتیں مگر میں بے بس ہوں وینی انتہائی بے بس کچھ بھی تو نہیں کر سکتا.....''

''میں نے ایسی محبت نہیں دیکھی سعد تم اتنے سال بعد بھی اس کے لیے وہ ہی جذبات رکھتے ہو ایسا تھا کیا اس میں.....''

وینی اسے سالوں سے لاحاصل محبت کے دکھ میں مبتلا دیکھ رہی تھی۔

''وہ خوش تھی آباد تھی میں بھی خوش تھا مگر اب..... اس کی خوشیوں کو جانے کس کی نظر لگ گئی ہے۔''

''میرے بھائی کا دل دکھائے گی تو خوش کیسے رہ پائے گی.....''

''وینی.....!''

سعد ملک کے چہرے اور لہجے کی سختی پر وہ حیران رہ گئی۔

''آئندہ اس طرح کے لفظ کبھی زبان سے نہ نکالنا اگر تمہیں اپنے بھائی سے محبت ہے تو..... میں تو کبھی اس کے لیے غلط سوچ بھی نہیں سکتا میرے دل سے ہر لمحہ اس کے لیے دعا ہی نکلتی ہے وینی.....''

''آئی ایم سوری سعد.....''

اسے لگا سعد ہرٹ ہوا ہے تبھی اس نے فوراً معذرت کر لی۔

''وہ میرے جذبات سے انجان ہے وینی اس کے لیے کبھی کچھ غلط نہ سوچنا..... اس کے لیے دعا کرنا.....'' پتہ نہیں سعد کو کیا ہو گیا تھا۔

وہ بس حیران سی وہاں سے واپس آ گئی۔

☆☆☆

اس کی نگاہیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں اور چہرے کے پل پل بدلتے تاثرات میں پریشانی نمایاں تھی۔

ناک کر کے فاروقی صاحب اندر آئے تھے۔

''پلیز سٹ ڈاؤن فاروقی صاحب.....''

اس نے نظروں کا بدلے بنا انتہائی سنجیدگی سے کہا تھا۔ فاروقی صاحب چیئر پر بیٹھ کر اس کے بولنے کے منتظر تھے۔ جس کے چہرے پر فکرمندی بڑھتی جا رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہے فاروقی صاحب آپ ہمیں ''سب ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے'' کہہ کر بہلاتے رہے اور یہ جو میری نگاہ کے سامنے اتنی بڑی پرابلم ہے جو میرے دماغ کو ہلا رہی ہے۔''

سکرین سے نظریں ہٹا کر فاروقی صاحب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے وہ بولا تھا۔

''میں خود پریشان ہوں ہر کام اپنی نگرانی میں کراتا رہا ہوں میں مگر جانے کیسے.....''

''آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہماری پروڈکٹ کی کوئی کمپلین ہمیں ملی ہو فاروقی صاحب یہ نام و مقام بنانے میں ابا جانی نے بیس سال لگائے ہیں..... اگر آپ کی لاپروائی کے باعث یہ ڈیل کینسل ہو گئی تو اندازہ ہے آپ کو ہمیں کتنا بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا.....''

فاروقی صاحب کی وہ بہت عزت کرتا تھا مگر اس وقت شاید کنڈیشن ایسی تھی کہ وہ لہجے پر قابو نہ پا سکا۔

''ایم سوری ذیشان بیٹا.....''

''آپ کی معذرت ہماری پرابلم حل نہیں کر سکتی۔ فاروقی صاحب آپ مجھے انفارم تو کر سکتے تھے چند دن ہم مجبوری کے باعث آفس نہ آ سکے تو اتنی بڑی مس ٹیک کر دی آپ نے.....''

غصے سے اس کی دماغ کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔

''آپ پریشان تھے اتنا بڑا حادثہ ہو گیا تھا مجھے مناسب نہ لگا بتانا۔''

''اور اب جو بدنامی ہماری کمپنی کی ہو گی وہ..... ہم لاس برداشت کر سکتے ہیں مگر ہماری ساکھ ہمارے نام پر حرف آئے یہ برداشت نہیں کر سکتے ہم..... اب مجھے خود ہی سب ہینڈل کرنا ہو گا۔''

''پلیز آپ جائیں.....''

فاروقی صاحب خاموشی سے اٹھ کر جانے لگے۔

'اور برائے مہربانی ابا جانی سے ذکر مت کیجئے گا وہ ٹینشن لے لیں گے۔''

''جی بہتر.....'' فاروقی سر ہلاتے باہر نکل گئے۔

اس کا ذہن اس گھڑی قطعی کام کرنے سے قاصر تھا۔ آخر غلطی کہاں ہوئی تھی اور کیسے ہوئی تھی۔

بات کمپنی کی ساکھ تھی صدیقی گروپ آف کمپنز کے نام کی تھی..... اور اگر وہ نئے سرے سے کام شروع کرواتا ہے تو اسے پچاس لاکھ کا نقصان برداشت کرنا ہوگا..... دوسری صورت میں اگر ڈیل کینسل ہوئی تو بدنامی ہوگی۔

اس نے ارجنٹ حسن کو اپنے کیبن میں بلایا تھا۔ اسے حسن پر بہت اعتماد تھا۔ بلاشبہ حسن بہت محنتی اور ذہین انسان تھا اور ایمانداری اس کی اضافی خوبی تھی۔

''سر اگر کمپنی کا نام اور ساکھ قائم رکھنی ہے تو پھر یہ نقصان کوئی معنی نہیں رکھتا۔''

''حسن پچاس لاکھ کا نقصان ہے.....'' اس نے شاید احساس دلایا۔

''آئی نو مگر دوسری صورت میں چالیس سال کا بنا بنایا نام اور ساکھ کمزور ہوگی.....''

''ہمارے پاس صرف ایک ہفتہ ہے حسن..... اور اس ایک ہفتہ میں ہم نے دن رات ایک کرنا ہے اور اس دفعہ یہ میں لک آفٹر کر رہا ہوں خود..... اور تم میرے ساتھ رہو گے۔''

بہت سمجھ کر اس نے فیصلہ لیا تھا مگر اس کے دل میں فاروقی صاحب کے لیے اچھا خاصا بال آ گیا تھا اور اس بار وہ ان پر قطعی بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔

''او کے فائن سر.....''

''کل صبح میٹنگ کال کر دینا مجھے سب سے بات کرنی ہے اعتماد میں لینا ہے۔''

''جیسا آپ مناسب سمجھیں.....''

ذیشان احمد صدیقی نے گہری سانس خارج کر کے خود کو ریلکس کرنا چاہا۔

''تم ٹھیک کہتے تھے حسن ہمیں آنکھیں بند کر کے کسی پر بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔''

''جی سر..... مگر آصف سر کو بھی یہ جاننا ضروری ہے۔''

''ہوں لیکن فی الوقت میں ابا جانی کو اس بابت کچھ نہیں بتا سکتا ان دنوں گھر میں سب پہلے ہی صدمے سے دو چار ہیں ایسے میں یہ تمام باتیں ابا جانی کی صحت متاثر کر سکتی ہیں۔ آئی ہوپ حسن ہم یہ سنبھال لیں گے.....''

''انشاء اللہ سر.....''

حسن نے بھی امید بھرے انداز میں کہا تھا۔ ذیشان اب کچھ مطمئن سا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

افشین کی اداسی اور خاموشی کے بعد وہ اسے کچھ دیر کے لیے باہر لایا تھا مگر یہاں بھی اس کی چپ نہیں ٹوٹ رہی تھی۔

''کچھ بولو افشین.....''

''کتنے خوش تھے ناں محسن ہم ایک ماہ پہلے جب پکنک پر گئے تھے۔ کتنا سب ہنس رہے تھے۔ بس اسی دن شاید ہماری خوشی، ہماری ہنسی کو نظر لگ گئی جو ہم سب کے چہرے سے وہ ہنسی ہی روٹھ گئی اور فقط آنسو رہ گئے.....''

''حوصلہ رکھو افشین جو دکھ دیتا ہے وہ ہی سکھ بھی عطا کرتا ہے آزمائش ہے ہماری یوں ہمت نہ ہارو.....''

''آزمائش کی کڑی تو بہنی کے لیے ہے جو ہم سب سے کہیں زیادہ ہے محسن..... اماں جانی بتا رہی تھیں کہ اس کی

ساس نے شانی اور عمیر سے ملنے پر بھی پابندی لگا دی ہے کہ وہ نامحرم ہیں وہ دونوں بہت دکھ میں ہیں ابا جانی کے سمجھانے پر کچھ سمجھے ہیں..... اوپر سے رابعہ آنٹی کی بہن جو ہر تیسرے دن آجاتی ہیں دل پر ضرب لگانے ایسی ایسی باتیں کرتی ہے کہ انسان کی روح لرز جائے۔ صدمہ بھی ہمارا ہے اور وہ باتیں ایسی کرتیں ہیں کہ گویا ہمیں ہی مورد الزام ٹھہرا رہی ہوں..... اریشہ بھابی بتا رہی تھیں کہ بنی بہت حوصلے والی ہے جو ان کی بات سہہ لیتی ہے ورنہ وہ انسان کی برداشت آزماتی ہیں.....''

''ہر انسان کی اپنی سوچ، اپنا ظرف ہوتا ہے افشین ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ بس اللہ پاک انہیں ہدایت دے..... اور رہی بات بنی کی مجھے یقین ہے کہ اللہ پاک نے اسے بہت ہمت عطا کی ہے۔ وہ ایسے لوگوں کو بآسانی فیس کر سکتی ہے مجھے اس پر مکمل یقین ہے۔''

محسن کی آخری جملے پر افشین کتنی دیر خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

''کیا دیکھ رہی ہو.....''

''آپ سے ایک بات پوچھوں برا تو نہیں منائیں گے'' اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہاری بات کا کیوں برا مناؤں گا ڈیئر.....''

محسن کی محبت نے ہمیشہ ہی اسے بہت مان اور اعتماد بخشا تھا۔ جانے کیوں آج اک سوال دل میں مچلا جسے اس نے زبان دے دی۔

''کیا آپ کو آج بھی بنی سے محبت ہے.....''

اس کے سوال پر محسن بہت سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا..... کتنے ہی لمحے بیت گئے۔

''کیا تمہیں میری محبت میں کہیں کوئی کمی محسوس ہوئی افشین..... میرے کسی فعل سے ایسا لگا کہ میرے دل میں تمہارے علاوہ کسی اور کی محبت ہے..... مانتا ہوں وہ میری نادانی تھی مگر میں نے تمہیں اپنایا ہے اپنی تمام تر رضا کے ساتھ، میرے دل میں کہیں کوئی خلش کوئی کسک نہیں ہے۔ ڈیئر وائف..... تم میرے لیے اجنبی تو نہیں ہو ہم نے بچپن جوانی ہر دور ساتھ گزارا تھا تمہیں میری شخصیت میں کوئی دوغلہ پن کبھی دکھائی دیا.....؟''

''آپ کو برا لگا.....؟'' وہ شرمندہ ہوئی۔

''دیکھو افشین ہم اچھی طرح ایک دوسرے کو نا صرف جانتے ہیں بلکہ سمجھتے بھی ہیں۔ مجھے امید ہے آئندہ تمہیں ایسا سوال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی..... اور ہاں ایک بات یاد رکھنا بنی جس طرح تمہیں عزیز ہے اسی طرح مجھے بھی عزیز ہے تم جانتی ہو..... اور.....''

''آئی ایم سوری محسن میرا یہ مطلب نہیں تھا.....''

اس نے کھلے دل سے معذرت کی محسن نے بھی مسکرا کر سر ہلا دیا۔

''گھر چلیں.....''

''کچھ دیر کے لیے ماموں جانی کے پاس چلتے ہیں۔ کئی دن سے ان سے نہیں ملا.....'' محسن نے جیسے اس کے دل کی بات کہہ دی اس کا بھی من اماں ابا سے ملنے کو چاہ رہا تھا..... شانی اور عمیر بہت یاد آرہے تھے۔

''شانی تو نہیں ملے گا اماں جانی کہہ رہی تھیں کہ وہ زیادہ لیٹ آرہا ہے۔''

''ہوں چلو دیکھیں گے.....''

محسن اٹھ کھڑا ہوا اور افشین بھی اس کا ہاتھ تھامتی اٹھ گئی۔

☆☆☆

آفس سے تو وہ کئی دن سے لیٹ آ رہا تھا مگر پھر گھر آ کر بھی وہ رات گئے تک لیپ ٹاپ میں سر کھپائے رہتا تھا۔

''شانی بابا بڑے صاحب نے بلایا ہے آپ کو.....''

خادماں کی اطلاع پر اس نے گھڑی دیکھی جہاں ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ اس کو تشویش ہوئی ابا جانی جاگ رہے تھے اب تک.....!

وہ اپنا کام چھوڑ کر اگلے دو منٹ بعد ابا جانی کے سامنے تھا۔

''آپ اب تک سوئے نہیں ابا جانی.....''

''آپ بھی تو جاگ رہے ہیں کئی دن سے میں آپ کو لیٹ نائٹ تک کام کرتے دیکھ رہا ہوں.....''

وہ مسکرا دیا ابا جانی کو وہ قطعی پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''آپ کو علم ہے ابا جانی کہ کئی دن میں آفس نہ جا سکا تھا پچھلے دنوں تو بس اسی وجہ کچھ کام بڑھ گیا ہے۔ ایک دو دن کی بات ہے انشاء اللہ پھر سب روٹین میں آ جائے گا۔'' ابا جانی سر ہلانے لگے۔

''بیٹھیں بچے کچھ باتیں کرنی تھیں آپ سے.....''

وہ پیار سے بولے شانی ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''شازیہ بیگم اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو کیا ہم دونوں باپ بیٹے کے لیے کافی بنا سکتی ہیں.....''

''جی بنا دوں گی مگر آپ کی طبیعت تو بہتر ہے نہیں.....'' وہ فکرمندی سے بولیں۔

''اماں جانی ابا جانی کی طبیعت اچھی نہیں تھی آپ مجھے بتا دیتیں ہم چیک اپ کے لیے لے جاتے.....''

''اس کے لیے آپ کا دستیاب ہونا بھی ضروری ہے بچے۔ آپ تو خود آصف صدیقی بنتے جا رہے ہیں.....''

پہلے انہیں مجازی خدا کی بے جا مصروفیت کھلتی تھی اب وہ بیٹے سے بھی نالاں رہتیں تھیں۔

''ایم سوری اماں جانی بٹ پرامس صبح میں ضرور ابا جانی کو لے جاؤں گا۔''

''ارے یار میں ٹھیک ہوں یہ تو یوں ہی پریشان ہوتی ہیں.....''

ابا جانی ٹھیک سے بیٹھنے لگے تو انہیں بیٹھنے میں بھی تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ اماں جانی کافی بنانے چلی گئیں تو ابا جانی نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''شانی بچے موت کے سامنے ہر انسان بے بس رہا ہے اور موت کا وقت بھی مقرر نہیں ہوتا..... کیا پتہ ہمیں بھی کب بلاوا آ جائے اور ہم چل بسیں.....''

''ابا جانی.....'' وہ تڑپ کر بولا۔

''مجھے کہنے دو بچے جو میں کہنا چاہتا ہوں مجھے اب اپنے کاروبار کی کوئی فکر نہیں ہے مجھے یقین ہے کہ میری کمپنی اب مضبوط ہاتھوں میں ہے۔ فکر تو ہے مجھے بہنی کی وہ تمہاری ذمہ داری ہے شانی ہمیشہ اس کے محافظ بن کر رہنا ہم نہ رہیں تب بھی اسے ہماری کمی کا احساس نہ ہو۔ وہ جس طرح چاہے جیسے اس کی خوشی ہو گی وہ اپنی زندگی گزارے گی تم اسے کسی بھی چیز کے لیے فورس نہیں کرو گے۔ اس گھر، اس کاروبار پر وہ برابر کی حقدار ہے۔ میری جان مجھے بہت

یقین ہے کہ تم کبھی اس کی حق تلفی نہیں کرو گے۔''

انہوں نے شانی کے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا۔

''میں اپنا یہ آشیانہ تمہیں سونپ رہا ہوں۔ اس آشیانے کی اور اس کے ہر مکین کی ذمہ داری تم پر ہے۔ تمہاری ذات سے گھر کے کسی فرد کو تکلیف نہ ہو شانی ان کی حفاظت ان کی خوشیوں کی ضمانت اب تم ہو.....''

''ابا جانی پلیز آپ کیوں ایسی باتیں کر رہے ہیں.....'' وہ روہانسا ہو گیا۔

''اپنے خاندان اور رشتہ داروں کو ہمیشہ ساتھ لے کر چلنا بچے جیسے ہم نے اب تک رشتے نبھائے ہیں تم سے بھی یہی امید رکھتے ہیں تم اسی طرح نبھاہ کرو گے.....'' آصف صدیقی کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

''میں آپ کی ہر بات مان لوں گا مگر پلیز آپ ایسے مت کہیں.....''

''ارے یار ہم صرف اس لیے من کا بوجھ ہلکا کر رہے ہیں کہ ہمیں اب ہر ذمہ داری سے دستبردار ہونا ہے۔ بہت کر لی زندگی کی ذمہ داریاں پوری اب تمہاری باری ہے.....''

اس کا من کچھ پرسکون ہوا تھا اماں بھی کافی لے آئیں۔

''اوکے بٹ.....صبح آپ میرے ساتھ جا رہے ہیں چیک اپ کے لیے ارشد انکل کے کلینک.....''

ابا جانی مسکرا کر سر ہلانے لگے تھے۔

وہ کافی کے دوران ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا ان سے بھی اور اماں جانی سے بھی جو اس سے اکثر اب خفا رہتیں تھیں کہ وہ انہیں وقت نہیں دیتا۔

☆☆☆

اتنا لیٹ سونے کے باوجود بھی عین فجر کی اذان کے وقت اس کی آنکھ کھل گئی تو اس نے بھی سستی نہ کی اور فوراً اٹھ کر وضو کر کے نماز کے لیے چلا گیا تھا۔

نماز سے واپسی پر اسے اماں جانی کی بے تاب آواز سنائی دی تھی۔

''کیا بات ہے اماں جانی!''

جواباً اماں کے حلق سے جیسے آواز بھی نہیں نکل پا رہی تھی۔ بمشکل وہ ''تمہارے ابا جانی'' کہہ پائیں تھیں۔

شانی لمحے کے ہزارویں حصے میں کمرے کی طرف بھاگا تھا۔

''ابا جانی.....''

اس نے ابا جانی کو ہلایا مگر ان کا ساکت وجود اس کے اپنے وجود کی جان نکال رہا تھا۔

اس نے ابا جانی کو پوری طاقت سے اٹھایا اور تیزی سے وہ باہر کی طرف بھاگا تھا۔ اسے خود نہیں پتہ تھا کہ کیسے وہ گاڑی ڈرائیو کر کے ابا جانی کو ہاسپٹل لایا تھا۔

حواس تو تب ہی کام کرنا چھوڑ چکے تھے جب ڈاکٹر نے ابا جانی کو چیک کرنے کے بعد کہا تھا۔

''ان کو ایکسپائر ہوئے تو گھنٹے گزر گئے۔''

''نہیں ابا جانی نے چند گھنٹے قبل ہی تو مجھ سے اتنی باتیں کیں ہیں۔ آپ پلیز اچھی طرح چیک کریں۔

''ہمت کرو ینگ مین صدیقی اب دنیا میں نہیں رہے۔ ڈاکٹر ارشد کی آواز نے تو اس کے وجود سے روح ہی نکال لی تھی.....اسے نہیں پتہ کیسے محسن اور احسن بھائی کو اطلاع ملی وہ کب آئے اور کیسے وہ ابا جان کی آشیانہ لے کر

پہنچے وہ قطعی ساکت وجود کے ساتھ پتھر کے بت کی مانند ان کے ہمراہ تھا۔
مگر آشیانہ میں قدم رکھتے ہی جب اماں افشین اور عمیر تینوں اس سے لپٹ کر روئے تو اس کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی تھی۔
''ہم یتیم ہو گئے شانی ابا جانی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے..... ہمارے سر سے تو سائبان ہی اٹھ گیا.....''
افشین کیسے تڑپ رہی تھی اور عمیر..... وہ تو ابا جانی کا کتنا لاڈلا تھا کیسے وہ ابا جانی ڈیڈ باڈی سے لپٹا بے حال ہو رہا تھا..... اور اماں جانی..... اس کی پتھر ہوتی آنکھوں نے حرکت کی..... اماں بھی اس کی طرح ساکت تھیں۔ بس بے آواز آنسو تھے جو ان کے پرنور چہرے کو بھگو رہے تھے..... وہ گھٹنوں کے بل بیٹھتا چلا گیا۔
''اماں جانی.....''
اس کی آواز میں جو کرب تھا شازیہ صدیقی کو لگا ان کا وجود ہل گیا انہوں نے شانی کو اپنی آغوش میں سمو لیا اور بلک بلک کر رو دیں۔
آشیانہ صدیقی پر ایک اور قیامت ٹوٹی ایک کے بعد ایک صدمہ..... آشیانہ کے مکینوں کا جانے اور کتنا امتحان باقی تھا۔ سب کو اطلاع کر دی گئی..... بی بی جان نے جب بھائی کا چہرہ دیکھا تو تڑپ گئیں۔
''مجھے کیا پتہ تھا آصف کہ میں تجھے دوبارہ نہیں دیکھ پاؤں گی کتنے دن سے دل تڑپ رہا تھا کہ اڑ کر آ جاؤں کیا پتہ تھا کہ تجھے یوں دیکھنا پڑے گا۔''
سائرہ رحمان نے چہرے سے آنسو پونچھتے ہوئے بڑی بہن کو گلے لگایا تھا۔
''ارے ابھی تو ہمیں اشار احسن کا یقین نہیں ہو رہا تھا تم بھی ہمیں چھوڑ گئے.....''
''یا اللہ یہ کیسا امتحان ہے تیرا میرے مولا کیسی آزمائش ہے۔''
ہنی کے لرزتے وجود کو دیکھ کر شازیہ صدیقی کے دل سے صدا نکلی تھی۔
''میری بچی کے سر پر شوہر کا سایہ تو اٹھ گیا تھا اب باپ کا سایہ بھی نہ رہا.....''
آصف تو ہمیں بھری دنیا میں تنہا کر گئے..... کم از کم ہنی کے لیے..... یوں نہ ہمیں چھوڑ کر جاتے.....''
آصف صدیقی کی میت کو اٹھاتے وقت شازیہ صدیقی کا حوصلہ دیکھنے والا تھا جن کے بارے میں خاندان کے ہر فرد کا خیال تھا کہ انہیں سنبھالنا کٹھن ہو گا۔ کیسے اپنے بچوں کو خود میں سموئے وہ خاموش بہتے آنسوؤں سے مجازی خدا کو لے جاتا دیکھتی رہیں۔
سب ان کے حوصلے کو سراہے بنا نہ رہ سکے۔
سب جانتے تھے کہ کتنی لمبی رفاقت تھی اور ان کی اور آصف صدیقی کی محبت بھی مثالی رہی تھی۔
کوئی ان کے دل میں جھانک کر تو دیکھتا کہ کیسے ان کا کلیجہ پھٹ رہا تھا۔ مگر انہیں پتہ تھا کہ اب ان کے بچوں کی نگاہوں کا مرکز ان کی ذات ہے۔ اور اگر وہ خود بکھر گئیں تو ان کے بچوں کو کون سنبھالے گا کون حوصلہ دے گا۔ جنہیں ہمت کی اشد ضرورت تھی۔

☆☆☆

قل خوانی ختم ہو چکی تھی مگر بی بی جان کو ہنی دوبارہ نظر نہ آئی بس کل ہی چند گھنٹے وہ نظر آئی تھی۔
''ہنی کہاں ہے شازیہ.....''

وہ جانتیں تھیں کہ اس کے لیے یہ دہرا صدمہ سہنا کس قدر مشکل ہوگا.....

''اسے رابعہ آپا کل ہی لے گئی تھیں مغرب سے پہلے..... عدت جو گزار رہی ہے وہ.....''

''یہ گھر بھی تو اس کا اپنا تھا سائرہ.....'' انہیں دھچکا لگا۔

''جی بی بی جان مگر رابعہ آپا ان معاملات میں بہت پابندی کرتی ہیں ہنی کا آنا مجبوری تھا مگر مغرب سے پہلے وہ اسے لے گئی تھیں۔''

اس قدر المناک صدمے میں اپنوں سے دور رہ کر جانے بچی کیسے تڑپتی ہوگی۔ ان کے دل کو ہول سا اٹھا تھا مگر وہ مزید کچھ نہ کہہ سکیں.....

''بی بی جان عدت مکمل ہو جائے تو میں ہنی کو یہیں لے آؤں گی بس یہ کچھ مہینے ہیں..... گزر جائیں گے۔'' شازیہ صدیقی کی آواز بھرا گئی۔

سعد ملک اور اس کی والدہ بھی پہنچ گئے تھے کتنا وقت وہ شانی کو سینے سے لگائے تھپکتا رہا مگر اسے وہ لفظ نہ مل سکے جن سے وہ شانی کو حوصلہ دیتا وہ خود اس کرب سے گزر چکا تھا۔ ابو کی وفات پر اسے بھی کسی کی تسلی کسی کے جملے حوصلہ نہ دے سکے تھے۔

''اللہ رب العزت تمہارے دل کو صبر اور سکون عطا کرے۔'' وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا۔

''اتنی اچانک کیا ہوگیا تھا کیا بیمار تھے بھائی صاحب۔'' سعد کی والدہ دریافت کر رہی تھیں۔

''ہارٹ پیشنٹ تو عرصے سے تھے وہ مگر اب تو بظاہر کچھ ہوا بھی نہیں تھا۔ رات ایک بجے تک وہ شانی کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ مجھ سے کافی بنوائی پرسکون نیند سوئے تھے مگر صبح.....!'

جواں بچی کی بیوگی کا دکھ ایسا ان کے دل کو لگا کہ وہ سنبھل ہی نہ پائے۔''

''بچوں کے دکھ تو واقعی انسان کو ادھ موا کر دیتے ہیں اور پھر کم عمری میں بچی کا گھر اجڑ جانا ماں باپ پر قیامت گزر جاتی ہے۔''

''پہلے چھوٹے بھائی اور بھابی پھر اثبار احسن کی حادثاتی موت نے انہیں ادھ موا کر دیا تھا۔ انہی صدموں اور دکھوں نے ان کی جان لے لی۔''

''زندگی اور موت کے آگے انسان بے بس ہے۔ آپ خود کو مضبوط رکھیں کیونکہ بچوں کو تو بس آپ ہی کائنات نظر آتی ہیں۔''

''اپنے بچوں کے لیے ہی مجھے اپنے بکھرے وجود کی دھجیاں سمیٹنی پڑیں..... میرے بچوں کو میرے علاوہ کیا نظر آتا ہے اب اس گھر میں.....'' وہ بے آواز رو دیں۔

''بچوں کی خاطر اپنا درد اندر ہی کہیں دبانا پڑتا ہے جانے والے تو چلے جاتے ہیں مگر ہمارے بچوں کا حوصلہ تو ہم سے ہی ہے۔''

شازیہ صدیقی لب بھینچتے سر ہلانے لگیں۔

☆☆☆

پہلے پھوجی پھر بی بی جان نے بھی رخصت مانگی تو اگلے ہی دن آنی بھی چلی گئیں۔

صحیح معنوں میں گھر کا سونا پن تو اب کاٹنے کو دوڑا تھا اب یہ احساس شدت اختیار کر گیا کہ وہ تہی داماں رہ گئے

ہیں۔

بھلا وہ کب تک سب کو روک سکتے تھے دس دن سب نے گزار لیے کوئی عمر بھر تھوڑا ہی رکتا سب کی اپنی اپنی مجبوریاں تھیں..... بھلا وقت بھی کبھی کسی کے لیے رکا ہے۔

''شانی چل بچے کھانا کھالے.....''

وہ صوفے میں دھنسا جانے کن سوچوں میں ڈوبا تھا۔ جب اماں جانی کی آواز اسے حقیقت میں کھینچ لائی۔

اس نے گہری سانس خارج کر کے گھر کی ویرانی دیکھی۔ من چاہا اماں کو منع کر دے کہ دل نہیں چاہتا کھانے کو..... مگر پھر عمیر اور اماں بھلا وہ کب کھا سکتے تھے۔

''آتا ہوں اماں جانی.....''

اس نے دونوں ہاتھوں سے بھاری ہوتا سر تھاما اور پانچ منٹ بعد وہ ڈائننگ ٹیبل پر تھا اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے اس کی نگاہ ابا جانی کی خالی کرسی پر رکی تو دل بھر آیا اور اس نے بھر آنے والی آنکھوں کو جھکا کر باہر آنے والے سیال مادے کو بمشکل روکا تھا۔

''کالج گیا تھا.....؟''

اتنا گہرا سکوت تھا کہ اسے دم رکتا محسوس ہونے لگا تبھی اس نے عمیر کو ہلکے پھلکے انداز میں مخاطب کیا۔

''ہاں..... تو کیا کریں دنیا کے کام تو نہیں رکتے ناں کمی تو ہماری زندگی میں آئی ہے دنیا کو کیا سروکار.....'' عمیر کا لہجہ بھیگا۔

''یوں ہی لگتا ہے عمیر جب ہماری زندگی میں بہت بڑا خلا آ جائے تو ہمیں دنیا بے حس لگنے لگتی ہے من چاہتا ہے کہ آگ لگا دیں اس دنیا کو جس کے کام ہی نہیں رکتے مگر یار یہ تو نظام قدرت ہے۔ بھلا اس طرح تھوڑا ہی کسی ایک کی وجہ سے دنیا کے کام رکیں گے۔''

''پھر ہمیں ہی صبر آ جائے ہمیں کیوں صبر نہیں آتا۔''

اس نے نوالہ بنا کر واپس پلیٹ میں رکھ دیا اماں اور شانی لب کاٹنے لگے۔

''آ جائے گا یار ہمیں بھی صبر.....''

اسے تو خود علم نہ تھا کہ ابا جانی کی یہ کمی کبھی وہ فراموش کر سکتے ہیں ابھی تو دل ان کے جانے کا یقین کرنے کو ہی تیار نہ تھا۔

''دیکھ ناں شانی ابھی دس دن ہی گزرے ابھی تو ابا جانی کی قبر کی مٹی گیلی ہے اور سب ہمیں اکیلا کر کے چلے گئے۔ ہر شخص کی اپنی مجبوری اپنی مصروفیت ہے لگتا ہے ہر رشتہ ابا جانی سے تھا وہ نہیں رہے تو ہر رشتہ ہم سے منہ موڑنے لگا اور تو اور ہماری اپنی بہنیں جس نے ہمارے لبوں کی خاموشی برداشت نہیں ہوتی تھی آج ہمارے آنسو خشک بھی نہ ہوئے تھے کہ وہ بھی اپنی اپنی مجبوریوں کے ساتھ اپنے گھروں کو چلی گئیں..... ایسے میں ہم کس سے گلہ کریں.....''

عمیر کی باتیں حلق سے نوالہ اترنے نہیں دے رہی تھیں۔

''عمیر میری جان اتنے بدگمان کیوں ہو رہے ہو سب کی ہی مجبوری تھی۔ بی بی جان طوبیٰ کے ایگزام کے باعث نہ رک سکیں تمہاری آنی بیمار رہتیں ہیں اور.....''

''اور اماں افشین کم از کم وہ تو رک سکتی تھی ناں.....''

''ارے وہ تو ملنے آ جاتی ہے روزانہ ہی..... عمیر بچے وہ بھی تو پرائی ہوگئی ہے ہم اس پر اب وہ حق نہیں جما سکتے۔'' اماں جانی نے سمجھایا۔

''اور یوں بھی عمیر ہمیں اب کسی کے سہارے پر نہیں خود اپنی ہمت سے جینا ہے۔ یہ دکھ ہمارا ہے اسے سہہ کر زندگی کو روکنا نہیں آگے بڑھانا ہے جہاں ابا جانی ہمیں دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ تم وقتی سہاروں کے لیے کیوں خود کو کمزور کر رہے ہو..... جب تک ان سہاروں سے امیدیں لگائے رکھیں گے خود کو کمپوز نہیں کر پائیں گے۔

یار ہم کیوں آس لگائیں کسی سے خود ہی جینا کیوں نہ سیکھ لیں۔ ابا جانی ہمارے پاس نہیں رہے اور وہ کبھی لوٹ کر آ بھی نہیں سکتے۔ مگر یار عمیر اماں جانی تو ہمارے پاس ہیں ناں..... ہم کسی اور کی پناہ کی طلب کیوں کریں ماں کا مضبوط سایہ ہے ناں ہمارے پاس ہمیں اماں کی ہمت بننا ہے اور اماں ہمارا سہارا ہیں۔ یہ ہی ہمارا سرکل ہے بس.....''

شانی نے اسے بہت تفصیل سے سمجھایا تھا۔

''سچ کہتا ہے تو رشتہ داری ہو یا دوستی انسان کو اپنی کمزوری نہیں بنانی چاہیے آج کے اس نفسا نفسی کے دور میں اگر کوئی ہمارے دکھ میں شریک ہو جائے یہ بھی غنیمت ہے بھلا ہمارے لیے کوئی اپنے کام چھوڑے کیوں دنیا تیاگ بیٹھے اور پھر ہم بھی تو زندہ ہیں ہمیں لگتا تھا کہ ابا جانی کو کچھ ہوا تو ہم ایک دن نہیں جی سکیں گے مگر دیکھ ہم جی رہے ہیں کھا پی بھی رہے تھے لوگوں سے مل بھی رہے ہیں ساری دنیا داری تو نبھا رہے ہیں۔ پھر ہم کسی اور سے کیا گلہ کریں.....''

''بس میرا بچہ اسی کا نام زندگی ہے.....'' اماں جانی نے اس کا سر تھپکا۔

''ہاں اماں جانی اسی کا نام زندگی ہے۔'' عمیر نے ایک مایوسی سی سانس لی اور اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

☆☆☆

وہ دونوں اپنی اپنی جگہ لیٹے جاگ رہے تھے مگر کمرے میں پھر بھی گہرا سکوت تھا۔

''ابا جانی زندہ تھے تو مجھے ہنی کی اتنی فکر نہ تھی مگر اب اس کا کیا بنے گا محسن.....''

محسن نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے افشین کی طرف رخ موڑا۔ اس کے ذہن کے پردوں پر مہینوں پہلے کی ماموں جانی کی بات جیسے روشن ہوگئی۔

''مجھ سے وعدہ کرو بچے مجھے اگر کچھ ہو جائے تو میرے بچوں کو تنہا نہیں چھوڑو گے ان کے سر پر ہاتھ رکھو گے.....''

''میں نے ماموں جانی سے تب وعدہ کیا تھا افشین جب میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ ہمیں یوں چھوڑ جائیں گے..... میں ان کے بچوں کو تنہا نہیں چھوڑوں گا..... اور افشین جس طرح میرے لیے شانی اور عمیر اہم ہیں ہنی بھی تو ان میں ہی شامل ہے ناں..... ہم دونوں مل کر ماموں جانی سے کیا وعدہ نبھائیں گے.....''

''انشاء اللہ.....'' افشین نے کہا۔

''آپ کو لگتا ہے محسن ہنی زندگی کا سفر دوبارہ شروع کر پائے گی۔''

''ابھی کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوگا وقت کا مرہم زخم بھرے گا تب ہی ہنی خود جو فیصلہ لے گی وہ ہم سب کو منظور

فرمان قائداعظمؒ

''قدرت نے آپ کو ہر نعمت سے نوازا ہے۔ آپ کے پاس لامحدود وسائل موجود ہیں۔ آپ کی ریاست کی بنیادیں مضبوطی سے رکھ دی گئی ہیں۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ نہ صرف اس کی تعمیر کریں بلکہ جلد از جلد اور عمدہ سے عمدہ تعمیر کریں۔ سو آگے بڑھیے اور بڑھتے ہی چلے جایئے۔''

☆☆☆☆

ایک دوسرے پر اعتماد کرو۔ ایک دوسرے سے تعاون کرو۔ اگر پاکستان کو صحیح معنوں میں خوشحال، صحیح معنوں میں متحد اور صحیح معنوں میں طاقت ور بنانے کے لئے ضرورت پڑے تو دن رات کام کرو، دن کو بھی اور رات کو بھی، دوگنی تگنی محنت کرو۔ (کراچی کلب، 19 اگست 1947)

☆☆☆☆

صحافت قوم کی ترقی و بہبود کے لئے اشد ضروری ہے کیونکہ اس ہی کے ذریعے زندگی کے تمام شعبوں میں سرگرمیوں کو بڑھانے کے لئے قوم کی رہنمائی اور رائے عامہ کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی تمام قوموں سے انتہائی دوستانہ روابط پر مبنی ہوگی۔ ہم ساری دنیا کے لئے امن وسکون کے علم بردار ہیں، جہاں کہیں اور جس حد تک ہمارے بس میں ہوگا، ہم اس سلسلے میں پورا حق ادا کریں گے۔

(نئی دلی: پریس کانفرنس سے خطاب، جولائی 1947ء)

ہوگا۔'' محسن نے کہا۔

''عورت کبھی بھی اس معاملے میں سخت دل نہیں ہوتی وہ اپنے شوہر کی رفاقت اور محبت کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ بھلا ہنی کیسے اثبار بھائی کے علاوہ کسی اور.....'' وہ خود ہی جھرجھری لے کر چپ ہوگئی۔

''تم خوامخواہ ہی خود کو الجھا رہی ہو افشین زندگی ہنی کی ہے اور فیصلہ بھی اسی کا ہوگا۔ ہم اس پر زبردستی تو کچھ نہیں مسلط کریں گے.....''

ابھی تو مجھے یہ سمجھ نہیں آرہی ہے کہ اب ممانی جانی بھی اس سے ملنے نہیں جاسکتیں..... ہم ویسے ہی اس سے نہیں مل سکتے وہ تو بہت تنہا ہو کر رہ گئی ہے.....''

''کاش ہم اسے گھر لا سکتے ناں محسن.....'' اس نے کہا۔

''کچھ چیزوں پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا افشین۔'' اس نے گویا بات سمیٹ کر ختم کر دی۔

افشین کئی لمحے خاموش لیٹی چھت کو گھورتی رہی پھر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

''لوگ اتنے بے حس بھی ہو سکتے ہیں حسن مجھے یقین نہیں ہوتا..... ابا جانی سے اتنے سالوں کی رفاقت تھی فاروقی صاحب کی انہوں نے کسی بھی بات کا لحاظ نہ کیا اور ہمارے درد کو یوں کیش کر کے چلے گئے.....''

بینک کی ڈیٹیل اس کے سامنے تھی۔ اس نے ارجنٹ میٹنگ کال کی تھی اور میٹنگ میں جو انکشافات اس کے

سامنے آئے تھے وہ اس کی دنیا ہلا گئے تھے۔

''سر صدیقی صاحب تو آنکھیں بند کر کے فاروقی صاحب پر بھروسہ کرتے تھے وہ جہاں کہتے بنا دیکھے سائن کر دیتے تھے۔ میں نے کبھی انہیں پیپرز ریڈ کرتے نہیں دیکھا اور ان کے اسی اعتماد کو سیڑھی بنایا ہے فاروقی صاحب نے.....''

''حسن! تم مجھے انفارم تو کرتے یار.....''

''سر میں نے آپ کو کئی بار کال کی اور بتایا بھی تھا کہ فاروقی صاحب آفس نہیں آ رہے ہیں.....''

''ہاں مگر انہوں نے مجھے کہا تھا کہ وہ لیو پر ہیں بیمار ہیں.....''

'اور سر کل وہ آؤٹ آف کنٹری جا چکے ہیں.....'' ذیشان احمد صدیقی کا سر گھومنے لگا تھا۔

''سر شاید آپ کو پتہ نہیں ہے کہ فاروقی صاحب شاہ نواز ہمدانی فورٹی پرسنٹ کے پارٹنر ہیں.....''

''کیا.....؟''

''کیا یہ بات ابا جانی کی نالج میں تھی۔''

''معلوم نہیں ہے سر.....مگر یہ بات تو دعویٰ سے کی جا سکتی ہے فاروقی بنا ہمدانی کی مدد کے اتنا بڑا کام نہیں کر سکتا۔''

وہ جو محض چالیس لاکھ کے لاس کو لے کر اتنا پریشان تھا۔ اس کی چند دنوں کی غیر موجودگی ان کے غم اور دکھ کا فائدہ اٹھا کر فاروقی اسے کروڑوں کا گھپلا کر گیا تھا۔

''اور سر یہ سب ملی بھگت ہے نا صرف ہمارا کانٹریکٹ کینسل ہوا ہے بلکہ ہمیں جو کانٹریکٹ ملنے کے امکان ننانوے فیصد تھے وہ سب اب شاہ نواز ہمدانی کی کمپنی کو ملے ہیں تمام اور.....''

شانی کی حماقت دیکھ کر حسن خاموش ہو گیا۔

وہ سکرین پر نگاہ جمائے جانے پھر کیا دیکھنے لگا تھا کہ یکدم اس کا سر چکرایا۔

''سر آر یو فائن.....'' حسن گھبرا گیا۔

''ہوں.....''

کئی منٹ کے بعد اس کی آواز آئی جس کمپنی کے لیے اس کے ابا جانی نے اپنی تمام عمر لگا دی.....آج اس کمپنی کی ساکھ اور وقار کو بہت بڑا دھچکا لگا تھا۔

کاش فاروقی ایک بار اس کے سامنے آ جائے تو وہ اس کا گلا دبا دے گا.....

اگر ابا جانی حیات ہوتے تو فاروقی کا یہ روپ دیکھ کر ان پر کیا بیتتی.....حقیقت یہ تھی یقین اسے بھی نہیں آ رہا تھا مگر بینک سے جو تفصیلات ملی تھیں اور پھر اس نے تمام فائلز اچھے سے چیک کیں تھیں.....

فاروقی نے اتنی صفائی سے سب کیا تھا کہ پیچھے کوئی پروف بھی نہ چھوڑا.....

☆☆☆

''رابعہ میرا تو کلیجہ ہی پھٹ گیا تمہاری بہو کے دکھ پر پہلے سہاگ اور اب باپ سے کہیں بڑھ کر تایا بھی جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ جانے کس ظالم کی نظر لگ گئی تمہارے گھر کو کہ خوشیاں ہی روٹھ گئیں.....''

بظاہر وہ بہنی کا سر تھپک کر غمگین لہجے میں کہہ رہی تھیں مگر ان کی شاکی نگاہیں اریشہ کا پوسٹ مارٹم کر رہی تھیں۔

''میرے رب کی مرضی باجی ہم تو بے بس ہیں ہم کبھی بھی اس کی مصلحت نہیں سمجھ سکتے۔''
رابعہ بیگم نے نم لہجے میں کہا۔
''ہاں یہ تو سچ ہے رابعہ مگر اس وقت بچی کا دل کن کیفیات سے گزر رہا ہوگا شوہر نہ رہا تو سسرال سے رشتہ ختم ماں باپ پہلے ہی چل بسے تھے اب تایا بھی نہ رہے صرف تائی اور ان کے بچے ہیں وہ بھی جواں جہان بھلا یہ معصوم زندگی کیسے بسر کرے گی۔ زمانہ بہت برا ہے آج کل تو سگے بہن بھائی آنکھیں پھیر لیتے ہیں بھلا چچا تایا کے بچوں سے کیا امید.....''
رابعہ بیگم بہن کو دیکھ کر رہ گئیں جن کے لبوں سے ہمدردی کے لفظ بھی ایسے ادا ہو رہے تھے کہ دل پھٹ جائے۔
''اس گھر پر ہنی کا حق ہمیشہ رہے گا۔ خالہ امی..... بے شک اثبار نہیں رہے مگر اس گھر کے ہر فرد سے ہنی کا رشتہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔''
اریشہ کے لہجے میں ان کے لیے ترشی تھی۔
''اے بہو جو بات سہاگن کی ہوتی ہے وہ شوہر کے بعد نہیں رہتی اور پھر بھری جوانی کی بیوگی ہے..... تم کس کس کے منہ بند کرو گی۔''
''کیا مقصد ہے آپ کا خالہ امی.....''
''نادان نہیں ہو تم..... ابرار کی موجودگی میں ہنی کا یہاں رہنا مانو برادری کو خود آواز دینا ہے تم مارنے والے کا منہ ہاتھ روک سکتی ہو بولنے والی کی زبان نہیں۔''
ان کی باتیں ہنی کی برداشت سے باہر تھیں وہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی رابعہ تاسف سے بہن کو دیکھنے لگیں۔ جن کی زبان کے نشتر ان کے کلیجے چھلنی کر رہے تھے۔
''ابرار ہنی کو ارم اور کرن کی طرح بہن سمجھتے ہیں۔'' اریشہ چیخ گئی۔
''دلوں کے حال اللہ جانتا ہے بی بی دنیا والے نہیں مانتے تم مجھے خاموش کرا بھی لو تو سب کو کیسے چپ کراؤ گی.....''
''عدت مکمل کرتے ہی وہ آشیانہ چلی جائے گی باجی ہم کس حق سے روک سکتے ہیں اب اسے اس کی مرضی ہو گی جو چاہے فیصلہ کرے.....''
''وہاں کون سا یہ مشکل نہ ہوگی وہاں دو دو جوان کزنز ہیں اس کے..... سچ کہوں رابعہ ہنی کے لیے واقعی زندگی کٹھن ہوگئی ہے.....'' اریشہ اور امی لب بھینچ گئیں۔
اپنی بہن کی چلتی زبان کو روکنا ان کے لیے ممکن کب تھا۔ سو وہ خود ہی خاموش ہوگئیں.....

☆☆☆

''اب پھر کراچی خیر ہے تم روز ہی نہیں جانے لگے۔''
''تمہیں کیا جلن ہے تم نے بھی جانا ہے کیا.....؟'' سعد نے اسے دیکھا۔
''پہلے بتاؤ کتنے دن کے لیے جاؤ گے.....''
''صرف دو دن کے لیے.....'' سعد نے بتایا وہ منہ بنانے لگی۔
''تم چاہو تو رک سکتی ہو.....''
''رئیلی.....''

وہ خوش ہوگئی مگر اگلے لمحے اس کی خوشی کافور ہوگئی۔
''امی کو کون منائے گا.....''
''ہوں سوچا جا سکتا ہے میری پیاری بہن مگر تمہیں تو پتہ ہے ہمارے وطن عزیز میں بنا رشوت کوئی کام نہیں ہوتا.....''
''تو.....''
''مجھے اچھی سی چائے پلا دو باقی کام میرا.....''
''اف توبہ تم چائے کا نشہ کرتے ہو..... زہر لگتی ہے مجھے تمہاری ہر وقت چائے پینے کی عادت.....'' وہ بڑبڑاتی ہوئی مڑی۔
''اللہ کرے تمہیں ایسا شوہر ملے جسے میری طرح چائے کا نشہ ہو.....''
''اف توبہ کیسے بھائی ہو بددعائیں دے رہے ہو.....'' وہ کانوں پر ہاتھ رکھتی پلٹی تھی۔
سعد ہنس دیا تو وہ منہ بناتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

''اماں جانی شانی نہیں آیا اب تک.....''
افشین کو آئے بھی دو گھنٹے گزر چکے تھے مگر اب تک وہ آفس سے نہیں لوٹا تھا۔
''لیٹ ہی آرہا ہے اکثر'' اماں بولیں۔
''جانے کیوں مجھے شانی بہت پریشان سا لگتا ہے.....''
''اماں یکدم دو اتنے بڑے صدمے اور پھر سارا بزنس اس کی اکیلی جان پھر بھی اس کی ہمت دیکھئے کس ضبط سے وہ سب ہینڈل کر رہا ہے۔''
افشین نے کہا تبھی وہ سلام کرتا اندر داخل ہوا تھا۔
''بڑی لمبی عمر ہے ابھی ہم تجھے ہی یاد کر رہے تھے۔'' سلام کا جواب دیتی افشین خوش دلی سے بولی تھی۔
وہ محض مسکرا کر اماں کے پاس آ بیٹھا۔
''کب آئیں تم.....؟''
''کافی دیر ہوگئی ہے خیریت ہے تم لیٹ آئے ہو.....''
''ہوں بس کچھ مصروفیت سی ہے.....''
''محسن نہیں آیا.....''
''آتے ہوں گے مجھے لینے آئیں گے.....'' اماں جانی انہیں باتیں کرتا دیکھ اٹھ گئیں۔
''میں کھانا لگواتی ہوں میرے بچے کو بھوک لگی ہوگی۔''
''عمیر نہیں آیا اماں جانی.....''
''ابھی اوپر کمرے میں گیا ہے سمسٹرز کی تیاری کر رہا ہے۔ آج کل اسی میں بزی ہے.....''
''اچھا ہے وہ بزی ہی رہے ورنہ تو بہت اداس رہتا ہے.....'' وہ بولا۔
''اچھا میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں۔''

وہ افشین کو کہتا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ فریش ہو کر آیا تو محسن بھی آ چکا تھا۔ سب کھانے پر اس کے ہی منتظر تھے۔

''کیسا ہے محسن.....؟''

''ٹھیک ہوں تم سناؤ.....''

''بس ایوری تھنگ از فائن.....''

''اور ئیلی.....''

محسن کی بات پر وہ چونکا تھا پھر نگاہ سے اسے چپ رہنے کا عندیہ دیا کھانے کے بعد وہ اور محسن لان میں آ گئے۔

''فاروقی نے اتنا بڑا غبن کر دیا اور مجھے یہ بات دوسروں سے پتہ چلی ہے شانی.....''

''حقیقت کہوں تو مجھے شاید ابھی خود کو ہی یقین دلانے کی ضرورت ہے..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا.....''

محسن نے اس کے چہرے پر پریشانی واضح دیکھی۔

''ایسے تو بہت جلد دیوالیہ ہو جائیں گے محسن..... کیونکہ لاس جو ہوا سو ہوا ہمدانی اور فاروقی نے مل کر تو بزنس کمیونٹی میں ہماری ساکھ ہی خراب کر دی ہے۔ جان بوجھ کر میٹریل بدل کر پراڈکٹ میں گڑبڑ خود فاروقی نے کرائی تھی اور جب میں نے نئے سرے سے تمام پراڈکٹ اپنی نگرانی میں دوبارہ سے کام شروع کیا تو ابا جانی..... بس میں اتنے دن جا ہی نہ سکا اور اس چیز کا بھرپور فائدہ اٹھایا ہے فاروقی نے..... ابا جانی سے جانے کب کب اس نے فائلز پر سائن کرائے ہوں گے بھلا انہیں تو اندھا اعتماد تھا ان پر..... اور سب کچھ لے کر آسٹریلیا چلا گیا..... میں شاکڈ ہوں محسن..... میں اماں جانی اور عمیر کو ابھی کچھ بھی نہیں بتانا چاہتا یار.....''

محسن کی سوچتی نگاہیں اس پر تھیں شانی کی پریشانی جائز تھی وہ تو خود بری طرح ہل گیا تھا یہ سب تفصیل سن کر.....

☆☆☆

''حقیقتاً تمہارے دکھ اور پریشانی کی گہرائی کا اندازہ لگانا ناممکن ہے مگر ڈیئر ذیشان یہ دنیا ہے ناں یہاں بے حسی خودغرضی اور مفاد پرستی بہت عام ہو چکی ہے۔ خاص کر اسے خطے پر جہاں بدقسمتی سے ہم رہتے ہیں۔ فاروقی پر مجھے کئی بار شک گزرا اور میں نے تم سے اظہار بھی کیا مگر وہ اتنا بڑا دھوکے باز ہو گا یہ میرے بھی گمان میں نہ تھا..... ایسی نمک حرامی کی توقع شاید اس سے کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ برسوں جن کا نمک کھاتا رہا انہیں ہی لوٹ کر چلا گیا.....''

''کاش سعد میرے پاس کوئی پروف ہوتا فاروقی تو چلا گیا مگر اس کے ساتھ ہر غبن میں برابر کا حصے دار شاہ نواز ہمدانی تو یہیں ہے..... میرا بس چلے تو میں.....'' شانی کے لب بھینچ گئے۔

''مگر لاچاری بھی یہ ہی ہے کہ تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اور بنا کسی ٹھوس ثبوت کے تم شاہ نواز ہمدانی جیسے بڑے نام پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے..... اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے.....'' سعد نے کہا۔

''شاہ نواز ہمدانی وہ شخص ہے جو بنا مطلب کے کبھی تعلقات نہیں بناتا..... وہ ایسا کوئی تعلق استوار نہیں کرتا جس میں اسے فائدہ نہ ہو..... فاروقی کے ساتھ مل کر اس نے صدیقی گروپ آف کمپنی کی نام اور ساکھ کو اور اتنا ٹھیس پہنچائی ہے وہ بزنس ورلڈ کا بے تاج بادشاہ بننا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے کسی حد تک بھی جا سکتا ہے ذیشان.....''

''آئی کانٹ انڈر سٹینڈ کہ اب میں کیا کروں مجھے تو جیسے نئے سرے سے ہی آغاز کرنا ہوگا سعد ملک..... میرے لیے یہ بہت مشکل ہے یار شاید میں خود کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں کر پا رہا تھا..... ابا جانی کی ڈیتھ کے بعد یہ دھچکا مجھے سنبھلنے کے لیے وقت درکار ہے بہت تنہا ہوگیا ہوں میں.....''

''بی ریلیکس یار یہ کاروبار ہے اور بزنس میں یہ سب ہوتا رہتا ہے۔ اسی نفع نقصان کا نام ہی شاید بزنس ہے..... فاروقی تمہیں سبق دے گیا ہے کہ کبھی بھی کسی پر ضرورت سے زیادہ اعتماد نہ کرو..... تم ذہین ہو باہمت ہو اور تمہاری شخصیت کا اعتماد تمہاری سب سے بڑی خوبی ہے..... انشاء اللہ اچھا وقت نہیں رہا تو پھر یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ ہمت اور حوصلے کو سلامت رکھو.....''

''تھینکس سعد تم نے واقعی میرا حوصلہ بڑھایا ہے.....''

وہ مشکور تھا سعد ملک کا جس کی امیوشنل سپورٹ نے اس پر خاصا مثبت اثر ڈالا تھا۔

☆☆☆

''عمیر تم بالکل بھی پہلے جیسے نہیں رہے کچھ تو بولو جب سے آئے ہو یوں ہی اداس بیٹھو ہو.....''

شاداب ملک کب سے اس کے ساتھ تھی وہ بے حد چپ تھا۔

''ہنسنا بولنا تو ایک خواب ہی ہوگیا ہے وینی ابا جانی کے بعد ہر خوشی جیسے فریب لگتی ہے.....''

''مجھے اندازہ ہے عمیر باپ کے سائے اور شفقت سے محروم ہو کر زندگی کیسی ہو جاتی ہے۔ مگر مائی ڈیئر فرینڈ ہمیں خود سے وابستہ لوگوں کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ہنسنا بھی پڑتا ہے دل نہ چاہے پھر بھی بولنا بھی پڑتا ہے۔'' عمیر نے جواباً اسے کچھ نہیں کہا۔

''میں صرف تمہارے لیے آئی ہوں کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ ایسے وقت میں انسان دوستوں کی کمی محسوس کرتا ہے انہیں دوستوں کی ضرورت انہی گھڑیوں میں شدت سے محسوس ہوتی ہے۔'' شاداب نے اس کے کندھے پر ہاتھ دھرا۔

''میرے گھر چلو گی اماں جانی کو تم سے مل کر خوشی ہوگی۔ عمیر کتنی دیر خاموش رہا اور جب بولا تو وینی اسے دیکھنے لگی۔

''ابھی.....''

''ہوں میں تمہیں واپس چھوڑ دوں گا۔''

''اوکے چلو.....''

وہ فوراً مان گئی پہلی بار اس نے عمیر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھی تھی۔

وہ عمیر کے ساتھ آشیانہ پہلی بار آئی تھی اور وسیع رقبے پر پھیلے اس محل نما گھر کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''واؤ عمیر تمہارا گھر بہت خوبصورت ہے۔''

''ہاں رہنے والے بھی بہت خوبصورت ہیں شاداب ملک بس حالات کے مارے ہیں.....''

تلخ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے وہ وینی کو اپنے ہمراہ لے کر اندر آیا تھا جہاں امان جانی حسب معمول تنہا بیٹھی تھیں۔ وینی نے انہیں ادب سے سلام کیا تھا جواباً انہوں نے بہت پیار سے اسے ساتھ لگا کر جواب دیا۔

عمیر کی اماں کس قدر نفیس خاتون تھیں ان کے چہرے پر عجب سا نور تھا۔

''اماں یہ شاداب ہے میں نے آپ کو بتایا تھا ناں میری دوست ملتان سے آئی ہے.....''

شہادت امام حسینؓ

ماہ محرم اپنے تمام تر سوگ اور دکھ کے ساتھ دھیرے دھیرے زمین کا رخ کر رہا ہے..... کیا لکھوں قلم ٹھہر گیا ہے..... لفظ قلم سے قرطاس تک کے فاصلے میں ہی کہیں چپ سادھے کھڑے ہیں..... اپنے آباؤ اجداد کے عزیز نہیں ہوتے..... مگر یہ جو مجھے عزیز ہیں ناں..... یہ تو سب کو عزیز ہیں..... کربلا کے بعد بچتے ہی دو نظریے ہیں..... ایک حسینی اور ایک یزیدی..... تیسرا نظریہ تو کوئی ہے ہی نہیں..... ان ایام غم میں اگر ہم یزیدی فعل پہ دکھی ہیں تو ہم حسینیؓ ہیں اور اگر چپ ہیں تو پھر یزیدی ہیں کیونکہ قرآن کے فیصلے کے مطابق کسی کے ظلم پہ چپ رہنے والا بھی ظالم کا مددگار ہے..... اور پھر حسینؓ ہے کون..... کسی خاص ٹولے یا گروہ کا رہبر..... کسی خاص علاقے کا بادشاہ..... کسی خاص طبقے کا رہنما ہرگز نہیں یہ تو وہ شخصیت ہے جو ہر باضمیر شخص کا ضمیر ہے۔ جسے میرا رسولؐ کہے..... یہ مجھ سے ہے، میں اس سے ہوں جسے رسولؐ کہے یہ جنت کے جوانوں کا سردار ہے..... جسے رسولؐ کہے حسینؓ تیری مثال کشتی نوحؑ کی سی ہے۔ جو اس پہ سوار ہو گیا۔ وہ ہلاکت سے بچ گیا..... جسے رسولؐ کہے حسینؓ تو میرے دین کا محافظ ہے..... واہ حسینؓ تو وہ عظیم رہبر ہے جس نے انسانیت کو جینے کا ڈھنگ اور آئین زندگی دیا، جس نے قوموں کو شعور وادارک وآگہی دی..... سلام میرے موسیٰ آپؓ پر آپؓ کے اصحاب پر آپؓ کے اقربا پر آپؓ کے جانثاروں پر..... آپؓ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کی محنت ضائع ہونے سے بچالی..... آپؓ نے اپنا اکبرؓ دے دیا..... اسلام بچالیا..... اپنا قاسمؓ دے دیا..... اسلام بچالیا، اپنا اصغرؓ دے دیا..... اسلام بچالیا..... اپنے عونؓ و محمدؓ دے دیئے..... اسلام بچالیا..... اپنا جری سپہ سالار دے دیا..... اسلام بچالیا اپنی بہنوں کی چادریں دے دیں اسلام کو بے ردا نہ ہونے دیا..... واہ حسینؓ..... تو کامیاب ٹھہرا..... تو عظیم باپ کا عظیم بیٹا تھا..... تو عظیم، تیرا بھائی عظیم، تیری بہنیں عظیم، تیرا نانا عظیم، تیرا دادا عظیم، اور تیری ماں وہ تو تھی ہی تمام عظمتوں کی وارث..... میرے ماں باپ قربان آپؓ پر آپؓ نے وہ کام کیا جس پر انبیاء بھی ششدر رہ گئے.....

(انتخاب: محمد خاور حسین، کراچی)

''اوا چھا سعد کی بہن ہو تم بیٹا.....''
''جی آنٹی.....''
وہ ہولے سے مسکرائی آنٹی کتنی دیر اس کے پاس بیٹھ کر حال احوال لیتی رہیں سب کا پوچھا۔
''اچھا یہ بتاؤ کیا کھاؤ گی.....''
''کچھ بھی نہیں آنٹی میں تو صرف آپ سے ملنے آئی تھی۔''
''ایسا کیسے ممکن ہے پہلی بار آئی ہو بنا کچھ کھائے تو ہرگز نہیں جانے دوں گی۔''
وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں ان کا پرشفیق چہرہ کتنا خوبصورت لگ رہا تھا ان کی شخصیت میں وقار تھا۔ وہ کافی دیر ان کے ساتھ گپ شپ لگاتی رہیں۔
''عمیر اب مجھے چھوڑ آؤ پلیز.....''
''ابو یں ڈنر کے بعد جانا.....''
''ناممکن تم پلیز ضد نہ کرو.....'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔
شازیہ صدیقی نے بھی روکنا چاہا تھا مگر وہ نہیں مان رہی تھی۔
''السلام علیکم.....'' خلاف معمول شانی جلدی گھر آیا تھا۔
''وعلیکم السلام.....''
اماں جانی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور وہ جو جس کی بس اچانک ہی نگاہ اٹھی تھی پھر گویا پلٹنا بھول گئی.....
یہ چہرہ اس کے لیے انجان نہیں تھا سالوں سے ہزاروں بار ذہن کے پردوں پر یہ شبیہ وہ بنا چکی تھی۔
بلیک سوٹ میں شہزادوں جیسی آن بان رکھنے والا وجاہت و خوبصورتی میں یکتا۔ اس کے گہرے سنہرے بال اس کی شخصیت کی دلکشی کو بڑھا رہے تھے۔
کاش روحہ یہاں ہوتی وہ ضرور اسے کہتی کہ روحہ مجھے چٹکی کاٹو کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔
''شانی یہ میری بیسٹ فرینڈ مس شاوانہ ملک .....'' عمیر کی چہکتی آواز نے اس کے وجود میں حرکت پیدا کی تھی۔ بمشکل اس کے گلے سے اسلام علیکم برآمد ہوا تھا..... مگر اسے جس روکھے پھیکے انداز میں جواب ملا تھا وہ ساری اس کی خوشی کافور کر گیا..... عمیر اور آنٹی کے روکنے کے باوجود وہ مزید نہ رکی کیونکہ جلد از جلد روحہ سے بات کرنا چاہتی تھی اور اس نے آتے ہی پہلا کام یہ ہی کیا تھا۔
''میں خوشی سے پاگل ہو رہی ہوں روحہ.....''
''بنا سلام دعا کے تم جس طرح شروع ہوئی مجھے قطعی شک نہیں کرنا چاہیے کہ تم واقعی پاگل ہوگئی ہو۔''
''مگر اس پاگل پن کی وجہ مائی ڈیئر لٹل سسٹر.....''
''بی کوز میں آج تم سے شرط جیت گئی ہوں آئیڈیل حقیقت میں بھی ہوتے ہیں۔ میں نے آج اپنی آنکھوں ان فیکٹ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے روحہ جو دن رات میرے خوابوں میں رہتا تھا وہ حقیقت ہے روحہ میں نے اسے پالیا ہے.....''
''ویٹی ڈیئر تم نے اسے دیکھا ہوگا اس بات پر میں یقین کر لیتی ہوں مگر تم نے اسے پالیا دس از امپوسبل.....''
روحہ بھلا کہاں اس کی خوشی کو برقرار رہنے دیتی۔ دھڑ سے پھر اسے حقیقت میں لا پٹخا۔

''دیکھ لیا ہے ناں اب پانا کب مشکل ہے۔''

''فار گاڈ سیک وینی تم 2017ء میں جی رہی ہو۔ ہم آئیڈیل بنا سکتے ہیں ضروری نہیں کہ تم بھی اس کی آئیڈیل ہو..... تم کیوں سچ سننا نہیں چاہتی ہو..... ویسے بائی دے وے وہ ہے کون۔''

اس کی ساری مسرت کو خاک میں ملا کر روحہ پوچھ رہی تھی۔

''پتہ نہیں.....'' وہ منہ بناتی ہوئی بولی۔

''اوکے بیسٹ آف لک..... بٹ پھر بھی وینی اگر تمہارے خواب حقیقت نہ ہوں تو دل چھوٹا نہیں کرنا۔''

''اوکے.....'' اس نے از حد مایوسی سے فون بند کیا تھا۔

☆☆☆

''شکر ہے اماں جانی کسی کو تو یاد آیا کہ میں زندہ ہوں ورنہ اثبار کے ساتھ ساتھ مجھے بھی جیسے مار دیا ہے سب نے.....''

''ایسے مت کہو میری بچی کیا تم نہیں جانتیں میری مجبوری.....'' اماں تڑپ کر بولیں۔

''آپ نہیں آسکتیں شانی اور عمیر.....''

''وہ کیسے آسکتے ہیں تم تو سب سے واقف ہو وگرنہ تمہارے بھائی تو بہت تڑپتے ہیں۔''

''کچھ دیر کے لیے ارید سے ہی ملنے آجایا کریں اماں وہ اپنے بابا کو بہت مس کرتا ہے۔ عمیر کے ساتھ کچھ وقت بہل جائے گا آپ کو پتہ ہے ناں وہ اثبار کے بعد عمیر سے ہی اٹیچ ہے۔''

''ہوں مگر ہنی عمیر کی تو جیسے سدھ بدھ ہی کھو گئی ہے۔ میں اور شانی اتنی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ سنبھل جائے پھر سے زندگی کی طرف لوٹے.....''

''مجھے افشین بتا رہی تھی کہ عمیر بہت مایوس ہو گیا ہے ہر بات کو بہت شدت سے محسوس کرتا ہے..... وہ سب سے چھوٹا ہے ناں اماں پھر ابا جانی کا لاڈلا بھی تو بہت تھا۔''

''اللہ کی ذات صبر عطا کرنے والی ہے ہنی وقت کے ساتھ ساتھ عمیر بھی سمجھ جائے گا۔''

''اماں کیا میں شانی اور عمیر سے فون پر بھی بات نہیں کر سکتی.....''

اس کے لہجے میں کتنی آس تھی اماں کا دل پسیج گیا۔ ان کی نگاہیں بے اختیار سامنے صوفے پر بیٹھے شانی پر اٹھیں۔ شانی نے مفہوم سمجھ کر بھی نظر انداز کر دیا۔ وہ بے بس ہو گئیں۔

''وہ آئیں گے تو میں تمہاری بات ضرور کروں گی.....''

اماں جانی نے کہا کچھ دیر بات کر کے انہوں نے فون رکھ دیا۔

''تم اس کی خیریت دریافت کر لیتے تو کون سی قیامت آجاتی۔''

'جب میں اس کے لیے نامحرم ہوں تو میری آواز بھی تو اس کے لیے نامحرم ہوئی ناں۔'' وہ تاسف سے بولا۔

''یہ اس کی ساس نے کہا ہے اسے کیوں سزا دے رہے ہو.....''

''کچھ دن مزید رہ گئے ہیں اماں جان پھر میں اسے یہیں لے آؤں گا۔''

شازیہ صدیقی نے گہری سانس خارج کی وقت کی رفتار کا اندازہ لگانا کتنا مشکل امر ہے کبھی کبھی کیسے ٹھہر جاتا اور کبھی ہوا سے بھی تیز چار ماہ بیت گئے تھے۔ اثبار احسن کو..... کچھ دن بعد ہنی کی عدت مکمل ہونے والی تھی۔

''میں تو جانہیں سکوں گی شانی.....''
ان کے لہجے میں دکھ تھا وہ خود بھی تو عدت میں تھیں۔
''محسن اور تمہاری پھوجی تمہارے ساتھ چلے جائیں گے.....''
''اور افشین وہ نہیں جائے گی۔''
''وہ بھی چلے جائے گی.....''
وہ جھٹ بولیں مبادا وہ غصے میں ہی نہ آجائے۔ شانی خاموش ہوگیا..... اماں جانی نے بھی مزید بات نہیں کی۔
''عمیر کہاں ہے.....''
''وینی کے ساتھ ہی ہوگا۔''
اماں کی بات پر وہ فقط سر ہلا پایا تھا۔

☆☆☆

''آج چاند کی چاندی کچھ مدھم ہے ناں.....''
وہ کچھ شرارت سے افشین کو دیکھ کر مخاطب ہوا جواباً افشین نے گردن موڑ کر ایک خاموش مگر خفگی بھری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔
''کیوں خفا ہو۔''
محسن باقاعدہ اس کی طرف متوجہ تھا۔ پریشانی سے اس کا اترا چہرہ دیکھا۔
''مجھے اماں جانی یاد آرہی ہیں۔''
لبالب پانیوں سے بھری آنکھیں گویا محسن سے فریاد کررہی تھیں۔
''بس اتنی سی بات مجھے کہہ دیتیں میں تمہیں ان سے ملوالاتا یار اس میں رونے کی کیا بات ہے۔''
''اماں جانی کی تنہائی کا خیال آتا ہے ناں دل چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ کر ان کے پاس چلی جاؤں مگر آپ تو مجھے ایک دن بھی نہیں رہنے دیتے۔ میرے بھائی اور اماں کتنے مشکل وقت سے گزر رہے ہیں مگر.....''
وہ آنکھیں ہتھیلیوں سے رگڑنے لگی۔
''اتنی حساس کیوں ہو رہی ہو افشین..... یونو صرف تمہاری طبیعت کے باعث ہی میں تمہیں وہاں نہیں چھوڑتا..... ممانی جان پھر تمہاری وجہ سے الگ فکر مند رہیں گی۔''
''اور عمیر جو ہزار دفعہ گلے کر کے میرا دل دکھاتا ہے وہ.....''
''وہ نادان ہے کم از کم تم تو سمجھدار ہو ناں امی اور بھابی تمہیں لے کر بہت حساس ہیں ان کی فیلنگز کو میں ہرٹ نہیں کرسکتا.....''
''مگر کیا اس کڑے وقت میں میرا فرض نہیں بنتا کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔''
اس نے شکوہ بھری نگاہ مجازی خدا پر ڈالی۔
''آف کورس بنتا ہے مگر..... او کے فائن میں روز صبح تمہیں وہاں چھوڑ دیا کروں گا اور واپسی پر پک کرلوں گا تم سارا دن آرام سے وہاں گزارنا.....''
افشین جانے کیوں چپ ہوگئی بحث بے کار تھی۔

''او کے جیسے آپ کی مرضی.....''

وہ جیسے بحث سمیٹتی کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ محسن کافی دیر دیکھتا رہا شاید وہ جان گیا تھا افشین کی ناراضگی اب بھی برقرار ہے۔

اگر افشین کی جگہ وہ ہوتا شاید اس کے بھی یہ ہی احساسات ہوتے وہ خود تو تقریباً روزانہ ہی آشیانہ کا چکر لگاتا تھا۔ ممانی جان اور عمیر سے ملتا اور شانی سے بھی ہر تیسرے دن آفس میں جا کر مل آتا تھا وہ کوشش کر رہا تھا کہ ماموں جانی سے کیا وعدہ نبھائے..... پھر شانی جن کرائسس میں تھا ایسے میں اسے بہت سپورٹ درکار تھی۔

مگر افشین ہفتے میں ایک بار ہی چند گھنٹوں کے لیے جا پاتی تھی۔ اسی طرح وہ بنی سے ملنے جاتی تھی۔

''اچھا میری جان میں تمہیں صبح آشیانہ چھوڑ دوں گا۔ تم جتنے دن خوشی سے رہنا چاہو..... میں خود امی اور لبنیٰ بھابی سے بھی بات کرلوں گا..... بس..... اب تو ناراضگی ختم کر دو.....''

کندھے سے تھام کر اس نے افشین کا رخ اپنی طرف کیا تو اس کے چہرے کی مسکراہٹ دیکھ کر محسن شانت ہو گیا۔

☆☆☆

ایک شاک اسے خوشی سے لگا تھا جب اس نے اپنے خوابوں کے شہزادے کو حقیقت میں دیکھا تھا..... مگر اس وقت جو شدید ترین جھٹکا اسے لگا تھا وہ فاخرہ آنٹی کی بھانجی کو دیکھ کر لگا تھا مگر یہ قطعی خوشی کا جھٹکا نہیں تھا۔ آنٹی اسے اپنی بھانجی سے ملوانے لائیں تھیں جن کے شوہر کی ڈیتھ ہو گئی تھی اور آج ان کی عدت مکمل ہوئی تھی۔ بنی کا چہرہ دیکھ کر وہ جیسے گومگوں کی حالت میں تھی یہ چہرہ تو ہزاروں لاکھوں میں بھی وہ پہچان سکتی تھی کتنے سال سے دن رات اس کے بھائی کی نیندیں، سکون سب کچھ اسی چہرے سے وابستہ تھا.....

سعد ملک کے والٹ میں برسوں سے وہ بنی کا چہرہ دیکھتی آئی تھی مگر آج اسے علم ہوا تھا کہ سعد ملک جو ان چند مہینوں میں بکھر کر رہ گیا تھا اس کی وجہ کیا تھی وہ کیسے اس دن وینی کے ساتھ تلخ ہو گیا تھا۔ اس لمحے نہ صرف بنی بلکہ سعد کے دکھ کا احساس بھی اسے شدت سے ہوا تھا۔ من رونے کو چاہ رہا تھا۔ مگر یہاں اتنے لوگوں کے بیچ شاید ممکن نہ تھا۔ لیکن واپس جاتے ہی فریال سے لپٹ کر جانے کیوں وہ کافی دیر روتی رہی۔

''ہیں تمہیں کیا ہوا کسی نے کچھ کہہ دیا.....''

''نہیں.....''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے گھر یاد آ رہا ہے.....'' اسامہ یکدم ہنس پڑا۔

''ننھی بچی ہو جو یوں رو رہی ہو آفٹر آل تم نے گھر ہی جانا ہے۔''

عمیر بھی آ گیا اور اسامہ نے اسے بھی وینی کے رونے کی وجہ بتائی۔

''رونا تو مجھے چاہیے تم بھی مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو۔'' عمیر نے کہا۔

''اسے روکنے کی کوئی تدبیر کرلو ناں.....''

اسامہ نے شوخ انداز سے وینی کا موڈ اچھا کرنا چاہا تھا۔

''کیا کروں.....؟'' عمیر نے ذہن پر زور ڈالا۔

''ارے یار شادی کرلو اس سے.....''
اسامہ نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔
''ہاں مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر کیا یہ مان جائے گی.....''
عمیر بھی اسامہ کی شرارت میں شامل ہوا۔
''مجھے چھوٹے بھائی سے نکاح پر اعتراض ہے۔''
وہ دو بدو بولی اس کا موڈ بہتر ہو گیا تھا.....
عمیر اور اسامہ ہنس دیئے۔
''کب جا رہی ہو واپس.....''
''پرسوں کی سیٹ کنفرم ہوئی ہے..... کیا تم مجھے سی آف کرنے آؤ گے.....''
''پرسوں تو سنڈے ہے ناں ضرور آؤں گا۔'' اس نے کہا۔
عمیر کے ساتھ باتیں کر کے اس کا من کچھ ہلکا ہو گیا تھا..... مگر کیا یہ دنیا اتنی چھوٹی تھی.....!

☆☆☆

''شام کا یہ وقت تو میرے ساتھ گزار لیا کرو کم از کم..... دن بھر تنہا رہ کر میرے اعصاب تھک جاتے ہیں۔ اپنے گھر کا یہ سناٹا تو میری جان ہی لے لے گا۔'' عمیر کچھ دیر قبل ہی اکیڈمی سے آیا تھا اور بائیک کی چابی اٹھائے اب پھر کہیں جا رہا تھا۔ شانی بھی ابھی ابھی آیا تھا۔ اماں جانی کی بات نے جیسے ان دونوں کو جکڑ لیا۔
''ایسا تو مت کہیں آپ کے علاوہ بچا ہی کیا ہے ہمارے پاس.....''
عمیر فوراً مڑ کر ان سے لپٹ گیا۔
''میری پروا ہی کسے ہے تم کو پڑھائی اور دوستوں سے فرصت نہیں ملتی اور بڑے کو دن رات باپ کے کاروبار کو آگے بڑھانے کی فکر، ایمان سے بتاؤ چوبیس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹہ بھی ایسا ہے جو تم میرے ساتھ گزارتے ہو۔'' آج وہ دونوں سے ہی خفا تھیں۔
''ایم سوری اماں جانی.....'' وہ دونوں ہی ان سے لپٹ گئے۔
''تمہاری معذرت میری گھٹن نہیں مٹا سکتی۔''
''اچھا بتائیں پھر کیا کریں.....'' وہ دونوں ان کے پاس بیٹھ گئے۔
''اتنے بڑے گھر میں میری اکیلی جان بچے میرا دم گھٹتا ہے اس تنہائی سے.....'' اماں جانی بے بسی سے بولیں۔
''اماں جانی شانی کے پاس آپ کے مسئلے کا حل ہے۔''
عمیر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا جبکہ شانی الجھی نگاہوں اور ناسمجھی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
''میرے پاس تم جانتے ہو میں سارا دن آفس.....''
''اف..... بزنس کے علاوہ بھی کائنات میں اور بہت کچھ ہے مسٹر ذیشان احمد صدیقی اور تمہارے بزنس کے خبط کو دیکھنے کے بعد ہی مجھے یہ حل ملا ہے کہ تم اماں کی تنہائی دور کر سکتے ہو.....''
''کیسے.....؟'' اس نے اچھنبے سے استفسار کیا۔
''ہم تمہاری شادی کر دیتے ہیں..... گھر میں بہو آجائے گی اماں کو تنہائی کا ساتھی مل جائے گا اور تم جس قدر

کیئر لیس ہو گئے ہو تمہاری کیئر کرنے کے لیے بھی کوئی آ جائے گی.....'' عمیر نے جوش سے تقریر کی۔

''جسٹ شٹ اپ عمیر.....'' توقع کے مطابق وہ چڑ گیا۔

''یہ کیا حل ہوا.....؟''

''عمیر کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہا بچے.....''

''آپ بھی اماں جانی.....'' اس نے شاکی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''ایم سوری میرا اعتبار عورت ذات سے بری طرح ٹوٹ چکا ہے۔''

''پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ذیشان احمد صدیقی تم صرف ایک لڑکی کی وجہ سے عورت کے ہر روپ کی تذلیل نہیں کر سکتے۔ مت بھولو کہ تمہیں جنم دینے والی بھی عورت ہے بہنوں کے روپ میں جو تمہیں خود سے بڑھ کر عزیز ہیں وہ بھی عورت ہیں.....''

''میرا یہ مقصد نہیں تھا عمیر مگر سچ میں ابھی ذہن اس بات کے لیے تیار نہیں اور یوں بھی اپنی بہت سی ذمہ داریاں جو ابا جانی نے مجھے سونپی تھیں مجھے ان کی ایک ایک بات یاد ہے عمیر اور میں اس وقت تک شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا جب تک میں اپنے تمام فرض ادا نہ کر دوں۔'' وہ از حد سنجیدہ ہو گیا۔

''اچھا ہاں بچے تم بھول گئے آج ہنی کو لینے جانا تھا۔'' اماں نے موضوع بدل دیا شانی کے موڈ کو دیکھ کر۔

''نہیں اماں جانی میں بھولا نہیں ہوں میں نے رابعہ آنٹی کو فون کیا تھا انہوں نے کہا تھا کہ کل آ جانا آج ان کے ہاں گیسٹ آئے ہوئے تھے۔ میں کل صبح ہی ہنی کو لینے چلا جاؤں گا..... آپ فکر نہ کریں.....''

اس نے اماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''صبح تم نے میرے ساتھ اسٹیشن بھی جانا ہے تم نے وعدہ کیا تھا..... وینی کو سی آف کرنے.....'' عمیر نے یاد دلایا۔

''ارے یار پلیز تم اکیلے چلے جانا کیوں میرا اتوار بھی خراب کرو گے.....''

''میں کچھ نہیں سننے والا بس.....'' اس نے گویا دھمکی دی تھی۔

☆☆☆

صبح بمشکل وہ شانی کو روم سے سٹنگ روم تک لانے میں کامیاب ہوا تھا۔

''دس از رانگ میں نے کل ہی تجھے کہہ دیا تھا شانی اب تو میرے ساتھ جا رہا ہے بس.....''

''کیا مصیبت ہے یار صبح صبح تم نے میری نیند خراب کر دی سنڈے کو تو سونے کا حق ہے ناں میرا.....''

''صبح صبح.....'' عمیر نے آنکھیں پھاڑیں۔

''شکر کرو پاکستان میں رہتے ہو جہاں ٹرین کبھی وقت پر نہیں آتی ورنہ بارہ بجے کو تم ہرگز صبح نہ کہہ رہے ہوتے۔ گاڑی دو گھنٹے لیٹ ہے ورنہ اب تک تو وہ حیدر آباد کراس کر چکی ہوتی..... چل اب اٹھ ناں.....''

وہ کڑھتے ہوئے بولا تھا اور پانچ منٹ بعد محض منہ دھو کر شانی اس کے ساتھ جانے کو تیار تھا۔ عمیر کا خون جلا تھا اس کے حلیے پر نگاہ پڑتے ہی مگر کچھ کہا اس لیے نہیں وہ پھر ناراض ہو کر بیٹھ جاتا۔

وینی شدت سے عمیر کا انتظار کر رہی تھی مگر جب اس نے عمیر کے ساتھ ہاف سلیوز ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں اس کو بھی آتے دیکھا تو اس کی خوشی دوبالا ہو گئی۔

اس نے پر جوش انداز میں سلام کیا تھا جس کا عمیر نے اسی انداز میں جواب دیا تھا۔ مگر دوسری طرف سے سارے احساس مفقود تھے۔ وعلیکم السلام کہہ کر وہ بے نیاز اسامہ کے ساتھ جانے کن باتوں میں مصروف ہو گیا تھا۔

''اتنے لیٹ میں تو مایوس ہی ہو گئی تھی کہ تم اب آؤ گے نہیں.....''

''ارے یار سنڈے کو شانی کو اٹھانا ہی جان جوکھوں میں ڈالنا ہے وہ تو رات ہی اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا تو وہ ضرور میرے ساتھ چلے گا بس میں اس کی وجہ سے لیٹ ہو گیا.....''

''تمہارے بھائی ہیں بڑے ڈیشنگ.....'' اس نے کھلے دل سے تعریف کی۔

عمیر ہنس دیا وہ سمجھی نہیں۔

''تم ہنسے کیوں میں نے غلط تو نہیں کہا.....''

''اوں ہوں تم نے بالکل سچ کہا ہے.....'' اس نے کہا۔

''دراصل میں ہنسا صرف اس لیے تھا کہ یہ جملہ میں تقریباً سینکڑوں لڑکیوں سے سن چکا ہوں۔ میرا بھائی بہت ڈیشنگ ہے..... یار مجھ میں کیا کیڑے پڑ گئے ہیں۔ میں بھی تو اسی کا بھائی ہوں کیا میں خوبصورت نہیں.....''

''اللہ تم اپنے بھائی سے اتنے جیلس ہو.....''

وہ حیرانی سے منہ پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولی۔

''ہرگز نہیں.....'' اس نے فوراً تردید کی۔

''ویسے عمیر تمہارے بھائی مغرور بھی بہت ہیں ناں.....''

''بالکل بھی نہیں.....''

''تم میرے بھائی کے بارے میں غلط اندازے لگا رہی ہو..... وہ بہت اچھا ہے۔''

''مجھے تو ہلاکو خان لگتا ہے دیکھتا ایسے ہے جیسے کھا جائے گا۔''

اس نے جو محسوس کیا فوراً کہہ دیا عمیر کافی دیر ہنستا رہا تھا۔ اس کے خطاب پر اسے سی آف کر کے وہ واپسی پر شانی سے پوچھ رہا تھا۔ ''تمہیں میری فرینڈ اچھی نہیں لگی.....'' شانی نے حیراں ہو کر اسے دیکھا۔

''مطلب اسے تو تمہاری شخصیت بہت اچھی لگی پتہ ہے اس نے تو تمہیں ایک خطاب بھی دے دیا ہے۔'' وہ دلچسپی سے بتا رہا تھا۔

''اچھا..... بھلا کیا.....''

''ہلاکو خان.....''

عمیر بتاتے بتاتے ہی ہنس پڑا اور کافی دیر تک ہنستا رہا۔ شانی اسے گھورتا رہا۔

''میں اگر ڈرائیو نہ کر رہا ہوتا تو تمہیں بہت اچھی طرح پوچھتا.....'' اس نے دانت کچکچائے۔

''تمہاری فرینڈ کو مینرز نہیں ہیں کسی کے بارے میں ایسے رائے دیتے ہیں.....''

''تم جیسے بی ہیو کرو گے لوگ ویسی ہی رائے قائم کریں گے۔''

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے تھا عمیر احمد صدیقی کہ وہ میرے بارے میں اچھی رائے قائم کریں۔'' اس نے دانت پیسے۔

''کم از کم خوش اخلاقی سے سلام کا جواب بھی دے دیتے تو کافی تھا.....'' عمیر نے اسے لاجواب کر دیا۔

☆☆☆

علم تو سب کو ہی تھا کہ آج اس نے جانا ہے مگر اس کا وجود اس گھر کے لیے لازم و ملزوم تھا شاید تبھی تو اس کا جانا سب کے لیے تکلیف دہ تھا۔ رابعہ بیگم کی آنکھیں جب سے اشکبار تھیں جب سے شانی پھوجی اور محسن آئے تھے۔

''مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے مجھے اثبار آج چھوڑ کر جا رہا ہے اربد اور ہنی کے ہوتے ہوئے بیٹے کی کمی اس قدر محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مگر ان کے بعد تو ہمارا گھر ویران ہو جائے گا۔''

''آنٹی پلیز آپ روئیں مت ہنی سے جب آپ کا دل چاہے ملنے کو آپ بس مجھے فون کر دیجئے گا میں خود لے آؤں گا۔'' شانی نے کہا۔

ہنی نیچے آئی تو سب سے پہلے پھوجی نے اسے گلے لگایا تھا اور وہ جوان ساڑھے چار مہینوں میں بائیکاٹ ہی کر بیٹھا تھا ہنی جب اس کے سینے سے لگی تو اثبار بھائی اور ابا جانی کی ڈیتھ کے بعد پہلی بار اس نے خود کو اتنا کمزور محسوس کیا کہ ہزار کوشش کے باوجود آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔ کتنی دیر اسے خود سے لگائے وہ خاموش کراتا رہا تھا.....

''چلو اب خاموش ہو جاؤ وہ دیکھو اربد بھی رونے لگا ہے۔''

اس نے ہنی کا سر تھپکا پھر اربد کو گود میں اٹھا لیا۔

رابعہ آنٹی نے انہیں کھانے کے بغیر اٹھنے ہی نہ دیا تھا اور جب انہوں نے اجازت مانگی تو وہ ایک بار پھر رو دیں۔

''کاش ہنی میں تمہیں روک سکتی.....''

''بہت یاد آؤ گی ہنی ہمارے گھر کے تو در و دیوار بھی تمہیں مس کریں گے۔''

اس کی دونوں نندیں بھی اس سے مل کر رو دیں تھیں۔ دونوں آج صرف اس سے ملنے آئی تھیں۔

''اس گھر پر تمہارا حق ہمیشہ رہے گا ہنی یہ مت سمجھنا کہ اثبار نہیں رہا تو تمہارا یہاں سے تعلق ختم ہو گیا تم جب چاہو آ سکتی ہو۔''

ابرار نے دست شفقت اس کے سر پر رکھا۔

گھر کے کونے کونے سے تیری کمی محسوس ہو گی
تیرے بنا میرا کوئی کام بھی اچھا نہیں ہوتا تھا

بھلا اب کون میری ہیلپ کرے گا.....

اسے خود سے لگائے اریشہ روتے ہوئے بولی تھی۔

ہنی کا اپنا من بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ بے شک اثبار کے بعد یہ گھر اسے کھانے کو آتا تھا مگر اس گھر سے اس کی کتنی یادیں وابستہ تھیں۔ اثبار احسن کے رفاقت کی تمام یادیں، انہی در و دیوار سے وابستہ تھیں۔ وہ خود اس گھر کو نہیں بھول سکتی تھی۔

وہ بہت بوجھل قدموں سے سب سے مل کر گاڑی میں بیٹھی تھی۔

یوں تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا اثبار.....

اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی تو آنسو آنکھوں سے ٹوٹ کر چہرے پر آ گرے.....

☆☆☆

یہ بات سب کے لیے حیران کن تھی وہ جب سے آئی تھی سعد کے سینے سے لگی بس آنسو بہا رہی تھی۔

''ارے یار ایسا ہوا کیا ہے.....؟''

سب نے ٹوکا تو اسے غلطی کا احساس ہوا وہ اس وقت چپ کر گئی وہ رات کے کھانے کے بعد جب لان میں چہل قدمی کر رہی تھی تو سعد نے اسے جوائن کیا۔

''میں تو ایکسائیٹڈ ہو رہا تھا تم آ کر مجھے اپنے آئیڈیل کے قصے سناؤ گی مگر تم نے تو آندھی طوفان کی طرح رونا شروع کر دیا تھا۔''

''ایم سوری سعد.....''

''سوری فار واٹ.....؟'' سعد نے الجھ کر اسے دیکھا۔

''اپنے ان تمام لفظوں کے لیے جو انجانے میں میں نے کہہ کر تمہیں ہرٹ کیا میں قصور تمہارا نہ سمجھتی اگر ہنی سے مل کر نہ آتی.....'' سعد ملک کے چہرے پر دکھ جھلکے لگا۔

''تم.....''

''ہاں میں جان گئی ہوں.....''

''اور میں اب بھی تم سے یہ ہی امید رکھتا ہوں کہ تم اب بھی یہ بات راز ہی رکھو گی۔'' اس نے امید بھری نظروں سے شاوانہ کو دیکھا۔

''پرامس.....'' وینی نے یقین دلایا تھا۔

''چلو اب ٹاپک چینج کرو اور مجھے بتاؤ کہ کون ہے وہ شخص جو تمہیں اپنا آئیڈیل لگا.....''

شاوانہ ملک کتنے لمحے قطعی کنفوژ کھڑی رہی کہ آخر سعد کو کیسے بتائے۔

''مجھے کیا پتہ میں نے تو صرف اسے دیکھا ہے مگر مجھے نہیں لگتا کہ میں اس قابل بھی ہوں کہ اس کی ایک نظر پا سکوں۔''

''کراچی کے گورنر سے تو عشق نہیں ہو گیا تمہیں.....'' اس نے مذاق کیا..... وہ خود بھی ہنس دی۔

اس کا بھی باپ ہے وہ..... اکڑا اکڑا خود میں مگن شخص کا وجیہہ سراپا ذہن کے پردے پر لہرا گیا۔

☆☆☆

فائل اس کے سامنے پڑی تھی اور اس کی نگاہ بہت بے یقینی سے حسن اور سعد ملک کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ تو پر امید تھا اور ابا جانی کے بعد ان چار ماہ میں اس نے اپنی تمام تر ہمتیں اور کوششیں جمع کیں تھیں ہر ممکن کوشش کے بعد بھی.....

اس کے سامنے پڑے پیپرز اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

اس نے جلتی ہوئی آنکھوں کو بند کیا تھا..... اور.....

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے.....)

☆☆☆

اندرونی صفحات میں
دنیائے رنگ و نور - آپ کے اوراق - ہار سنگھار - باورچی خانہ - شہر نامہ
برجوں کا طلسم کدہ - خود کلامی - نوک جھونک - آپ کے مسائل کا روحانی حل

دنیا رنگ و نور

سبز آنکھوں والی......سلمیٰ آغا

سلمیٰ آغا لندن میں پلی بڑھی اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ سلمیٰ آغا نے جب جوانی میں قدم رکھا تو وہ حسن کا ایک شاہکار ثابت ہوئی۔ سنہری بال سفید رنگ، سبز آنکھیں، دلکش نقوش کی مالکہ سلمیٰ آغا جہاں بھی جاتی ہر نگاہ اس کے تعاقب میں رہتی۔ سلمیٰ آغا کے نانا کے گھر فلمی صنعت کے لوگوں کی آمد ورفت رہتی تھی جس کی وجہ سے سلمیٰ آغا کو فلموں میں کام کرنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

سلمیٰ آغا کی پہلی شادی سولہ سال کی عمر میں اظہر بیگ نامی شخص سے ہوئی جس کا سلمیٰ آغا کا فلموں میں کام کرنا ناپسند نہیں تھا۔ مگر سلمیٰ آغا پر تو فلمی گلوکارہ اور اداکارہ بننے کا بھوت سوار تھا۔ سلمیٰ آغا کے گھر فلمی لوگوں کا آنا جانا شروع ہوا تو اظہر بیگ نے اسے طلاق دے دی۔ اب سلمیٰ آغا اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے آزاد تھی۔ پھر سلمیٰ آغا نے اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں اور مشہور بھارتی ہدایت کار بی آر چوپڑا سے لندن میں ملاقات کی۔ بی آر چوپڑا نے سلمیٰ آغا کو دیکھتے ہی اپنی فلم نکاح میں سائن کر لیا۔ نکاح میں سلمیٰ آغا نے اداکاری کے ساتھ ساتھ گلوکاری بھی کی وہ دونوں شعبوں میں کامیاب رہی نکاح میں سلمیٰ آغا کے گائے گانے بھی ہٹ ہو گئے۔

نکاح کی کامیابی کے بعد سلمیٰ آغا کی شہرت پاکستان پہنچ چکی تھی چنانچہ پاکستانی فلم سازوں نے بھی سلمیٰ آغا سے رابطے کرنے شروع کر دیئے۔ اس دوران سلمیٰ آغا کی زندگی میں محمود سپرا کی آمد ہوئی۔ اس نے دو بین الاقوامی معیار کی فلمیں بنانے کا اعلان کیا تو اس کے رابطے سلمیٰ آغا سے بھی ہوئے مگر یہ فلمیں بن نہ سکیں۔ پھر سلمیٰ آغا اور محمود سپرا کے راستے الگ ہو گئے۔

اس کے بعد ایک پاکستانی فلم ہم اور تم کی شوٹنگ کے دوران سلمیٰ آغا اور جاوید شیخ ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ جاوید شیخ شادی شدہ تھا مگر وہ سلمیٰ آغا کے حسن کے آگے اپنی بیوی کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ سلمیٰ آغا سے شادی جاوید شیخ کا ایک جذباتی فیصلہ ثابت ہوا۔ سلمیٰ آغا اپنے آپ کو کوئی اونچی چیز سمجھتی تھی اور جاوید شیخ کو کوئی اہمیت نہ دیتی تھی۔

آخر اس بے جوڑ شادی کا انجام بھی طلاق پر ہوا۔ جاوید شیخ سے طلاق لینے کے بعد سلمیٰ آغا نے سکوائش کے آل ٹائم گریٹ کھلاڑی جہانگیر خاں کے کزن رحمت خان سے شادی کر لی اور اب رنگ و نور سے دور گھریلو زندگی گزار رہی ہے۔

☆......☆......☆

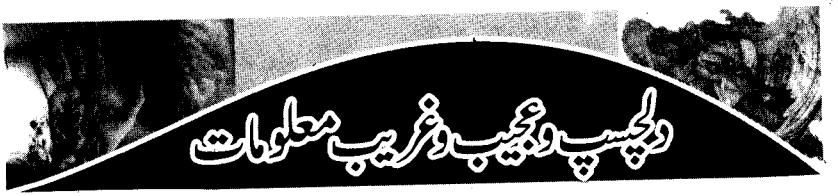

سچی حکومت

حضرت عمر فاروقؓ کسی کام سے جا رہے تھے کہ ایک پردیسی کو پتا چلا کہ یہ مسلمانوں کے امیرالمومنین (حکمران) ہیں۔ وہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا اور بھاگا بھاگا آپ کے پاس پہنچا اور پوچھا آپ مسلمانوں کے امیر ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا مجھے مسلمانوں کا امیر نہ کہو میں تو ان کا خادم و محافظ ہوں۔ اس آدمی نے کہا کہ آپ اپنے ساتھ حفاظتی دستہ کیوں نہیں رکھتے۔ آپ نے جواب دیا کہ عوام کا یہ کام نہیں کہ وہ میری حفاظت کریں بلکہ یہ تو میرا فرض ہے کہ میں ان کی حفاظت اور خدمت کروں۔

☆☆☆☆

پوسٹ کارڈ کا طویل سفر

مشی گن (امریکہ) کے ایک شہری نے فروری 1976ء میں ایک پوسٹ کارڈ وصول پایا۔ یہ پوسٹ کارڈ 68 سال قبل کسی نے اس کے دادا کو لکھا تھا۔ اس طرح یہ پوسٹ کارڈ 68 سال تک سفر کرتا رہا۔

☆☆☆☆

امریکی صدر کی ماں

امریکی صدر یولیسس سمپسن گرانٹ (عہد صدارت 1869ء۔ 1877ء) کی ماں اس کے دور صدارت میں واشنگٹن میں مقیم رہی مگر آٹھ سال میں ایک دفعہ بھی اس سے ملنے وائٹ ہاؤس نہیں گئی۔

☆☆☆

دوسری شادی

آسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں رواج تھا کہ جب کسی شخص کی بیوی مر جاتی تو وہ داڑھی میں کیچڑ مل لیتا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔

☆☆☆

پوپ کے پاؤں کا بوسہ

عیسائی رہنما پوپ کے پاؤں کو بوسہ دینے کی مذہبی رسم ایک ہزار سال تک جاری رہی۔ 1773ء میں اس رسم کو ختم کیا گیا۔

☆☆☆☆

چوہے پکڑنے والا خاندان

لندن کا ایک خاندان 240 سال سے ایک خاص قسم کی بو استعمال کر کے اور چوہوں کی آواز میں سیٹی بجا کر چوہے پکڑتا رہا۔ یہ لندن کا سب سے پرانا چوہے پکڑنے والا خاندان تھا۔ بڑے بڑے بینک، کاروباری ادارے اپنی عمارتوں کی چابیاں اس کام کے لیے اس خاندان کے منتظم اعلیٰ کے حوالے کر دیتے تھے۔ ان لوگوں نے یہ کاروبار 1710ء میں شروع کیا تھا۔ یہ کام 1950ء میں اس وقت اپنے انجام کو پہنچا جب اس خاندان کا سب سے بڑا مشاق شکاری بل ڈالٹن 79 برس کی عمر میں انتقال کر گیا۔

☆☆☆

سات رنگوں کی ریت

بھارتی ریاست ٹراونکور کی ساحلی ندی کماری میں سات رنگوں کی ریت پائی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ ندی بہت متبرک تصور کی جاتی ہے کیونکہ شیوا اور کماری کی شادی اسی ندی کے کنارے ہوئی تھی۔

☆☆☆

سونے کی زنجیر

16 ویں صدی عیسوی میں ایک سنار نے برطانیہ کی ملکہ الزبتھ اول (دور حکومت 1558ء۔ 1603ء) کو سونے کی ایک زنجیر پیش کی جس کی 50 کڑیاں تھیں لیکن یہ اس قدر باریک تھی کہ جب تک اسے سفید یا سیاہ کاغذ پر نہ رکھا جاتا نظر نہ آتی تھی۔

☆☆☆☆

سات منزلہ مندر

ملائیشیا کے قصبہ آئرتیم میں 30 ایکڑ رقبہ پر پھیلا ہوا ایک ایسا سات منزلہ مقدس مندر ہے جس کی بلندی 100 فٹ ہے۔ اس کی ہر منزل میں گوتم بدھ کا ایک ایک مجسمہ رکھا ہوا ہے۔ یہ مجسمے مختلف اشیاء مثلاً سنگ مرمر، سونا، ہاتھی دانت اور سنگ شفاف سے بنے ہیں۔

☆☆☆

ربڑ کی طرح کے پتھر

برازیل کے ایٹاکلوی نامی پہاڑ میں ایسے پتھر پائے جاتے ہیں جنہیں ربڑ کی طرح کھینچ کر موڑا جا سکتا ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی سلوں کو کسی بھی سمت توڑے بغیر جھکایا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

زمین میں دھنسنے والا پتھر

فرانس کے شہر چیمپ ڈولنٹ میں 560ء میں ایک تاریخی جنگ لڑی گئی تھی۔ عین اسی جگہ پر جہاں سے جنگ کا آغاز ہوا تھا ایک بہت بڑا پتھر موجود ہے۔ یہ پتھر حیرت انگیز طور پر ہر صدی کے بعد ایک انچ زمین میں دھنس جاتا ہے۔

☆☆☆

دانتوں کا کمال

جنوری 2002ء میں کولمبو (سری لنکا) کے وسنت کمار نے 40 ٹن وزنی دو مال گاڑی کے ڈبے اپنے دانتوں سے بہت آرام سے کھینچ لیے۔ اب اس کا ارادہ ہے کہ وہ ایک کلومیٹر تک ڈبوں کو کھینچ کر گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام درج کرائے گا۔

☆☆☆☆

قانون کا احترام

انگلینڈ کی ملکہ الزبتھ اول نے اپنے دور حکومت میں پارلیمنٹ میں ایک قانون منظور کیا جس کے تحت ہر اس شخص کو 10 ہزار پونڈ انعام دیا جائے گا جو سمندر کے پانی کو میٹھا بنانے کا نہایت ہی سستا اور آسان طریقہ دریافت کرے گا۔ انگریز قوم روایات کا اتنا احترام کرتی ہے کہ اس قانون کو منظور ہوئے 400 سال سے زائد عرصہ بیت چکا ہے مگر یہ قانون ضابطہ کی کتاب میں آج بھی وہی حیثیت رکھتا ہے۔

☆☆☆

خواتین کا عالمی دن

2002ء میں روس کے ایک شخص نے خواتین کے حقوق کے عالمی دن پر جشن مناتے ہوئے اپنی اہلیہ کو بری طرح پیٹا اور اپنی 70 سالہ ساس کو چوتھی منزل سے کھڑکی کھول کر باہر پھینک دیا۔ جس سے بوڑھی عورت موقع پر ہی ہلاک ہو گئی۔ پولیس کے مطابق 32 سالہ نوجوان نشے میں تھا۔ اس کا کسی بات پر بیوی سے جھگڑا ہو گیا اور دونوں الجھ گئے پولیس نے نوجوان کو گرفتار کر لیا جبکہ بیوی کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔

ریشم کا باورچی خانہ

آپ اور آپ کے مہمانوں کی جان
چٹ پٹے اور مزیدار پکوان

ہما نواب خان

ڈبل روٹی کا حلوہ

اجزاء:

ڈبل روٹی	چھ ٹکڑے
دودھ	ایک کلو
چینی	حسب ذائقہ
گھی	حسب ضرورت
بادام (باریک)	10 سے 12 عدد
کیوڑہ	چند قطرے
الائچی	چھ عدد

ترکیب:

ایک پتیلی میں دودھ چڑھا دیں۔ ابال آنے کے بعد اتنا پکائیں کہ دودھ گاڑھا ہو جائے۔ ڈبل روٹی کے سخت کنارے کو کاٹ لیں اور پھر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ ان ٹکڑوں کو دودھ میں شامل کر دیں۔ چمچ سے اسے برابر ہلاتی رہیں۔ جب دودھ خشک ہو جائے تو گھی ڈال کر بھون لیں۔ اس کے بعد اس میں چینی بھی شامل کر دیں اور دوبارہ سے بھونیں۔ پھر بادام اور کیوڑہ ڈال کر چولہے سے اتار لیں۔ لذیذ ڈبل روٹی کا حلوہ ٹھنڈا کر کے نوش فرمائیں۔

☆.....☆.....☆

اچاری طہاری

اجزاء:

چاول	تین پیالی
ادرک لہسن پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
پیاز (چوکور کٹی ہوئی)	دو عدد درمیانی
دہی	آدھی پیالی
لال مرچ کٹی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
ہلدی	ایک چائے کا چمچ
ثابت دھنیا	ایک کھانے کا چمچ
سفید زیرہ	ایک کھانے کا چمچ
سونف	ایک کھانے کا چمچ
رائی	ایک کھانے کا چمچ
کلونجی	ایک چائے کا چمچ
میتھی دانہ	آدھا چائے کا چمچ
ٹماٹر (چوکور کٹے ہوئے)	تین عدد درمیانے

گھی	آدھی پیالی

ترکیب:

دیگچی میں گھی کو درمیانی آنچ پر تین سے چار منٹ تک ہلکا گرم کر کے پیاز کو پانچ سے سات منٹ تک فرائی کریں۔ ادرک، لہسن، لال مرچ، ہلدی اور دہی ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔ ڈھک کر اتنی دیر پکائیں کہ تیل الگ نظر آنے لگے۔ پھر اس میں دھنیا، زیرہ، سونف، کلونجی اور میتھی دانے کو موٹا موٹا کوٹ کر ڈالیں، چاول، نمک اور ٹماٹر بھی ساتھ میں شامل کر دیں۔ بھون کر چار پیالی پانی شامل کر کے ڈھک دیں، درمیانی آنچ پر اتنی دیر پکائیں کہ پانی خشک ہو جائے۔ اچھی طرح ملا کر ہلکی آنچ پر پانچ سے سات منٹ دم پر رکھ کر اتار لیں۔ سلاد اور رائتے کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

☆.....☆.....☆

انڈوں کا حلوہ

اجزاء:

انڈے	چھ عدد
دودھ	ایک لٹر
چینی	سو گرام
سبز الائچی	دو عدد
بادام	چھ عدد
پستہ	چھ عدد
چاروں مغز	ایک چمچہ
جائفل	ایک چھوٹا ٹکڑا
زعفران	ایک چھوٹا ٹکڑا
چاندی کے ورق	حسب ضرورت

ترکیب:

انڈوں کو اچھی طرح سے دودھ میں پھینٹ لیں اور اس میں چینی ڈال لیں۔ اب ایک کڑاہی میں گھی ڈال کر الائچی کے دانے ڈال دیں اور اس میں انڈے ڈال کر خوب ہلائیں۔ چاروں مغز، بادام، پستہ وغیرہ بھی ڈالیں۔ جب حلوہ اچھی طرح سے گاڑھا ہو جائے تو اس میں زعفران اور جائفل ڈال دیں۔ جب گھی چھوڑے تو اتار کر ڈش میں پھیلا کر اوپر سے میوہ ڈال کر چاندی کے ورق لگا دیں۔

☆.....☆.....☆

پاکستانی پلاؤ

اجزا:

بکرے کا گوشت (سینہ)	1 کلو
پیاز	2 عدد
چاول	1 کلو
نمک	2 چمچ
تمام ثابت گرم مصالحہ	
تیل	حسب ضرورت
لونگ	12,11 عدد
بڑی الائچی (منہ کھول لیں)	2 عدد
دار چینی	1 انچ کا ٹکڑا
زیرہ	1 کھانے کا چمچہ
ثابت کالی مرچیں	1/2 کھانے کا چمچہ
لہسن	1 گٹھی
ادرک	لہسن جتنی اندازاً

ترکیب:

لہسن، 1 پیاز گوشت نمک اور پانی ڈال کر ابلنے رکھ دیں۔ جب گوشت گل جائے تو اتار کر 2 پیاز لے کر تیل میں براؤن کر لیں۔ لہسن ادرک کوٹ کر رکھ لیں۔ پیاز میں گوشت ڈالیں اور گرم مصالحہ ڈال دیں۔ لہسن ادرک کا پیسٹ ڈال کر ہلکے ہلکے بھونیں۔ یخنی کا پانی 2 کلو ہو تو ڈال دیں ورنہ سادہ پانی بھی ڈالیں۔ جب کھولنے لگے تو چاول دھو کر ڈال دیں۔ کھد کا (ابالے) آنے پر نمک چکھ لیں۔ ضرورت ہو تو اور ڈال دیں۔ دم پر رکھ دیں۔ مزے دار پلاؤ تیار ہے۔ رائتے، سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

رنگ میں بھنگ

انجم انصار

اصل وجہ

بخدا سوائے اس کے میری کوئی غلطی نہیں تھی کہ بات کا آغاز میں نے ''واہ'' سے کیا تھا مگر میں مستقل کئی گھنٹوں سے آہ..... اُف..... پھر اور اوہ کہنے کے سوا کوئی دوسرا جملہ کہنے کی مجاز نہیں تھی۔

اب شدے بھائی کی بھانجی کے داماد کے ہاں ہمارا آنا جانا اس وجہ سے بھی تھا کہ وہ ہمارے پڑوسی بھی ہوتے تھے۔

ہم ان کی اتنی خبر گیری نہیں رکھتے تھے جتنی کہ وہ رکھتے تھے۔

چھوآپا..... کل رات بڑی سی کالی کار میں کون آیا تھا؟

پرسوں وائٹ سوٹ پہن کر آپ کس خاتون کے ساتھ گئی تھیں؟

آج بڑے سے نیلے پیکٹ میں رجسٹری میں کیا آیا تھا؟

ابھی تو آموں کا موسم بھی نہیں آیا۔ یہ دو ٹوکرے آم آپ کو کس نے بھجوا دیئے۔ ایسے بڑے بڑے خربوزوں جیسے آم نظر آرہے تھے۔

اُف کیسی آپا ہیں! اپنے چھوٹے بھائی کے گھر کبھی جھانکتی تک نہیں ہیں۔ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے کہ ہم آپ سے اتنی محبت کرتے ہیں اور آپ کو ہم سے مروت تک نہیں۔

اسلم جتنی باتوں کو اٹھان پر لے کر جاتے، ہم اتنا ہی اپنے آپ کو ڈھلان پر محسوس کرتے۔

یہی سب سوچ کر ہم نے بارہا اسلم کے گھر جانے کا پروگرام بنایا اور ہر دفعہ میاں جی رد کر دیتے۔

''عجیب جھکی سا شخص ہے۔ مجھے تو اس سے باتیں کر کے وحشت سی ہوتی ہے۔''

''ایسا تو نہیں ہے۔ اتنی محبت سے بلاتے ہیں وہ اور پھر پڑوسی بھی ہیں ہاں جانا چاہیے۔''

''تمہارا خاندان ہے تم چلی جاؤ۔ تمہارے ہاں بھی اسی طرح پاگلوں کی طرح باتیں ہوتی ہیں۔'' (کرلو گل)

ایک دن اسلم کی بیوی کو گاڑی ڈرائیو کرتے دیکھا تو سوچا ان کو گاڑی کی مبارک باد دے آؤں۔ ان کے ہاں تو بائیک تک نہیں تھی۔ اچھا ہوا انہوں نے گاڑی لے لی۔

''واہ بھئی واہ! دیکھ کر دل خوش ہوگیا آپ کی گاڑی کو۔ مٹھائی کھلایئے آپ۔'' بخدا یہی جملہ بولا تھا میں نے کہ اس طرح کے مواقع پر عام طور پر ایسے ہی جملے بولے جاتے ہیں، خوشی کا اظہار کیا تھا۔

''ارے آپا! یہ گاڑی کل ہی آئی تھی اور آج ایسا واقعہ ہوگیا ہے کہ ابھی تک سانس نہیں آرہی میری۔'' انہوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

''ارے کیا ہوا؟ خیریت تو ہے ناں؟'' پہلا خیال دل میں یہی آیا کہ گاڑی کل آئی تھی۔ آج شاید گن پوائنٹ پر چھن گئی ہے۔ کار پورچ میں بھی کھڑی نظر نہیں آئی تھی۔

''چھوآپا! آپ یہ سوچیے گاڑی کل شام گھر آئی اور صبح آٹھ بجے شہناز (بیوی) کی سہیلی ان کو گاڑی سکھانے گھر آگئیں۔ میں نے سمجھایا بھی کہ ابھی گاڑی کو آئے ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے ہیں۔ اتنی جلدی تمہیں سیکھنے کی ضرورت کیا آ گئی مگر وہ بیوی ہی کیا جو میاں کی بات مان لے۔ اسی تن فن سے بولیں۔'' آپ نے یہ گاڑی میرے لیے خریدی ہے ناں تو میں اس کو ضرور چلاؤں گی۔''

''کراچی جیسے شہر میں گاڑی مردوں سے نہیں چلائی جاتی، تم کیسے چلا سکتی ہو؟'' میں نے رسان سے سمجھایا۔

''مردوں کو گاڑیاں چلانی آتی کہاں ہیں۔ ایسی انٹ شنٹ ڈرائیونگ کرتے ہیں۔ اپنے بڑے بھیا کو دیکھا ہے کیسے سانپ کی طرح لہراتی ہوئی گاڑی چلاتے ہیں اور آپ کے بہنوئی تو اسپیڈ بریکر پر ایسے گاڑی اچھالتے ہیں جیسے کرتب دکھانے والے ہوں۔'' اور آپ کے ماموں تو اللہ توبہ ایسی بری طرح گاڑی چلاتے ہیں کہ پاس سے گزرنے والے انہیں مغلظات سناتے ہوئے اپنی لعنت تک دکھاتے ہوئے جاتے ہیں۔''

''میرے خاندان والوں کی حاضری لینے کے بجائے اپنے خاندان کی خواتین کو دیکھا کرو جو چڑیل اسٹائل میں ڈرائیونگ کرتی ہیں۔ شکل پر ہولٹ پن، آواز میں وحشت اور آنکھوں میں انبار ملٹی نظر آتی ہے۔''

''آپ کچھ بھی کہہ لیں، میں گاڑی چلانا ضرور سیکھوں گی۔''

''تمہاری سہیلی تمہیں کتنے عرصے میں سکھا دے گی؟''

''وہ کہہ رہی ہے کہ آٹھ دس دن میں مجھے بہت اچھی چلانی آجائے گی۔ یوں بھی میں ہر بات بہت جلدی سیکھتی ہوں اس لیے میرا یہ خیال ہے کہ میں گاڑی آپ سے بہت اچھی چلایا کروں گی۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی سہیلی کے ساتھ ایک گھنٹے تک گاڑی لے کر باہر رہیں۔ جب وہ آئیں تو میں نے گاڑی پر دو چادریں اڑا کر دفتر چلا گیا۔ ابھی دفتر میں گئے مجھے دو گھنٹے ہی ہوئے تھے۔ سوچا گھر فون کر کے پوچھوں محلے میں کس کس کو ہماری گاڑی کی بابت پتا چلا ہے۔

فون اماں نے اٹھایا تھا۔ بڑے غصے میں بولیں۔ محلے والوں کو تو بعد میں پتا چلے گا مگر تمہیں بہت جلد پتا چل جائے گا جب تمہاری بیوی چار چھ کو سڑک پر مار کر آئیں گی اور لوگوں کی ایک بڑی قطار پولیس کے ساتھ تمہارے گھر میں داخل ہو کر تمہاری بیوی کے ساتھ تمہیں بھی گرفتار کر کے لے جائے گی۔

''اماں ہوا کیا؟'' میں نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تمہارے جاتے ہی تمہاری بیگم گاڑی لے کر اڑن چھو ہوگئی ہیں۔ خود تو مریں گی مگر اصل نقصان یہ ہوگا کہ گاڑی تباہ برباد ہو جائے گی۔''

''شہناز کے ساتھ اس کی دوست بھی گئی ہے کیا؟''

''نہیں، وہ تو تمہارے سامنے ہی اپنے گھر چلی گئی تھی۔''

''اوہ! پھر کیا ہوا؟'' ہم نے گھڑی پر نظریں ڈال کر ان سے پوچھا۔ ہمارے چہرے پر یہ صرف

صرف لکھا تھا کہ خدارا! اس کہانی کو مختصر کر کے سنا دو۔

مگر وہ آنکھوں میں آئے آنسو بڑی رغبت سے رومال میں جذب کرتے ہوئے بولے۔ ''میں فوراً دفتر سے گھر آ گیا حالانکہ اس وقت آفس انچارج بڑی چراند کر رہا تھا مگر اس وقت میں نے اسے دیکھا تک نہیں۔ گھر آ کر اماں سے پوچھا شہناز کو گھر سے گئے کتنے گھنٹے ہو گئے ہیں۔ اماں نے کہا صبح دس بج کر بیس منٹ پر گئی تھی۔ اس وقت دن کے ڈھائی بج رہے ہیں۔

''کوئی اطلاع آئی؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''بچیں گی تو اطلاع آئے گی۔'' اماں کو سخت غصہ تھا۔ ابھی انہوں نے گاڑی کو دل بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا اور بہو بیگم اسے لے اڑی تھیں۔

''پونے تین بجے کے قریب میں نے گلشن اپنی سالی کے ہاں فون کیا تو میرا سالا اس وقت گھر پر تھا، اس کی گورنمنٹ کی نوکری ہے۔ آفس اس کا اچھا ہے، بس جانا اور آنا ہی ہوتا ہے۔ ٹیلی فون اسی نے اٹھایا تھا۔ وہ بولا شہناز باجی پونے ایک بجے کے قریب ہمارے گھر آئی تھیں۔ وہ میرے تینوں بچوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔''

''تم نے اپنے بچے ان کے ساتھ کیوں جانے دیئے۔ ایسے منت مرادوں کے بچے تم نے ایسی گاڑی میں بٹھا دیئے جس کو گاڑی تک چلانی نہیں آتی۔''

میرا سالا بری طرح گھبرا گیا اور پریشان ہو کر بولا۔ ''کیا ابھی تک شہناز باجی گھر نہیں پہنچی ہیں۔''

''نہیں بھئی، نہ وہ آئی ہیں اور نہ میری گاڑی کی کوئی اطلاع ملی۔ ان کے موبائل پر فون کر رہا ہوں تو وہ مسلسل آف ہے۔ ظاہر ہے گاڑی کہیں ماری ہوگی تو موبائل کہاں بچا ہوگا۔''

''گڈو، بلو، شانی.....'' میرا سالا اپنے بچوں کے نام لے کر دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ اس سے نمٹا تو اپنی بیوی کو گالیاں دینے لگا۔

''اف پھر کیا ہوا؟'' مار سسپنس کے برا حال تھا۔ دل یہی چاہ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ جلدی سے سنا دیں تاکہ ہم بھی تعزیت کر کے جلدی سے گھر جائیں۔

''اب میری بری حالت، فون کی گھنٹی بھی بجتی تو میرا دل سہم جاتا۔ ایسا لگتا بس اب اطلاع آئے گی کہ شہناز کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔''

اماں نے کہا ہسپتالوں میں جا کر پتا کرو کہ کسی حادثے میں شہناز کا نام ہے یا نہیں مگر میرا چڑیا سا دل اتنی ہمت کیسے کرتا۔ سامنے والے شاہ صاحب کو بتایا تو وہ اپنے سکوٹر پر گلشن تک گھما لائے۔ کہیں نہ گاڑی اور نہ شہناز، دل کا میرا عجیب حال تھا۔ ادھر سالے کے پریشانی کے فون دل میں طرح طرح کے خیالات لا رہے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہوا ہو، کہیں ویسا نہ ہوا ہو۔ میرا سر گھومتا چلا جا رہا تھا۔

جب پانچ بج گئے تو اماں نے رونا شروع کر دیا۔ بڑے ابا یٰسین لے کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا کہ آپ سورۃ ملک پہلے پڑھ لیں۔ دل ایسا دھڑکے جائے کہ بتا نہیں سکتا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بڑی ہمت کر کے ریسیور اٹھایا تو ایک صاحب بولے۔

''بھائی صاحب! نماز جنازہ کتنے بجے ہوگی؟ اور میں چیخ مار کر ریسیور رکھ کر اماں کے پاس گیا۔ مجھے اس حال میں دیکھ کر اماں بھی خوب روئیں۔''

''پھر آپ قبر تیار کروانے چلے گئے ہوں گے۔'' میں نے ان سے پوچھا تاکہ میت سیپ ہلے کے کاموں کے بارے میں وہ زیادہ تفصیل میں نہ جائیں۔

''وہ فون تو رانگ نمبر تھا سی ایل آئی پر اجنبی نمبر دیکھ کر جلد مطمئن ہوگیا۔ لیجئے چھوآپا! اب شام کے چھ بج گئے۔ نہ شہناز آئی، نہ کوئی اطلاع۔ مجھ پر غنودگی سی چھانے لگی۔ ساڑھے چھ ہوگئے۔ اب میں اپنے آپ کو ہر قسم کی صورتحال کے لیے تیار کر رہا تھا کہ بہت سے بچے اچانک گھر میں گھس آئے۔ یہ سامنے والے فلیٹ کے بچے تھے۔ اکثر گھر میں آجاتے ہیں۔ کبھی ان کی بال آجاتی ہے تو کبھی کچھ۔ پچھلے ہفتے سامنے والوں کی بلی ہمارے گھر میں آگئی تھی۔ ہاں تو وہ بچے بولے۔''

''انکل انکل! کیا آپ نے گاڑی لی ہے؟''

وہ بچے بول رہے تھے۔

''ہاں بیٹا لی تھی۔''

''آپ نے بتایا بھی نہیں۔''

''کیا بتاتا بیٹا آپ کو؟'' میرا لہجہ مزید مغمول ہوگیا۔

''اوہ، پھر کیا ہوا؟'' اب میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھاما ہوا تھا۔ اس وقت اگر شہناز کی میت بھی میرے سامنے آجاتی تو شاید کوئی آنسو میری آنکھوں میں نہ آتا کہ اتنی دیر سے بہت سے آنسو میرے دل پر جو گر چکے تھے اور ہاتھ پیروں میں ایک عجیب سا لرزہ شروع ہو چکا تھا۔

''اور میں یہ سوچنے لگا کہ شاید کسی گاڑی کے حادثے کی خبر ٹی وی پر آئی ہے اور اس میں مری ہوئی شہناز کو دیکھ کر بچوں نے پہچان لیا ہے۔ ابھی میں سوچ کے سمندر میں ڈبکیاں ہی لگا رہا تھا کہ شہناز کے ہنسنے کی آواز آئی۔ یقین کرنا چھوآپا! زندگی میں پہلی مرتبہ یہ آواز سن کر سکون ملا۔''

''اللہ آج تو میں نے خوب گاڑی چلائی۔ نفو کے گھر گئی پھر بڑے صاحب کے ہاں۔ آخر میں امی کے گھر، سب لوگ مجھے گاڑی چلاتا دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کسی کو یہ یقین بھی نہیں آرہا تھا کہ میں نے صرف ایک مرتبہ سیکھنے میں اتنی اچھی چلالی ہے۔''

''اوہ، سب لوگ بچ گئے۔ اب شہناز اور گاڑی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شہناز اس وقت مٹھائی لینے گئی ہے۔ ماشاء اللہ ایسی عمدہ گاڑی چلاتی ہوئی گئی ہے کہ میں تو حیران رہ گیا۔ سو کی سپیڈ میں محلے سے نکلی ہے۔ گاڑی کے ٹائروں کی آواز بھی دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ اب اسلم تعریف کرنے میں پاگل ہو رہے تھے اور بضد تھے کہ مٹھائی کھا کر میں جاؤں مگر میں نے یہ کہانی پورے تین گھنٹے میں سنی تھی اس لیے بھوک پیاس سب اڑ چکی تھی۔ بھاگنے کے انداز میں گھر آئی اور آتے ہی نند کے بچے کو خواہ مخواہ مارنے لگی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے ایسا کیوں کیا تو وجہ یہ تھی کہ نند کے چھوٹے بچے کا نام بھی اسلم ہے۔

☆☆☆

رنگِ خیال

ترتیب: شاہ روم خان ولی

نامور شعراء کرام کی بہترین غزلیات کا گلدستہ

غزل

ابھی غمگین ہے موسم زیادہ
اُٹھاؤ اپنے اپنے غم زیادہ
فرازِ دار پر ہے کون لٹکا!!!
اگرچہ ہیں یہاں میثم زیادہ
مرے زخموں کو بھرنے والے سن لے
مجھے درکار ہے مرہم زیادہ
میں اپنے آپ مرنا چاہتا ہوں
پلا دے زہر چھوڑو کم زیادہ
ابھی میں ہوش میں آتا نہیں ہوں
لگا رکھی ہے میں نے دم زیادہ
ہمارے دیس کا ہے ایک پرچم
کہاں سے آئے ہیں پرچم زیادہ
ولی آنکھوں کا پانی روک لینا
یہاں پہلے بھی ہیں قلزم زیادہ

﴿شاہ روم خان ولی﴾

♥♥♥♥♥♥

غزل

ایک طوفان سے ، ضر ضر سے نوازا جاؤں
اونچا اُڑنے کیلئے پر سے نوازا جاؤں
یہ بھی انگڑائیاں لیتی ہے تمنا دل میں
پر پھرا سوخ ہوں، اک سر سے نوازا جاؤں
چٹکیاں لیتا ہے یہ ذوقِ جنوں بھی دل میں
جس میں رہتے ہو اسی گھر سے نوازا جاؤں
جو مجھے دنیا کے ہر خوف سے آزاد کرے
چاہتا ہوں کہ اسی ڈر سے نوازا جاؤں
شاید اک سجدہ ندامت کا ، بدل دے دنیا
آنکھ پُرنم ہو، ترے در سے نوازا جاؤں
ایک مٹی کے گھروندے پہ تو حق ہے میرا
میں نہیں کہتا کہ مر مر سے نوازا جاؤں
بات ٹھہری ہے اسی بات پہ آکر مری جاں
تم جو پتھر ہو تو پتھر سے نوازا جاؤں

﴿سید غلام مجتبیٰ، گجرات﴾

♥♥♥♥♥♥

غزل

ہیں درد محبت کے جو سونے نہیں دیتے
رونا بھی اگر چاہیں تو رونے نہیں دیتے
بچوں کا بھلا کیسے بھروں پیٹ میں آخر
پتھر کو بھی مرضی سے وہ ڈھونے نہیں دیتے
معلوم ہے اُن کو یہاں بارش نہیں ہوتی
مٹی میں مجھے اشک بھی بونے نہیں دیتے
ممکن ہی نہیں خیر کی اُن سے توقع
ذہنوں کی کثافت کو جو دھونے نہیں دیتے
دیکھیں یہ ذرا قہر ، زمانے کی فضا کا
معصوم سے بچوں کو کھلونے نہیں دیتے
ہر فصل یہاں پر ہے اُگانے کی اجازت
اک فصلِ محبت ہے جو بونے نہیں دیتے

جو مجھ کو ملا گوہرِ نایاب کی صورت
ہاتھوں سے ندیم اُس کو کبھی کھونے نہیں دیتے

﴿ریاض ندیم نیازی، سبی﴾

♥♥♥♥♥♥

غزل

تم اپنا ذہن ذرا سا تو پاک کر دینا
میں بے وفائی کروں تو ہلاک کر دینا
یہ کس کتاب میں لکھا ہے عشق کرنے پر
ہمارے شہر کی لڑکی کو خاک کر دینا
جو ڈائری میں نشانی ہے اب محبت کی
ورق ورق تو اُسے راکھ راکھ کر دینا
نہیں یہ عشق سراسر تو ہو نہیں سکتا
کہ اپنا جسم ابھی چاک چاک کر دینا
میں تیرے پیار کے چکر میں پڑتی نہیں شازی
یہ دل سے کہتی ہوں بیشک ہلاک کر دینا

﴿شازیہ خان شازی، صوابی﴾

♥♥♥♥♥♥

غزل

یوں نہ پندار کی دیوار اُٹھا کر ڈھونڈو
مل بھی سکتا ہوں اگر خود کو ہٹا کر ڈھونڈو
تم نے قُربت کے شب و روز میں کھویا ہے مجھے
جاؤ اب ہجر کے ایام میں جا کر ڈھونڈو
عاجزی سے کوئی دیکھے تو چمک اُٹھتا ہوں
بھول کر بھی نہ مجھے ناز دکھا کر ڈھونڈو
سامنے پا کے نہ سمجھو کہ مجھے ڈھونڈ لیا
ایک بار اور مرے قُرب میں آ کر ڈھونڈو
ایسا کھویا ہوں ، جھلک تک نہیں ملتی اپنی
دوستو مجھ کو مرا عکس دکھا کر ڈھونڈو
ایسی تاریک خموش میں ملے گا کیسے
اس کو آواز کی قندیل جلا کر ڈھونڈو
کھو کے پانے کا ارادہ ہے تو جلدی نہ کرو
یہ نہ ہو پا کے مجھے پھر سے گنوا کر ڈھونڈو
تکنے والو تکے جاتے ہو فلک کی جانب
ڈھونڈنا ہے تو مجھے خاک پہ آ کر ڈھونڈو
یہ مری ذات کا جنگل ہے، نہ خود کھو جانا
تم مجھے ڈھونڈتی ہو ، خود کو بچا کر ڈھونڈو
میں محبت میں غلامی کو نہیں مانتا ہوں
یہ بھی کیا ، پیار کے بازار میں جا کر ڈھونڈو
دور سے ڈھونڈتے رہتے تو میں مل بھی جاتا
کس نے بولا تھا مجھے پاس بلا کر ڈھونڈو
گھاس کے ڈھیر میں سوئی نہیں ملتی نیر
عمر بھر اب اسے ہاتھوں سے گرا کر ڈھونڈو

﴿شہزاد نیئر، کوئٹہ﴾

♥♥♥♥♥♥

غزل

ہو ہستی مری افتخارِ غزل
میں رکھوں گی قائم وقارِ غزل
سبھی کو وہ کہتا ہے جانِ غزل
یوں کرتا ہے وہ کاروبارِ غزل
میں نظمیں جو کہتی رہی ہوں یہاں
ہے مجھ کو پسند اختصارِ غزل
جو ان کی مجھے یاد آنے لگے
اترتی ہے پھر آبشارِ غزل
محبت عداوت وفا دشمنی
ہاں ایسا ہی پایا دیارِ غزل
ہیں باتیں کبھی ان کی یادیں کبھی
مہکتا رہا ہے دیارِ غزل
نجانے شگفتہ کہاں کھو گیا
جو کہتا تھا سب کو بہارِ غزل

﴿شگفتہ شفیق، کراچی﴾

غزل

ہٹ گئے چشمِ تصور سے گماں کے پردے
آ کے تصویر میں اب رنگِ تعلق بھر دے
اس سے ملنا تو اُسے عید مبارک کہنا
یہ بھی کہنا کہ مری عید مبارک کر دے
جانے رعنائی مجھے خواب دکھائے کیسا
جانے بینائی مری آنکھ کو کیا منظر دے
اے محبت میں تری سختی نہیں جھل سکتا
کچھ رعایت تو مجھے ٹوٹے ہوئے دل پر دے
کب تلک میں تری سوچوں کے تسلسل میں رہوں
اب مجھے چاک پہ رکھ اور کوئی پیکر دے
سب زر و مال کے شیدائی نظر آتے ہیں
کون دنیا کو رعونت سے بھری ٹھوکر دے
یہ سمندر کا علاقہ ہے سو مرضی اس کی
جس پہ موتی کی عنایت ہو جسے پتھر دے
میں بہت چین سے بیٹھا ہوں سرِ شاخ آذر
جس کو اُڑنے کی تمنا ہے اُسی کو پَر دے

﴿دلاور علی آذر، ٹیکسلا﴾

♥♥♥♥♥♥

غزل

زندگانی کی بات کیا کرتے
نقش فانی کی بات کیا کرتے
بڑھ گئی جس سے بے کلی دل کی
اس کہانی کی بات کیا کرتے
آنکھ اپنی تھی خوگرِ طوفاں
ٹھہرے پانی کی بات کیا کرتے
جس کا دامن نہ عشق سے بھیگا
اس جوانی کی بات کیا کرتے
دل کا موسم اداس تھا جاناں
رُت سہانی کی بات کیا کرتے
ہم اسیرانِ موسمِ ہجراں
شادمانی کی بات کیا کرتے

﴿قمر صدیقی، سرائے عالمگیر﴾

♥♥♥♥♥♥

غزل

خزاں گزری بہار آئی مجھے اک شخص یاد آیا
صبا خوشبو اُڑا لائی مجھے اک شخص یاد آیا
میں جب پگڈنڈیوں، کھیتوں میں آیا اپنے گاؤں کے
کچھ ایسی تھی پذیرائی مجھے اک شخص یاد آیا
اٹھی بارش برسنے سے جو خوشبو بھینی بھینی سی
مری سانسوں سے ٹکرائی مجھے اک شخص یاد آیا
جو آغازِ جوانی میں لکھی تھی پیار میں کھو کر
غزل وہ جب بھی دہرائی مجھے اک شخص یاد آیا
گھنیری زلف کے سائے مری آنکھوں میں لہرائے
گھٹا کالی اگر چھائی مجھے اک شخص یاد آیا
دیارِ شب میں خوابوں کے چمن تازہ بسائے جب
مہک سوچوں نے بکھرائی مجھے اک شخص یاد آیا
لگی ٹھوکر تو قسمت کا اسے لکھا سمجھ بیٹھا
کوئی راحت اگر پائی مجھے اک شخص یاد آیا
نکل آیا اندھیرے میں اچانک چاند بادل سے
مجھے اک رات یاد آئی مجھے اک شخص یاد آیا
میں ننگے پاؤں سبزے پہ چلا ہوں صبح دم جاذب
جھلک بچپن نے دکھلائی مجھے اک شخص یاد آیا

﴿محمد اکرم جاذب، منڈی بہاولدین﴾

♥♥♥♥♥♥

غزل

ترے آنے کی مجھ کو چاہ پیا
دل و جاں ہے چشم براہ پیا
سب عشق فقیر ترے در کے
تو ایک اکیلا شاہ پیا

ہم خاک نشینوں کے دم سے
آباد تری درگاہ پیا
تصدیق تو کر مجھے ملنے کی
آ پوری کر افواہ پیا
میرا سارا زہر فنا کردے
تیری میٹھی ایک نگاہ پیا
تعبیر کے خنجر تیز بہت
ہے زخمی خواب سپاہ پیا
یہ کم علما ہے ہنرا ہے
ارشد سے آپ نباہ پیا

﴿ارشد ملک، راولپنڈی﴾

♥♥♥♥♥♥

غزل

اُٹھا کے سر پہ زمانے کا غم عدم کو چلے
خوشی مناؤ رقیبو! کہ ہم عدم کو چلے
عجب سفر ہے سواری نہ کوئی رختِ سفر
نہ لب ہلائے نہ اٹھے قدم عدم کو چلے
ہم اپنی یاد میں دنیا کو چھوڑ کر نالاں
بچھا کے خود صفِ ماتم میں غم عدم کو چلے
نہ جانے کیا تھا جو لکھنے کی آرزو تھی انہیں
وہ انگلیوں میں پھنسائے قلم عدم کو چلے
یہ زندگی ہے مہد سے لحد تلک کا سفر
حیات خود ہی قدم در قدم عدم کو چلے
جو زندگی میں سہارا نہ دے سکے ہم کو
انہی کے دوش پہ احرام ہم عدم کو چلے

﴿شبیر احرام، کراچی﴾

♥♥♥♥♥♥

غزل

نئی دھرتی ، نیا امبر ، نیا احمر بناتے ہیں
چلو ہم یہ جہاں پہلے سے بھی بہتر بناتے ہیں
اگر یہ جرم ہے تو خوشی سے دو سزا اس کی
جہاں دیوار اٹھتی ہے وہاں ہم در بناتے ہیں
یونہی مصروف رکھتے ہیں شبِ تنہائی میں خود کو
ستارے گھوندتے ہیں اور ترا پیکر بناتے ہیں
رفیقو! کب تلک شکوے ؟ فقط شکوے اسیری کے
اٹھو! آئندگاں کے واسطے ہم پر بناتے ہیں
اندھیرا روشنی کو جب کبھی مغلوب کرتا ہے
زمیں کے پتھروں کو ہم مہ و اختر بناتے ہیں
خلوصِ دل میں لایا ہوں وفا تم لے کے آجاؤ
ملا کر ان کو ہم دونوں ہمارا گھر بناتے ہیں
بصیرت زین دیکھے گی بھلا کب تک یہ ویرانی
چلو ہم اپنے حصے کے نئے منظر بناتے ہیں

﴿اشتیاق زین، جہلم﴾

♥♥♥♥♥♥

غزل

پاس بھی وہ رہتے ہیں بات بھی نہیں کرتے
اس طرح تو دشمن بھی دشمنی نہیں کرتے
کب ستارے قسمت کے کوئی چال چل جائیں
بس کہ ہم اسی ڈر سے دوستی نہیں کرتے
گھر میں اس کی یادوں کا اس قدر اجالا ہے
ہم کبھی چراغوں سے روشنی نہیں کرتے
یوں تو اہل مجلس پر ہیں عنائتیں ان کی
پر کبھی دوا میرے درد کی نہیں کرتے
کیا دیے جلائیں گے وہ اندھیرے رستوں میں
جو دلوں کے آنگن میں روشنی نہیں کرتے
وہ گیا تو کچھ ایسا درد دے گیا عاجز
ہم کسی سے اب دل کی بات ہی نہیں کرتے

﴿افضال عاجز، لاہور﴾

♥♥♥♥♥♥

ریشمی سندیسے

میجر عزیز بھٹی شہید کے نام

جب ہمارے پڑوسی دشمن انڈیا نے 6 ستمبر 1965ء کو رات کے اندھیرے میں پاکستان پر حملہ کر دیا تھا تو میجر عزیز بھٹی شہید بی آر بی نہر لاہور کے مقام پر دشمن پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اپنی پلٹن کی کمان سنبھالے ہوئے تھے۔ تین دن اور تین راتیں مسلسل جاگ کر دشمن کو روکے رکھا۔

آخر 10 ستمبر 1965ء کو دشمن کے ایک ٹینک کا گولا میجر عزیز بھٹی کے سینے پر آ کر لگا جس کے لگنے سے میجر عزیز بھٹی موقع پر ہی شہید ہو گئے۔ ان کو ان کی بے مثال قربانی پر نشان حیدر سے نوازا گیا۔ میجر عزیز بھٹی کو ان کے آبائی گاؤں لادیاں میں سپرد خاک کیا گیا۔ ہر سال 6 ستمبر کو ان کی قبر پر سلامی دی جاتی ہے۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔

(ایم اشفاق بٹ، لالہ موسیٰ)

بہت پیارے بچوں اور بہن بھائیوں کے نام

السلام علیکم! ڈھیروں دعائیں۔

آپ سب سے درخواست ہے کہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمائیں۔ زندگی کے اس مختصر سفر میں مختلف چھوٹے بڑے امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دل کی گہرائیوں سے دعا کرتی ہوں کہ وہ ان امتحانوں میں آپ کو سرخرو کرے۔

چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھیں اور بڑی بڑی نیکیاں کمائیں۔ اللہ نے ہمیں خوبصورت زندگی عطا فرما کر موقع دیا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے نیکی کریں۔ صبر و تحمل کا مظاہرہ کریں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم نیکیاں کمائیں، اپنی آخرت سنواریں، اپنی قبر کی اذیتوں کو کم کریں، کسی بھوکے کی بھوک مٹائیں۔ اپنے مال میں سے کچھ حصہ صدقہ و خیرات کریں۔ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کریں۔ اس طرح کے ایک ہاتھ سے دیں دوسرے کو خبر نہ ہو۔ اپنے مستحق رشتے داروں اور غریبوں کا ضرور خیال رکھیں۔ اللہ آپ کو بہت زیادہ اجر دے گا۔

اللہ کرے میری بات، میرا مقصد آپ کو سمجھ میں آ جائے۔

اللہ آپ سب اور ہم سب کا حامی و ناصر، مالک و مددگار رہے۔ (آمین)

(مسز نگہت غفار، کراچی)

تمام شہداء کے نام

6 ستمبر 1965ء کی جنگ میں شہید ہونے والے تمام شہداء کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں اور ان کے درجات کی بلندی کے لیے اپنے اللہ کے حضور دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لواحقین کو صبر عطا فرمائے۔

(مقصود احمد بلوچ، میاں چنوں)

آپ کے روبرو

ملاقات: ریما نور رضوان

انٹرویو: منتہا جاوید آرائیں

س: آپ کا اصل اور پورا نام؟

ج۔ منتہا جاوید آرائیں

س: گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟

ج۔ چھوٹے بڑے سب اپیا کہتے ہیں۔

س: تاریخ پیدائش/سن/رہائش؟

ج۔ 27 فروری 1996، میر پور خاص۔

س: تعلیمی قابلیت؟

ج۔ computer of bachelors science، اور ابھی پڑھائی جاری ہے۔

س: اپنی فیملی کے بارے میں کچھ بتائیں؟ کون کون ہے فیملی میں؟

ج۔ ہماری چھوٹی سی پیاری سی فیملی ہے، ماما، بابا، دو بھائی اور ہم دو بہنیں۔

س: کوکنگ کا شوق ہے کیا؟

ج۔ بالکل بھی نہیں جب موڈ ہوتا ہے تو کچھ بنا ہوں۔

س: اپنے ہاتھ کی بنی پسندیدہ ڈش؟

ج۔ بریانی

س: ویسے اوور آل کھانے میں کیا پسند ہے؟

ج۔ بریانی، آئس کریم، گاجر کا حلوہ اور چائنیز فوڈ

س: پسندیدہ فروٹ؟

ج۔ انار، تربوز

س: پسندیدہ سبزی؟

ج۔ بھنڈی

س: کھانا کھانے میں ہوش سے کام لیتی ہیں یا جوش سے؟

ج۔ جب کھانا میری پسند کا ہو تو جوش سے (ہاہا)

س: زیادہ شوقین ہیں کھانے کی یا بس ضرورت کی حد تک؟

ج۔ بہت زیادہ شوقین ہوں اور وہ بھی چٹ پٹے کھانوں کی۔

س: فٹنس کا کتنا خیال رکھتی ہیں۔ فٹ رہنے کے کچھ نسخے ہمیں بھی بتائیے؟

ج۔ میں ذرا بھی خیال نہیں رکھتی بس کھاتی پیتی

موج کرتی ہوں اگر کبھی کوئی کہہ دے کہ تم موٹی لگ رہی ہو تو جواب میں ہنستے ہوئے کہہ دیتی ہوں ''تو کیا ہوا کھاتے پیتے گھر کی ہوں۔''

س: اپنی ڈیلی روٹین کے بارے میں کچھ بتائیں؟ کب سوتی ہیں؟ کب اٹھتی ہیں؟ اور دن کن مصروفیات میں گزرتا ہے؟

ج۔ صبح فجر میں اٹھتی ہوں نماز کے بعد یونیورسٹی جانے کی تیاری پھر واپسی تین بجے ہوتی ہے اور آتے ہی بس مجھے سونا ہوتا ہے سونے کے آگے مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا (ہاہا) عصر کی نماز کے بعد کچھ گھر کے کام، پڑھائی، بکس ریڈنگ، کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنا، کچھ دیر چاند سے باتیں کرنا، اپنی تحریریں لکھنا پھر عشاء کی نماز کے بعد کچھ دیر فیس بک اور پھر سو جانا) ویسے دن بھر میں فیس بک پر بھی آتی جاتی رہتی ہوں (شریر انداز سے)

س: فیملی میں سب سے زیادہ محبت کس سے ہے؟

ج۔ کسی ایک کا نام لینا مشکل ہے سب سے محبت ہے۔

س: آپ کا پسندیدہ رنگ؟

ج۔ کالا، گلابی

س: پہننے میں زیادہ کیا پسند کرتی ہیں؟

ج۔ فراک۔۔ ویسے میں نے بچپن میں لہنگے بہت پہنے ہیں۔

س: فنکشنز پہ جانا کیسا لگتا ہے؟ شوق سے جاتی ہیں یا مجبوری سے؟

ج. مجھے تو بہت پسند ہے بہت شوق سے جاتی ہوں اور بہت انجوائے بھی کرتی ہوں مجھے نئے لوگوں سے ملنا پسند ہے۔

س: فیس بک پہ ہم نے آپ کو کافی فرینڈلی پایا..... حقیقت میں بھی ایسی ہی ہیں کیا؟

ج. جی بالکل میں بہت فرینڈلی ہوں پہلی ملاقات میں ہی لوگوں سے گھل مل جاتی ہوں، اور پھر لوگوں کو لگتا ہی نہیں کہ وہ مجھ سے پہلی بار مل رہے ہیں۔

س: دوستی سوچ سمجھ کر کرتی ہیں یا بنا سوچے سمجھیں؟

ج۔ بنا سوچے سمجھے، میں لوگوں پہ بہت جلد بھروسہ کر لیتی ہوں اور لوگ بھروسہ توڑ بھی دیتے ہے۔

س: بہترین دوست کا نام؟

ج۔ کومل اور فاطمہ۔ کومل میری بیسٹ فرینڈ ہے اور مزے کی بات ہم ہر وقت یونیورسٹی میں ساتھ رہتے ہیں اور ہماری شکلیں بھی لوگوں کو کافی حد تک سیم لگتی ہیں تو سب ہمیں بہنیں سمجھتے تھے یہاں تک کے ٹیچرز بھی (ہنستے ہوئے)

س: اسٹوڈنٹ لائف کیسی رہی؟

ج۔ بہت بہت بہت اچھی ہے۔

س: زیادہ انجوائے سکول ٹائم میں کیا یا کالج، یونیورسٹی؟

ج۔ سکول ٹائم میں بھی کیا تھا اور اب یونیورسٹی میں زیادہ انجوائے ہوتا ہے میری پیاری کومل کے ساتھ ہم اتنے شرارتی ہیں کہ بس کیا بتاؤں۔

س: پڑھائی میں کیسی تھیں؟

ج۔ الحمدللہ اسکول ٹائم میں بہت اچھی تھی ہمیشہ A1 گریڈ آتا تھا اور اب بھی اچھی ہی ہوں..

س: سٹوڈنٹ لائف کا کوئی یادگار واقعہ جو آج تک بھول نہ پائی ہوں؟

ج: ایک تو ہم شرارتی اور اوپر سے واقعہ نہیں واقعات ہیں اور ایسے ہیں کہ اگر بتاؤں تو آپ لوگوں کے ہنس ہنس کر پیٹ میں درد ہو جائے اور میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے کسی کے پیٹ میں درد ہو۔ (شریر انداز سے)

س: میوزک اور موویز سے کس حد تک دلچسپی ہے؟

ج۔ سچ کہوں تو پہلے میوزک بہت پسند تھا اور جنون تھا گانے کا کہ کاش میں سنگر ہوتی مگر اب پچھلے دو سالوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے.. اچانک دلچسپی ختم ہوگئی۔

س: پسندیدہ گلوکار/گلوکارہ؟
ج۔ عاطف اسلم
س: پسندیدہ ایکٹر؟
ج۔ کوئی بھی نہیں.. پہلے حمزہ علی عباسی بہت پسند تھا۔
س: پسندیدہ ایکٹرس؟
ج. عائزہ خان، ایمن
س: پسندیدہ اسکالر؟
ج۔ مولانا طارق جمیل صاحب اور میں ان ہی کے بیان سنتی ہوں اور ان ہی کہ ایک بیان کے بعد میری گانوں وغیرہ سے دلچسپی ختم ہوگئی ہے.. ڈرامے اور فلمز تو میں پہلے ہی نہیں دیکھتی تھی ٹائم ہی نہیں ملتا۔
س: پسندیدہ کتاب؟
ج۔ قرآن پاک
س: پسندیدہ مصنف؟
ج۔ نمرہ احمد، سعود ظفر، اقبال ہاشمی
س: اپنے خو ۔ کے ناول کا پسندیدہ کردار؟
ج۔ عالیان مصطفیٰ، شمس.. ویسے تو سبھی پسند ہیں
س: پسندیدہ گانا؟
ج۔ کوئی بھی نہیں۔
س: پسندیدہ فلم؟
ج۔ اب کوئی بھی نہیں ہے.. اسکول کے زمانے میں تھی عجب پریم کی غضب کہانی.. اور میں دن بھر اسی فلم کے ڈائیلاگ بول بول کر گھر والوں کا سر کھاتی تھی.. (ہنستے ہوئے)
س: پسندیدہ ڈرامہ؟
ج۔ کوئی بھی نہیں
س: فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟
ج۔ بک ریڈنگ یا تصوراتی دنیا میں کھو جانا۔
س: غصہ کم آتا ہے یا زیادہ؟
ج۔ اول تو آتا نہیں اگر آجائے تو بہت زیادہ، مجھ میں یہی خامی ہے غصہ بہت خراب ہے غصے میں اندھی ہوجاتی ہوں۔
س: عام طور پہ کس بات پہ زیادہ غصہ آجاتا ہے؟
ج۔ جب کوئی پڑھتے وقت تنگ کرتا ہے۔
س: غصے کو کنٹرول کیسے کرتی ہیں؟
ج۔ روم میں خود کو لاک کر کے سوجاتی ہوں یا رو لیتی ہوں۔
س: آپ کے خیال میں آپ کی سب سے اچھی عادت کون سی ہے۔
ج۔ میں لوگوں کے جذبات کو اچھے سے سمجھتی ہوں، مجھے دوسروں کو فیل کرنا آتا ہے اور خوشی سے لوگوں کی مدد کرتی ہوں پھر چاہے خود ہی مشکل میں کیوں نہ پھنس جاؤں۔
س: اور بری عادت؟
ج۔ غصہ، لوگوں پہ جلد بھروسہ کرنا۔
س: کسی شخص سے پہلی ملاقات میں کس چیز کا اندازہ لگاتی ہیں؟
ج۔ میں انسان کے بات کرنے کے انداز سے فیملی کا اندازہ لگاتی ہوں کہ اس انسان کہ گھر کا ماحول کیسا ہے.. آپ نے بھی سنا ہوگا انسان کے بولنے، اور بی ہیوئر سے فیملی کا پتا لگتا ہے کہ وہ کس فیملی سے تعلق رکھتا ہے...
س: گھر سے جاتے ہوئے کیا چیز ساتھ لازمی رکھتی ہیں؟
ج۔ موبائل ہی ہوتا ہے۔
س: کون سے رائٹر سے متاثر ہیں؟
ج۔ نمرہ احمد
س: اپنی سائیڈ ٹیبل پہ کیا چیزیں رکھتی ہیں؟
ج۔ موبائل
س: آپ کا وہ رشتہ جو آپ کو سب سے عزیز ہے؟
ج۔ والدین
س: سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئیں یا محنت سے.

آگے بڑھی؟

ج۔ دونوں..

س: آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

ج۔ شکر اللہ پاک کا جو مجھے اچھا بنایا ہے۔

س: صبح اٹھتے ہی پہلا کام جو آپ ہمیشہ کرتی ہیں؟

ج۔ فجر کی نماز.. ویسے پہلے نظر وال کلاک پہ جاتی ہے تو پہلا کام ٹائم دیکھنا ہی ہوتا ہے (شریر انداز سے)

س: آپ کو اگر ایک دن کی حکومت ملے تو کون سا کام کرنا چاہیں گی؟

ج۔ کرپشن ختم کرنے کی پوری کوشش۔۔

س: آپ کے خاندان میں کوئی اور بھی شاعر، رائٹر، ہے؟

ج۔ بابا کے ماموں نسیم حجازی

س: کیا آپ کو اس سفر میں مشکل یا رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا؟

ج۔ فی الحال تو نہیں.. اللہ پاک کا شکر ہے۔

س: اور کیا چاہتی ہیں؟

ج۔ کچھ بھی نہیں الحمدللہ اللہ پاک نے ہر نعمت سے نوازا ہے اور میں اپنے رب کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے بس مرنے سے پہلے ایک بار مکہ مدینہ جانا چاہتی ہوں..

س: جب آپ کے مداح آپ کی تعریف کرتے ہیں تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟

ج۔ جی بہت اچھا محسوس ہوتا ہے اپنی تعریف کسے پسند نہیں ہوتی (ہنستے ہوئے)

س: کوئی کمی جو آپ کو اپنی ذات میں محسوس ہوتی ہو؟

ج۔ بہت سی ہیں کوئی بھی انسان پرفیکٹ نہیں ہوتا۔

س: کالم نگاری کافی مشکل شعبہ ہے تو اس میں مخالفت کا سامنا ہوا؟

ج۔ نہیں الحمدللہ سب نے سراہا ہے

س: کبھی ایسا ہوا کہ کالم کا موضوع ملا ہو اور آپ سے لفظ روٹھ گئے ہوں؟

ج۔ جی بالکل ایسا ہوا ہے اب جب بھی الفاظ ذہن میں دستک دیتے ہے۔ میں فوراً موبائل میں لکھ کر سیو کر لیتی ہوں۔

س: کہانیاں کن موضوعات پہ لکھنا پسند ہیں؟

ج۔ مختلف موضوعات پہ، میں اب آرمی پہ کچھ لکھنا چاہتی ہوں اور انشاللہ زندگی رہی اور میرے اللہ پاک نے چاہا تو میں ضرور لکھوں گی۔

س: افسانہ، ناول، ناولٹ، میں کیا فرق ہے؟

ج۔ افسانہ دو یا تین صفحوں میں سبق آموز تحریر ہوتی ہے، ناولٹ افسانے سے بڑا ہوتا ہے ناول ناولٹ سے بڑے ہوتے ہے جو قسط وار بھی چلتے ہے۔

س: نئے رائٹرز کو پہلے کس پر طبع آزمائی کرنی چاہیے افسانہ، ناولٹ، ناول؟

ج۔ افسانہ

س: افسانہ لکھنا آسان ہے یا ناول؟

ج: مجھے تو ناول زیادہ آسان لگتا ہے.. لیکن افسانہ آسان ہے۔

س: کہانی کے کردار آپ کے ذہن کی اختراع ہوتے ہیں یا معاشرے میں چلتے پھرتے لوگوں سے موضوع مل جاتے ہیں؟

ج۔ دونوں مگر میرے پہلے ناول کے کردار میرے آس پاس کے تھے۔

س: کون سی تحاریر زیادہ قارئین کی پسندیدہ رہیں؟

ج۔ اب تک دو ناول آئے اور کچھ افسانے لکھے ہے تو دونوں ناول ہی پسند کئے گئے ہیں۔

س: آپ کی کتنی کتابیں مارکیٹ میں دستیاب ہیں؟

ج۔ میں نئی رائٹر ہوں اور فی الحال ایک ہی کتاب ہے "احبک" یہ ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی مجھے تم سے محبت ہے..

س: کتنے سالوں سے لکھ رہی ہیں۔

ج۔ دو سال

س: لکھنے کا آغاز کیسے کیا؟

ج. مجھے لکھنے کا شوق شروع سے تھا چھوٹی تھی تو بس اپنی طرف سے کوئی نہ کوئی کہانی لکھتی رہتی تھی، پھر وقت کے ساتھ ساتھ لکھنا چھوڑ دیا یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ بڑے ہو کر بھی لکھوں گی مگر جب 19 سال کی عمر میں پہلی بار نمرہ احمد کو پڑھا تو خاصی متاثر ہوئی پھر بس دل میں کہیں دور سے آواز آئی کہ منتہا ایک بار پھر سے قلم تھام لو تو بس پھر اللہ پاک کا حکم ہوا اور تھام لیا پھر 19 سال کی عمر میں پہلا ناول لکھا۔

س: پہلی تحریر ہی شائع ہوگئی؟

ج. جی افسانہ ہوا..

س: کتنی تحریر مسترد ہوئیں؟

ج۔ ایک ناولٹ وہ بھی اس لیے کیونکہ اس میں اداسی بہت ہے بس میں نے اداسی اس لیے بھی لکھی کیونکہ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ میں کس حد تک اداسی لکھ سکتی ہوں اور دوسرا یہ کہ میرے قارئین کی بھی فرمائش تھی کہ میری تحریروں میں فن ہوتا ہے اب اداسی لکھیں ہم پڑھنا چاہتے ہے..

س: اپنے لکھے سے مطمئن ہیں؟

ج۔ سچ کہوں تو پتا نہیں، مجھے ابھی بہت سیکھنا ہے۔

س: کبھی کسی کہانی پہ تنقید کا سامنا کرنا پڑا تو آپ کا ردعمل؟

ج۔ کچھ نہیں سب کا حق ہوتا ہے تنقید کرنے کا میں نے پہلے ناول کے پیش لفظ میں بھی ایک بات کہی تھی کہ قارئین نے مختلف رائٹرز کو پڑھا ہوتا ہے سب کا الگ انداز ہوتا ہے لازمی نہیں کہ آپ کو ہر ایک رائٹر پسند آئے، اور کہانی کوئی بھی ایک جیسی نہیں ہوتی بس ہماری سوچ کا فرق ہوتا ہے کبھی کبھی ہمیں ایسا لگتا ہے کہ یہ کہانی ہم نے پڑھ رکھی ہے مگر ایسا نہیں ہوتا .. بس یہی کہوں گی پلیز نیو رائٹرز کو سمجھیں اور انہیں سپورٹ کریں۔

س: کن موضوعات پر لکھنا چاہتی ہیں اور لکھ نہیں پاتیں؟

ج۔ آرمی پر بس ہمت نہیں کر پاتی۔

س: آپ کے ناول یا افسانے میں موجود لڑکی محبت کی راہوں پر چل نکلی ہو۔ اور بغاوت پر اتر آئی ہو۔ تو ایسے میں محبت اور عزت میں سے کیسے معتبر بناتی ہیں؟

ج۔ عزت اس کے لیے سب سے پہلے ہوتی ہے۔

س: ہر کہانی کا اینڈ خوشگوار ہونا ضروری ہے کیا؟

ج۔ بالکل بھی نہیں، مگر ہمارے قارئین کو خوشگوار اینڈ پسند ہوتا ہے۔

س: سبق آموز کہانی سے قارئین سبق حاصل کرتے ہیں کیا؟

ج. جی بالکل کرتے ہے مگر وہ جو دل سے اور تحریر کو محسوس کر کے پڑھتے ہے ہیں۔

س: کوئی ایک کتاب جو آپ بھول نہیں پائیں؟

ج. مصحف

س: آج کے مصنف، شاعر، کالم نگار کو کیا معاشی طور پر اطمینان بخش معاوضہ مل رہا یا نہیں؟

ج۔ نہیں

س: قلم کا حق کس طرح ادا کرتی ہیں؟ یا کس طرح ادا ہو سکتا ہے؟

ج. اچھی باتیں لکھ کر جو قارئین کے دل پے اثر کرے۔

س: جو رائٹر ڈرامہ لکھنے لگے ہیں۔ ان کے لئے کوئی پیغام؟

ج. اللہ پاک آپ لوگوں کو مزید کامیابی عطا فرمائے۔ آمین

س: آپ کی کامیابی میں کس کا زیادہ ہاتھ ہے گھر

میں سے۔؟اور کس شخصیت کی رہنمائی نے آپ کو کامیابی کی جانب بڑھایا؟

ج. ویسے تو سب نے ہی بہت سپورٹ کیا ہے، مگر زیادہ بابا جان اور میری بیسٹ فرینڈ کومل..

س: فارغ وقت کے پسندیدہ مشاغل؟

ج۔لکھنا یا سوشل میڈیا

س: ڈپریشن میں کیا کرتی ہیں؟

ج۔اللہ پاک سے دعائیں..

س: شہرت ایک نشہ ہے کیا؟

ج. جی بالکل

س: کیا تدبیر سے تقدیر بدل سکتی ہے؟

ج. جی بالکل

س: انٹرنیٹ کے استعمال کی حامی ہیں یا مخالف؟

ج. حامی، اگر پازیٹو یوہو

س: آپ کا پسندیدہ رشتہ، رنگ، خوشبو، تہوار، تفریحی مقام، کھیل کون کون سے ہیں؟

ج. رشتہ تو ماں باپ کا، مٹی کی خوشبو بہت پسند ہے، سب تہوار، مری، سوات، کرکٹ پسند ہے..

س: فضول خرچ ہیں؟

ج۔بالکل بھی نہیں۔

س: کتابیں خریدنا پسند کرتی ہیں یا کوئی گفٹ کرے؟

ج۔دونوں

س: نئے رائٹرز کو بہترین لکھنے کی کچھ ٹپس دیجئے۔

ج۔ میں تو خود نئی ہوں (ہنستے ہوئے) ویسے میں یہی کہوں گی کہ آپ جس موضوع پہ لکھیں اچھے سے ریسرچ کر کے لکھیں..

س: آپ روزانہ مطالعہ کرتی ہیں یا کبھی کبھی؟

ج. روزانہ جب بھی وقت ملے..

س: مستقل اور دلچسپی سے کس ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتیں ہیں؟ کوئی خاص وجہ؟

ج. سچ کہوں میں نے کبھی کوئی ڈائجسٹ نہیں پڑھا جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکی ہوں میں ناول نہیں پڑھتی تھی 19 سال کی عمر میں نمرہ احمد کا پہلا ناول پڑھا تھا وہ بھی گوگل سے..

س: آپ کی نظر میں ادب کی دنیا میں ممتاز نام کس کا ہے۔

ج. بانو قدسیہ آپا، نسیم حجازی، اشفاق احمد، فیض احمد فیض

س: آپ اگر رائٹر\ پوائیٹر نہ ہوتی تو؟

ج. تو میں کمپیوٹر سائنٹسٹ ہوں (ہنستے ہوئے)

س: کبھی لکھنے کی شدید خواہش ہو اور کاغذ قلم دسترس سے دور ہو؟

ج. موبائل زندہ باد

س: لکھنے کے لیے قلم استعمال کرتی ہیں یا ٹائپنگ کرنی آسان لگتی ہے۔

ج. قلم، ٹائپنگ مشکل لگتی ہے

س: ریشم ڈائجسٹ کیسا لگا؟

ج. ماشاللہ بہت اچھا ڈائجسٹ ہے اللہ پاک مزید کامیابی سے نوازے آمین۔ ریشم ڈائجسٹ کی پوری ٹیم ماشاللہ بہت عمدہ ہے اور ریما نور رضوان صاحبہ تو مجھے شروع سے ہی بے حد پسند ہیں ملنسار، محبت بانٹنے والی، ہمیشہ خوش رہیں۔آمین

س: ریشم ڈائجسٹ قارئین کے لیے کوئی پیغام دیجئے؟

ج: پیارے قارئین ہمیشہ خوش رہیں اور پلیز تحریریں دل سے محسوس کر کے پڑھا کریں، ایک رائیٹر بہت محنت اور دل سے محسوس کر کے ہی لکھتا ہے اور وہ بدلے میں آپ سے بھی یہی امید رکھتا ہے کہ آپ بھی محسوس کر کے پڑھیں اپنا بہت خیال رکھا کریں اور ریشم ڈائجسٹ پڑھتے رہیں۔

☆☆☆

روحانی معالج

نوٹ: کسی بھی آیت کو پڑھنے سے پہلے اول و آخر طاق میں درود شریف پڑھنا
نہ صرف اجر و ثواب کا موجب بنتا ہے بلکہ کام میں بھی یقینی کامیابی ہوتی ہے

دل و دماغ پر بوجھ

دل و دماغ پر قرض یا کاروبار کی پریشانی کا بوجھ ہو تو نماز فجر کے بعد 7 بار آیت الکرسی اور ایک تسبیح (یا فتاح یا رزاق) پڑھ کر دعا کریں۔ کاروبار شروع کرنے سے پہلے سورۃ کوثر اور سورۃ اخلاص ایک ایک بار پڑھ کر دونوں ہاتھوں پر دم کر کے ہاتھ چہرے پر پھیر لیا کریں۔ اللہ تعالیٰ وسائل و اسباب میں فروانی عطا فرمائے گا۔ انشاء اللہ

☆☆☆

جلد شادی کے لیے

اس عمل کا کثرت سے ورد کرتے رہنے سے لڑکیوں کی شادی کے معاملے میں مشکلات دور ہو کر آسانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ عمل یہ ہے (یا لطیف یا حلیم) 500 بار بعد از نماز عشاء اول و آخر درود شریف 7,7 مرتبہ پڑھیں۔ یہ عمل عورت یا لڑکی خود کرے۔ انشاء اللہ شادی میں حائل تمام مشکلات دور ہو جائیں گی اور جلد رشتہ طے ہو جائے گا۔

☆☆☆

ہر حاجت پوری

ہر فرض نماز کے بعد سجدے میں جا کر اول و آخر درود شریف کے بعد 21 بار (یا ذالجلال والاکرام) پڑھیں اور پڑھ کر جو بھی دعا مانگیں قبول ہوگی۔ انشاء اللہ

☆☆☆

بانجھ عورت کے اولاد ہونا

اگر کوئی شخص اولاد سے محروم ہو اور عورت بانجھ ہو اس کے اولاد نہ ہوتی ہو تو اس کے لیے یہ عمل بہت مجرب ہے۔ انجیر کے دس دانے لے کر دھو لیں اور دس مرتبہ درود شریف اول و آخر اور درمیان میں (سورۃ الطارق) پوری سورت دس مرتبہ پڑھ کر انجیر کے دانوں پر دم کرے اور یہ دس انجیر کے دانے عورت رات کو سوتے وقت کھا کر ایک پاؤ دودھ پی لے۔ یہ عمل ستر دن کرنا ہے اس دوران عورت دو رکعت نماز صلوٰۃ الحاجت پڑھتی رہے۔ اس عمل کی برکت سے انشاء اللہ تعالیٰ بانجھ پن ختم ہوگا اور اللہ تعالیٰ اولاد عطا فرمائے گا۔

☆☆☆

مچھروں سے بچاؤ کے لیے

وما لنا ان لانتوکل علی اللہ سے المتوکلون تک (وما ابری 146) پانی پر تین مرتبہ پڑھ کر دم کرو اور پانی چھڑک دو۔ انشاء اللہ مچھر جہاں پانی چھڑکا جائے گا ہرگز نہیں آئیں گے۔ دور دور ہی رہیں گے۔

☆☆☆

بدن پر ہتھیار اثر نہ کرے

تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ جس کے پاس سورۃ ہود اسی نیت سے لکھی ہوئی محفوظ ہوگی۔ اس پر کسی قسم کا کوئی ہتھیار بفضل خدا اثر نہیں کرے گا۔

خودکلامی

ترتیب: حمیرا وحید

کیسا موسم ہے کہ خدا جانے
اپنے گھر میں بھی جی نہیں لگتا
(فریدہ جاوید فری، لاہور)

تاریک سفر میں جو اجالوں کی طرح ہے
ایک شخص محبت میں مثالوں کی طرح ہے
رکھتی ہوں عقیدت اس نسبت سے کہ وہ بھی
آنچل کی حفاظت میں جیالوں کی طرح ہے
(مسز نگہت غفار، کراچی)

صبح کو سوگ منائیں گے تو شب روئیں گے
جو کبھی پہلے نہ روئے تھے وہ اب روئیں گے
نوحہ گر کون نہیں ہو گا، یہاں تیرے لیے
تو ہے محبوب سبھی کا تجھے سب روئیں گے
(پرنس افضل شاہین، بہاولنگر)

کبھی لبوں پر بچھا لیا چپ کا جال میں نے
کبھی ہنسی میں چھپا لیا دل کا حال میں نے
(مقصود احمد بلوچ، میاں چنوں)

چاہتوں کے دائرے سے جب نکل جاتے ہیں لوگ
راستوں کے ساتھ چہرے بھی بدل جاتے ہیں لوگ
(چمن زیب، سیالکوٹ)

اب کر کے فراموش تم کیا فریاد کرو گے
جو نہ ہوں گے ہم تو بہت یاد کرو گے
(عبید اللہ، ڈیرہ غازی خان)

چہرے کا ہے رنگ خزاں کے پتے سا
اترا کیسا زرد ملال جدائی کا
چمکا ایک ہی نام دعا کے ماتھے پر
کیا کرتا میں اور سوال جدائی میں
(سعدیہ کنول، ڈسکہ)

لہو چھڑکا تھا ہم نے تیرے دل کے ریگستاں میں
اگر خزاں اب نہ ہوتی تو قیامت ہوتی
(ریاض ندیم نیازی، سبی)

اس کا انتظار کرتے کرتے خزاں ہو گئی
اب تو تیرے آنے کی امید بھی ختم ہو گئی
(شاہ زیب، سکھر)

ویران رستے اور سوکھے ہوئے شجر
کتنا اداس تھا بیاباں کوئی ہم سے پوچھتا
(ممتاز احمد، سرگودھا)

منسوب تھے جو لوگ میری زندگی کے ساتھ
اکثر وہی ملے ہیں بڑی بے رخی کے ساتھ
(حسن نظامی، قبولہ شریف)

محبت کی اسیری سے رہائی مانگتے رہنا
بہت آساں نہیں ہوتا جدائی مانگتے رہنا
(محسن علی طاب، ساہیوال)

لہو دل کا جلاؤ تم محبت سانس لیتی ہے
غزل تازہ سناؤ تم محبت سانس لیتی ہے

ابھی کچھ وقت باقی ہے ابھی امید قائم ہے
کہیں سے لوٹ آؤ تم محبت سانس لیتی ہے
(فوزیہ یاسمین، راولپنڈی)

میں وفات کے اس مرحلے میں ہوں یہاں
میں خود باتیں اپنے خلاف کرتا ہوں
(عدیل، ملتان)

تجھے اظہار محبت سے اگر نفرت ہے
تو نے ہونٹوں کو لرزنے سے تو روکا ہوتا
بے نیازی سے مگر کانپتی آواز کے ساتھ
تو نے گھبرا کے میرا نام نہ پوچھا ہوتا
(نازیہ شاہین، لالہ موسیٰ)

آنکھوں کا رنگ، بات کا لہجہ بدل گیا
وہ شخص ایک شام میں کتنا بدل گیا
(صوفیہ اصغر، لاہور)

دل تیری یاد سے بے زار بھی ہو سکتا ہے
یعنی اب عشق سے انکار بھی ہو سکتا ہے
(مہران گلزار، خانیوال)

خاموش چاہتوں کی مہک اس طرف بھی ہے
جو میرے دل میں ہے وہ کسک اس طرف بھی ہے
(اسد محمود، مری)

رونا بھی چاہیں تو رونے نہیں دیتا
وہ شخص پلکیں بھی بھگونے نہیں دیتا
(فہد، گوجرانوالہ)

کہو تو نام دے دوں اسے محبت کا
جو اک الاؤ ہے جلتی ہوئی رفاقت کا
(طلحہ حسنین، گجرات)

ہم نے اپنی طبیعت کو ایک سا رکھا
موسم تھے کہ اپنے مزاج بدلتے رہے
(آمنہ بی بی، مانسہرہ)

آنسو رکے ہیں تو آنکھ کو کچھ فرصت ہوئی ہے آج
خزاں گل چمن سے رخصت ہوئی ہے آج
(ثمرین، آزاد کشمیر)

زرد موسم نے آلیا انہیں بھی اپنی لپیٹ میں
جن کے چہرے کبھی گلاب ہوا کرتے تھے
(ملیحہ اعوان، اسلام آباد)

اداس موسم آرہے ہیں پھر سے
میری آنکھیں میرا ضمیر لوٹا دے مجھ کو
(زویا خان، مستونگ)

لوگ خود ہی جان گئے اداسیوں کا سبب
نام وفا کا تو میں نے لیا ہی نہیں
(مہک علی، گوجرانوالہ)

ایک لمحے کا تعلق بھی بہت ہوتا ہے
عشق کو سود و زیاں میں نہیں رکھا جاتا
(سلمیٰ عزیز، جھنگ)

خط سیاہی سے لکھنا تھا لکھ دیا خون سے
اگر میں نہ رہا تو کیسے رہو گی سکون سے
(سید عارف شاہ، جہلم)

ہر شخص تیرے جسم کا بھوکا ہے اور بس
میں ٹھیک کہہ رہا ہوں میرا اعتبار کر
(ڈاکٹر طارق محمود آکاش)

آپ کے اوراق

ترتیب: عبداللہ مسرور

دعا

اے میرے رب میں عاجز ہوں تیرے سوا کسی کی حمد سے، اے میرے رب بزرگ و برتر میں بیزار ہوں تیرے سوا کسی خواہش سے، اے میرے مالک میں لاتعلق ہوں تیرے سوا کسی تعلق سے، اے میرے اللہ میں ناامید ہوں تیرے سوا کسی مدد سے، اے میرے ذوالجلال والاکرام میں متقاضی ہوں تیرے جودوسخا کی، تیرے نظر کرم کی، اے رب السموات والارض میں دعا گو ہوں تیرے رحم وعفو ودرگزر کی، تیرے سوا کون ہے جس کی آس رکھوں تیرے سوا کون ہے جس سے آس لگاؤں .. گر تو مجھ سے راضی ہے تو مجھے کسی کی ناراضگی کی پرواہ نہیں ایک تو مجھے خود سے راضی کر لے ایک تو مجھ سے راضی ہو جا.. مجھے تو ہی کافی ہے میرے اللہ.. اپنی رحمتوں برکتوں سے دو جہاں کو شاد کر دے اپنی مخلوق کی وحشتوں کو سکینت کر دے۔ اپنے ذکر کی توفیق دیتا ہے۔ اے میرے رب تو ہمیں اپنی رضا میں تجھ سے راضی کر لے۔ (اللھم آمین)

(انتخاب ریما نور رضوان، کراچی)

❄❄❄❄❄❄

اقوال زریں

☆ خوش قسمت ہے وہ شخص جو خوشی کو چھاؤں اور غم کو دھوپ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

☆ اچھے الفاظ کہنے والے پر غور کرو نہ کہ اس کی ذات پر

☆ اگر تم کچھ سیکھنا چاہتے ہو تو کنارے پر نہ کھڑے رہو۔

☆ ہر انسان اپنے ساتھ ایک بے باک رہبر رکھتا ہے اور وہ ہے اس کا ضمیر

☆ جو شخص منہ سے میٹھی بات کہتا ہے اس کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔

(فیصل مشتاق، قبولہ شریف)

❄❄❄❄❄❄

آزمائش

رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے ایک نئی قسم کا ناشتہ کھا رہا تھا، جب میری آنکھ کھل گئی۔

اچھا تو پھر کیا ہوا۔ عمران نے دلچسپی سے پوچھا۔

میں نے دیکھا کہ میرے فوم کا گدا ایک طرف سے غائب تھا۔

(فریدہ جاوید فری، لاہور)

❄❄❄❄❄❄

والدین

میرے والدین میں تیرا سہارا بنا چاہتا ہوں
جاگنے کے بعد اور سونے سے پہلے تجھے دیکھنا چاہتا ہوں
جو بات ہر کسی سے چھپانا ہے مجھے
وہ بات دل کی تجھے بتانا چاہتا ہوں
جب تک ماں باپ میرے حیات ہیں

بنا ڈر کے ہر مشکل سے بھی ٹکرانا چاہتا ہوں
والدین ایک انمول رشتہ ہے دنیا میں
بات یہ سب کو میں بتانا چاہتا ہوں
یہ ایک ایسا ساتھ ہے جو بن مانگے ملتا جاتا ہے
میرے والدین کا سایہ مجھ پر ہے اس لیے مسکراتا رہتا ہوں
اے زندگی اگر تو روٹھ جائے تو مجھے غم نہیں
ساتھ میرے والدین کا نہ چھوٹے میں یہ چاہتا ہوں
اپنے سارے غم والدین کی گود میں ڈال کر
بے فکری کی نیند سوتا رہتا ہوں
اللہ سب کے والدین کو لمبی زندگی عطا کرے
یہ ہی دعا سب سے کروانا چاہتا ہوں

(حمیرا وحید، واہ کینٹ)

******

پستی کی بدولت

بارش کا ایک قطرہ بادل سے ٹپکا سمندر کی وسعت دیکھ کر شرمندہ ہوا۔ سوچا اتنے وسیع سمندر کے سامنے میری کیا حیثیت ہے جب اس قطرے نے خود کو حقیر جانا تو سب نے اسے محبت سے اپنی آغوش میں لے لیا۔ زمانے کی گردش نے اسے بادشاہ کے تاج کا موتی بنا دیا۔ اس نے یہ عظمت پستی کی بدولت پائی۔

(مسز نگہت غفار، کراچی)

******

محبت

چار لفظوں کو مجموعی طور پر جوڑنے کو محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ مگر یہ انسانی خمیر میں شامل، خیر سے گندھا ہوا وہ انمول جذبہ ہے جو دل کی دھڑکن اور سانس کی ڈور سے کسی اٹوٹ اور دائمی رشتے کی مانند جڑا ہوا ہے۔ کہکشاں کے سبھی ستارے، دھنک کے سارے رنگ اور قدرت کے سبھی مناظر اس کے مقابل ہیچ نظر آتے ہیں۔ اس کی خوشبو سے روح معطر، چاشنی سے دل و دماغ سرشار جبکہ اس پر ایقان بندے کو رب کے بہت قریب لے جاتا ہے۔ محبت ایک بے موسمی پھل ہے جو پت جھڑ، ساون، بسنت اور بہار کے سبھی ذائقے اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ تو وہم و گمان، زبان و بیاں اور زمان و مکان کی قید سے آزاد خلائے بسیط کی وسعتوں تک میں پھیلی ایک لامحدود نعمت ہے جو ازل سے ابد، شروع سے آخر اور زمین سے آسماں تک ہمیشہ موجود رہنے کے لیے بچھا دی گئی ہے۔

اکثر لوگ محبت کے مفہوم کو نہیں سمجھتے۔ یہ کس طرح دل پر وار کرتی ہے اور کتنے رنگ بدلتی ہے۔ محبت وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر ٹھنڈی آہیں بھرنے، غمگیں نغمے سننے، ناول اور افسانے پڑھنے کا نام ہی نہیں۔ نا ہی یہ کوئی بازاری کھلونا ہے کہ پسند آنے پر دل بچوں کی طرح مچل اٹھے۔

محبت ہونا بھی ہر کسی کے نصیب میں نہیں۔ یہ تو ایک عطا ہے گوہر نایاب ہے جو صرف نصیب والوں کو ہی ملتا ہے۔

(ایم حسن نظامی، قبولہ شریف)

******

انمول موتی

☆ جانور میں خواہش اور فرشتے میں عقل ہوتی ہے مگر انسان میں دونوں ہوتی ہیں اگر وہ عقل کو دبا لے تو جانور، اگر خواہش کو دبا لے تو فرشتہ۔

☆ بدی کی تلاش ہو تو اپنے اندر جھانکو نیکی کی تلاش ہو تو دوسروں میں ڈھونڈو۔

☆ بے اعتدالی کی اس سے بڑی سزا کیا ہو سکتی ہے کہ انسان کو خوراک کے بجائے دوا کھانی پڑے۔

☆ حقیقی سخاوت یہ ہے کہ مخلوق خدا کو تکلیف سے

بچانے کے لئے خود تکلیف اٹھالو۔

(پرنس افضل شاہین، بہاولنگر)

******

معلومات

وہ کون سے 7 جاندار ہیں جو بغیر ماں کے پیدا ہوئے۔

1- حضرت آدم علیہ السلام۔

2- حضرت حوا۔

3- حضرت محمد ﷺ کو معراج پر لے جانے والی براق۔

4- حضرت صالح کی اونٹنی۔

5- حضرت یونس کو پیٹ میں رکھنے والی مچھلی۔

6- حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے بننے والا اژدھا۔

7- حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے وقت آنے والا دنبہ۔

(مرسلہ: مقصود احمد بلوچ، لاہور)

******

نہیں تم جھوٹ کہتی ہو

نہیں تم جھوٹ کہتی ہو
کہ تم کو مجھ سے نفرت ہے
مجھے معلوم ہے اتنا
کہ تم جتنا بھی چاہو
مجھ سے نفرت کر نہیں سکتیں
نہیں تم جھوٹ کہتی ہو
چلو، میں چند لمحوں کے لیے یہ مان لیتا ہوں
کہ تم کو مجھ سے نفرت ہے
مگر یہ بھی تو میرے واسطے اعزاز ہے جاناں
کہ تم نے زندگی میں گر محبت کی تو مجھ سے کی
جو نفرت کی تو مجھ سے کی

(مہناز شاہد، ملتان)

******

زینت

☆.....دنیا کی زینت 4 چیزیں ہیں۔
ماں باپ، نیک اولاد، نیک بیوی، دانا دوست

☆.....آخرت کی زینت 4 چیزیں ہیں۔
علم، تقویٰ، صدقہ، حقوق العباد

☆.....جسم کی زینت 4 چیزیں ہیں۔
کم کھانا، کم سونا، کم بولنا، کم ہنسنا

☆.....دل کی زینت 4 چیزیں ہیں۔
صبر، ذکر، غور و فکر، شکر

☆.....ایمان کی زینت 4 چیزیں ہیں۔
حیاء، پاکیزگی، سچائی، عدل

اللہ پاک ہم سب کو ان تمام زینتوں سے آراستہ فرمائے۔ (آمین)

(ڈاکٹر طارق محمود آکاش، سیالکوٹ)

******

صدقہ

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تمہارا اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے مسکرانا صدقہ ہے۔ تمہارا کسی کو نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا صدقہ ہے، کسی بھولے ہوئے کو راستہ بتانا صدقہ ہے، کمزور نگاہ والے کو راستہ دکھانا صدقہ ہے۔ پتھر، کانٹا، ہڈی (وغیرہ) کا راستہ سے ہٹا دینا صدقہ ہے اور تمہارا اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی ڈال دینا صدقہ ہے۔'' (ترمذی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

''جو شخص اپنے کسی بھائی کے کام کے لئے چل کر جاتا ہے تو اس کا یہ عمل دس سال کے اعتکاف سے افضل ہے۔ جو شخص ایک دن کا اعتکاف بھی اللہ تعالیٰ کی رضا

کے لئے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے اور جہنم کے درمیان تین خندقیں آڑ فرما دیتے ہیں۔ ہر خندق آسمان و زمین کی مسافت سے زیادہ چوڑی ہے۔''

(طبرانی، مجمع الزوائد)

❄❄❄❄❄❄

وعدہ......!

وعدہ بھی بڑا عجیب لفظ ہے۔ اس ایک لفظ پر انسان پوری زندگی گزار دیتا ہے۔ وعدے کے بارے میں کوئی کچھ کہتا ہے تو کوئی کچھ۔ کچھ لوگ وعدے کے اتنے پکے ہوتے ہیں کہ وعدہ پورا کرنے کے لیے جان بھی دے دیتے ہیں جبکہ کچھ لوگوں کیلئے وعدہ اک مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ایسے لوگ وعدے نبھانے کے لئے نہیں بلکہ توڑنے کے لیے کرتے ہیں۔ پتہ نہیں لوگ وعدے توڑتے کیوں ہیں؟ شاید دوسروں کے جذبات سے کھیل کر وہ تسکین محسوس کرتے ہیں۔

وعدے کا اک نام امید ہے اور کہتے ہیں کہ ''امید پر دنیا قائم ہے'' لوگ سمجھ جانے کے باوجود وعدوں پر اعتبار کرتے نظر آتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کسی نے وعدہ کیا تھا۔ زندگی بھر ساتھ رہنے کا لیکن! پتہ نہیں اس کی کوئی مجبوری تھی یا وہ بھی محض میرے جذبات سے کھیل رہا تھا۔ پھر بھی میں زندگی بھر اپنے وعدے کی خاطر اس کا انتظار کروں گی۔

ہم وفا کرتے رہے وہ جفا کرتے رہے
اپنا اپنا فرض تھا' دونوں ادا کرتے رہے

(ماہ نور، کراچی)

❄❄❄❄❄❄

خوف

فقیر نے راہ گیر سے کہا: '' اللہ کے نام پر پانچ روپے دے دو، ورنہ مجھے ایک ایسا خوفناک کام کرنا پڑے گا، جس کے خیال سے ہی میری روح کانپ جاتی ہے، رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔''

راہ گیر نے خوفزدہ ہو کر فقیر کو پانچ روپے دیئے اور ڈرتے ہوئے پوچھا: '' بابا جی اب بتائیں کون سا خوفناک کام کرنا پڑتا آپ کو؟''

فقیر اطمینان سے بولا: ''محنت مزدوری۔''

(نبیل عابد، لاہور)

❄❄❄❄❄❄

حیرت

''تمہاری عمر کتنی ہے؟'' ٹیچر نے پوچھا۔

''آٹھ سال۔'' بچی نے جواب دیا۔

''ناممکن تمہاری عمر یقیناً زیادہ ہو گی کسی لڑکی کی گردن صرف آٹھ سال میں اتنی میلی نہیں ہو سکتی۔''

(منیب غفار، لاہور)

❄❄❄❄❄❄

رائے

ایک بزرگ شاعر ایک دن دوستوں کی محفل میں شکوہ کر رہے تھے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے گھر والوں کی ہر ممکن دیکھ بھال اور حفاظت کرتا ہوں۔ ہر طرح کی آسائش میں نے ان کو مہیا کی ہے مگر پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے گھر والے مجھے پسند نہیں کرتے۔''

ان کے قریب بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے سنجیدگی سے کہا یہ محض آپ کا خیال ہے کہ آپ کے گھر والے آپ کو پسند نہیں کرتے۔ باہر والے بھی آپ کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں۔''

(صائمہ، کراچی)

❄❄❄❄❄❄

باتیں صحت کی

ڈاکٹر اظہر سعید

چکنائی نہیں پیل

اچھی غذا وہ ہے جو ہماری صحت اور دل پر اچھے اثرات مرتب کرے۔ ہماری غذا میں بعض ایسی چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں جو دل کی صحت کے لئے موزوں نہیں ہوتیں' جیسے چکنائی دل کے لئے مضر ثابت ہوتی ہے۔

غذا میں دو طرح کی چکنائیاں ہوتی ہیں۔ سیر شدہ چکنائی اور غیر سیر شدہ چکنائی' مائع چربی یا تیل غیر سیر شدہ ہوتے ہیں۔ غیر سیر شدہ چکنائی دل کے لیے مفید ہوتی ہے۔ اس کی بہترین مثال زیتون کا تیل ہے۔ اس کے استعمال سے کولیسٹرول پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ٹھوس چکنائی کو سیر شدہ چکنائی کہا جاتا ہے۔ گائے' بھیڑ اور دوسرے گوشت میں چربی کی جو سفید لائنیں ہوتی ہیں وہ سر شدہ چکنائی ہوتی ہے۔ مکھن' پنیر اور چکنائی والے دودھ میں بھی سیر شدہ چکنائی کی خاصی مقدار موجود ہوتی ہے۔

کولیسٹرول کی زیادہ مقدار امراض قلب کا سبب بن سکتی ہے۔ دوسری چکنائیوں کی طرح کولیسٹرول بھی پانی میں حل نہیں ہوتا۔ خون میں کولیسٹرول کی مناسب مقدار کی بہت اہمیت ہوتی ہے کیونکہ کولیسٹرول کی مقدار جتنی بڑھے گی' اسی قدر خون کی نالیوں میں کولیسٹرول جمنے سے معاملہ سنگین ہو سکتا ہے۔ تمباکو نوشی کی زیادتی اور وٹامن ''سی'' اور ''ای'' کی کمی اس خطرے کو مزید بڑھا دیتی ہیں۔ امریکن ہارٹ ایسوسی ایشن کے مطابق روزانہ تین سو گرام سے کم کولیسٹرول لینا چاہئے۔ اس سے زیادہ مقدار نقصان دہ ہوتی ہے۔ صحت مند دل کے لئے آپ کو اپنی خوراک پر بھرپور توجہ دینا ہوگی۔ آپ کے کھانے کا زیادہ حصہ نشاستہ پر مشتمل ہونا چاہئے۔ اس سے آپ کا دل صحت مند رہتا ہے۔ چاول' دال' جو کی اشیاء' تازہ پھلوں اور سبزیوں میں نشاستہ کی زیادہ مقدار پائی جاتی ہے۔ پھلوں' سبزیوں اور اناج میں ریشہ پایا جاتا ہے جو دل کے امراض سے بچاؤ میں اہم کردار ادا کرتا ہی۔ ایک عام صحت مند انسان کو روزانہ 20 تا 30 گرام ریشہ لینا چاہئے۔ اس کے حصول کے چند آسان طریقے درج ذیل ہیں۔ پھلوں کو چھلکے سمیت کھائیں۔ سیب' آڑو اور ناشپاتی کے چھلکے نہ گھلنے والے ریشے سے بھرپور ہوتے ہیں۔ بھورے چاول اور بھوری ڈبل روٹی استعمال کریں۔ سموسے اور چپس وغیرہ کی بجائی تازہ پھل اور سبزیاں استعمال کریں۔

گوشت' انڈے' دودھ کی بنی اشیاء کے علاوہ پھلیاں' دالیں' میوے' تل اور سورج مکھی کے بیجوں سے بآسانی پروٹین حاصل کی جاسکتی ہے۔ کم چکنائی والا دودھ اور اس سے بنی اشیاء اور بغیر چکنائی کا گوشت استعمال کرنا زیادہ مفید رہتا ہے۔ ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ مچھلی کھانا ضروری ہے۔ پھلیاں روزانہ سلاد کے طور پر استعمال کریں۔ اگر آپ کے جسم میں کولیسٹرول کی سطح مناسب ہے تو روزانہ انڈہ کھا سکتے ہیں بصورت دیگر ہفتے میں ایک یا دو بار انڈا کھائیں۔

اچھی صحت کے لئے ہمارے جسم کو بیس سے زائد معدنیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ میگنیشیم' پوٹاشیم اور کیلشیم کے آپس میں ملنے سے خون کی سطح اور بلڈ پریشر نارمل رہتا ہے اور شریانیں صحت مند رہتی ہیں۔ کیلشیم کے لئے دودھ' شلجم' مچھلی' سرسوں کا ساگ اور کم چکنائی والا پنیر استعمال کیجئے۔ میگنیشیم زیادہ تر اناج' میوے' ہری سبزیاں اور دالوں وغیرہ میں موجود ہوتا ہے جبکہ پوٹاشیم بآسانی پھلوں اور سبزیوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

میک اپ کرنے کے چند اصول اپنائیے

آپ نے دیکھا ہوگا کہ گھروں کا ماحول اچھا رکھنے کے لئے دفتروں میں نظم وضبط قائم رکھنے کے لئے یا بہترین معاشرتی زندگی گزارنے کے لئے اصول وضوابط بنانا ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح میک اپ کے بھی کچھ اصول ہیں ان اصولوں پر کاربند ہوکر میک اپ کرنے سے نہ صرف آپ کی جلد کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ آپ کی شخصیت میں بھی نکھار آجائے گا۔

۱۔ میک اپ جلد کی رنگت کو دیکھ کر کرنا چاہیے۔

۲۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جلد کس قسم کی ہے۔ خشک جلد اور نارمل جلد پر ایک ہی جیسا میک اپ نہیں ہوسکتا۔ جلد کی پہچان کے لئے آگے جاکر تفصیلی تحریر کیا جائے گا۔

۳۔ میک اپ کی اشیاء رنگت کے حساب سے لینی چاہیئے۔ گورے اور سفید رنگ پر ہلکا اور تیز دونوں ہی میک اپ اچھا لگتا ہے۔ مگر گندمی رنگت میں ہلکے رنگ یعنی ہلکا نیلا، ہلکا پیلا، ہلکا اورنج، ہلکا گلابی وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ میک اپ کرنے کے لئے اوقات کا خیال رکھنا چاہیئے۔ دن کے وقت ہلکا اور رات کے وقت گہرا میک اپ کرنا چاہیئے کیونکہ دن میں ہلکے سنگھار سے ہی چہرہ قدرتی معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ رات کو تیز روشنیوں میں گہرا میک اپ نظروں کو بھاتا ہے۔

۵۔ میک اپ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ گردن اور چہرے کی رنگت ایک جیسی ہو۔ بعض خواتین چہرے پر میک اپ کرتے وقت گردن کا خیال نہیں رکھتیں۔ اس طرح دیکھنے والوں کو فوراً احساس ہوجاتا ہے کہ چہرے پر لیپا پوتی کی گئی ہے۔

۶۔ میک اپ اتنا نہیں کرنا چاہیے کہ آپ پینٹ کی ہوئی موم کی گڑیا معلوم ہونے لگیں۔

۷۔ جلد خواہ کیسی ہی ہو اس کی بنیادی دیکھ بھال بہت ضروری ہے۔ لیکن ہر جلد کی دیکھ بھال اس کی انفرادی ضرورت کے تحت کرنی ضروری ہے۔ بدیگر صورت جلد چند سال میں ہی زردی مائل، بدرنگ اور خراب ہوکر رہ جائے گی۔ اس لئے آپ کو اپنی جلد کے متعلق معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کس طرح کی ہے۔

چکنی جلد کی پہچان

آپ سمجھ لیجئے کہ آپ کی جلد چکنی ہے۔ اگر:

۱۔ منہ دھونے کے ایک گھنٹہ بعد آپ کا ماتھا اور ناک چمکنے لگے۔

۲۔ آپ کی جلد کے مسام ضرورت سے زیادہ کھلے نظر آئیں۔

۳۔ مساموں میں سیاہی مائل کیل نظر آئیں۔

۴۔ کسی وقت بھی صاف ٹشو پیپر اپنے چہرے پر پھیریں تو وہ سیاہی مائل ہوجائے۔

خشک جلد کی پہچان

آپ کی جلد خشک ہے، اگر:

۱۔ کبھی کبھی جلد سے خشکی کے چھلکے سے اترتے نظر آئیں۔

۲۔ صابن سے منہ دھونے کے بعد جلد کھنچتی سی محسوس ہوتی ہو۔

متوازن جلد

چکنی اور خشک جلد کی دو انتہائی حالتیں اگر آپ کو نظر نہ آئیں تو پھر آپ کی جلد متوازن ہے۔

سامان برائے میک اپ

۱۔ کلینزنگ ملک، ۲۔ اسکن ٹانک، ۳۔ فاؤنڈیشن کریم، ۴۔ کم پیک پاؤڈر روج، ۵۔ سکارا، ۶۔ آئی لائنر، ۷۔ آئی شیڈو، ۸۔ بلش اون، ۹۔ لپ اسٹک کے مختلف شیڈ، ۱۰۔ ہینڈ کریم یا لوشن، ۱۱۔ چھوٹے چھوٹے برش جن سے پلکوں اور بھنوؤں کے بال درست کیے جاسکیں۔ ۱۲۔ صاف ستھری کنگھی، ۱۳۔ ناخن پالش، ۱۴۔ پالش ایمور، ۱۵۔ ناخن تراش۔

میک اپ کی ان چیزوں سے معمولی سا ٹچ دینے سے ہی چہرے پر نکھار اور تازگی آجاتی ہے۔

میک اپ کا سامان ہمیشہ معیاری اور اچھی کوالٹی کا خریدنا چاہئے۔ غیر معیاری چیزوں کے استعمال سے چہرے کی جلد خراب ہونے کا احتمال ہے۔ رنگت سیاہ پڑسکتی ہے۔ چہرے پر چھائیاں بھی پڑسکتی ہیں۔ آرڈینا، سیکس فیکٹر، مارڈے ایلز بتھ، آرڈن اور ہیلنا رابنس دنیا کی ان مشہور کمپنیوں میں سے ہیں جن کے سامان اعلیٰ معیار کے ہوتے ہیں ان میں ورائٹی بھی بہت ہوتی ہے۔

چکنی جلد پر میک اپ کرنے کا طریقہ

ایسی جلد رکھنے والی خواتین کو ویلوا لوشن استعمال کرنا چاہیے۔ یہ چہرے کے لئے بہترین اسٹرینجنٹ ہے۔ ہلکی ہلکی لیکوئیڈ ینڈ کلینزر سے جلد صاف کر کے ویلوا لوشن لگا لینا چاہیے۔ کمپنیوں کا میک اپ جلد کے لئے بہترین ہوتا ہے چکنی جلد پر ہمیشہ خشک میک اپ کرنا چاہیے۔ ایسی جلد والی خواتین کو اسکن ٹانک استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

خشک جلد پر میک اپ کا طریقہ

ایسی جلد والی خواتین موسچرائزر یا موسچرائزنگ کریم استعمال کریں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یہ لوشن خشک جلد پر نمی اور روغن مہیا کرتا ہے۔

گندمی رنگت پر میک اپ کا طریقہ

گندمی رنگت رکھنے والی خواتین کو چاہیے کہ وہ ایلز بتھ آرڈن کی فیدر لائٹ فاؤنڈیشن کا روز ایشل شیڈ استعمال کریں۔ کیونکہ گورے رنگ پر تو ہر طرح کا میک اپ چل جاتا ہے لیکن گندمی رنگت رکھنے والی خواتین پر میک اپ اگر سلیقہ سے نہ کیا گیا ہو تو ان کے چہرے کا رنگ بدنما اور سیاہ نظر آنے لگتا ہے۔

کیلوں اور مہاسوں پر میک اپ کرنے کا طریقہ

ایسی خواتین جن کے چہروں پر کیلیں اور مہاسے نکل آئیں انہیں موسچرائزر یا موسچرائزنگ کریم بالکل استعمال نہیں کرنی چاہیے۔ چہرے پر کیلیں اور مہاسے جلد کی چکنائی کے باعث نمودار ہوتے ہیں۔

چکناہٹ کی وجہ سے میل جلد پر جم جاتا ہے اور دانے نکلتے ہیں۔ اور یہ لوشن چہرے پر لگانے سے چہرے کی چکنائی میں اضافہ کرتا ہے۔ چنانچہ چہرے پر اگر دانے اور مہاسے نکلے ہوں تو:

۱۔ ہلکی لیکوئڈ ینڈ کلینزر سے جلد کو صاف کریں۔

۲۔ ویلوا سمتھ لوشن لگائیں۔

۳۔ جب لوشن خشک ہوجائے تو اوپر سے سوونگ لوشن لگائیں۔

نوٹ: ہائی فان فاؤنڈیشن کریم اور زور کریم بلش اون استعمال نہ کریں۔ سوونگ لوشن صرف چہرے کے دانوں سے ہی نجات نہیں دلاتا بلکہ یہ فاؤنڈیشن کا کام بھی دیتا ہے۔

۴۔ اس کے بعد پاؤڈر ایلشر لگائیں۔

نوٹ: اگر فاؤنڈیشن لگانا بھی ضروری ہے تو فاؤنڈیشن کے بعد فیس پاؤڈر لگائیے۔

۵۔ سونے سے پہلے کلینزر میک اپ اتار کر صرف ویلوا سمتھ لوشن لگائیں۔

☆.....☆.....☆

لباس اور شخصیت

آج کل خواتین اور لڑکیاں اپنے حسن و جمال کے لئے میک اپ اور ہیئر اسٹائل پر بہت توجہ دیتی ہیں کہ کونسا میک اپ استعمال کریں اور کیسے بال بنائیں۔ اس کے لیے وہ بہت تیاری بھی کرتی ہیں۔ اس کے باوجود اکثر خواتین پارٹیوں میں تیار ہو کر بھی پریشان سی نظر آتی ہیں۔ یہ خود اعتمادی کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جبکہ وہ خود بھی جانتی ہیں کہ لباس کے اثرات ان کی شخصیت پر کتنا نمایاں اثر ڈالتے ہیں۔ اس کے باوجود اپنے لباس، اس کے رنگ اور اس کی سلائی کٹائی کی طرف اتنی توجہ نہیں دیتیں۔ اگر آپ بہترین لباس میں مکمل پراعتماد شخصیت نظر آنا چاہتی ہیں تو درج ذیل، باتوں کا خیال رکھیں اور کچھ باتوں سے پرہیز بھی کریں، آج ہم آپ کو یہی بتاتے ہیں۔

موسم اور لباس:

لباس کے انتخاب اور تیاری میں سب سے پہلے موسم کو پیش نظر رکھیں خواہ فیشن کچھ بھی ہو، تیز گرمی میں شوخ چلچلاتے رنگ برے لگتے ہیں جبکہ سردیوں میں ہلکے رنگ میں بندہ میلا میلا سا دکھائی دیتا ہے۔

لباس اور شخصیت:

فیشن خواہ کیسا ہو، اپنی شخصیت کو ضرور مدنظر رکھیں۔ دیوانگی کی حد تک فیشن کی نقل کرنا حماقت ہے۔ مثال کے طور پر اگر آج کل چھوٹی اور ٹائٹ، قمیص اور بہت کم گھیرے کی کھڑی اور اونچی شلوار کا فیشن ہے لیکن اگر آپ موٹی ہیں تو ایسے کپڑوں سے گریز کریں۔ اگر آپ کا قد بہت چھوٹا ہے تب بھی ایسا فیشن آپ کا قد مزید بونا ظاہر کرے گا۔

تقریبات کے مطابق:

تقریبات میں جاتے ہوئے یہ خیال ضرور رکھیں کہ تقریب کس قسم کی ہے بلاشبہ سادگی یا زندہ دلی بھی اچھی چیز ہے لیکن تقریبات میں جاتے ہوئے خیال رکھیے کہ آپ دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہو رہی ہیں لہٰذا شادی وغیرہ کی بڑی تقریب میں ایسا لباس زیب تن نہ کریں کہ بے دلی ظاہر ہو۔ ہلکی پھلکی تقریبات میں بے حد بھاری لباس بھی مناسب نہیں۔

لباس اور میک اپ:

اگر آپ کا لباس بہت بھاری ہے تو اس کے ساتھ

بہت بھاری میک اپ نہ کریں میک اپ کے شیڈز میں لباس کے رنگوں کو ہم ہنگ کریں۔

لباس اور زیورات:

تقریب میں لباس اور زیورات کے تناسب کا خیال رکھیں بہت زیادہ سونے کے زیورات کا آج کل فیشن نہیں، اگر آپ کا لباس ذرا ہلکا ہے اور تقریب بڑی ہے تو آپ اس کمی کو بھاری زیورات مثلاً بڑے بندے، کئی انگوٹھیاں، بریسلٹ اور بڑی میچنگ جیولری سے تناسب دے سکتی ہیں۔

اپنے لباس کو مزید دیدہ زیب بنانے کے لیے مختلف قسم کی کڑھائی سے دلکشی بخشیں کڑھائی، اپلیک ورک، کامدانی، تلے کا کام، گوٹے دھنک اور سلمہ ستارے وغیرہ سے کپڑوں کی جگمگاہٹ مزید بڑھ جاتی ہے۔

لباس اپنے سائز کے مطابق:

خیال رکھیں کہ آپ کا لباس آپ کے ناپ کے مطابق ہو۔ ناپ سے بڑے کپڑے آپ کو زیادہ موٹا ظاہر کرتے ہیں جبکہ بہت ٹائٹ چست کپڑے بھی برا منظر پیش کرتے ہیں۔

بنا استری کپڑے:

خوش لباسی کے لیے لازم ہے کہ آپ کے کپڑے مڑے تڑے نہ ہوں بلکہ استری شدہ ہوں کوشش کریں کہ ایسے کپڑے زیادہ خریدیں جن میں زیادہ شکنیں نہ پڑتی ہوں۔ ہمیشہ استری استعمال کریں۔

دو موسموں کے کپڑے مکس نہ کریں:

سردیوں اور گرمیوں کے کپڑے کبھی مکس کر کے نہ پہنیں بلکہ الگ الگ استعمال کریں اس کے علاوہ مختلف فیشن کو ایک ہی وقت میں استعمال نہ کریں اس سے آپ کی ظاہری شخصیت متاثر ہوگی۔

داخلی ملبوسات کی لکیریں نظر نہ آئیں:

اپنے داخلی ملبوسات اپنے ناپ کے مطابق ہی لیں ان ملبوسات کی لکیریں خارجی لباس سے نظر نہ آئیں، اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا خارجی لباس غلط ناپ کا ہے۔

چست اور مختصر لباس سے گریز:

بہت مختصر اور ٹائٹ چست لباس سے آپ آرام سے بیٹھ نہیں سکتیں بے آرامی محسوس ہوتی ہے ویسے بھی بہت ٹائٹ لباس موٹی جسامت کو مزید موٹا اور پتلی جسامت کو مزید پتلا ظاہر کرتا ہے۔

بہت زیادہ تصاویر، پھولوں، بوٹوں اور گنجلک ڈیزائن والے لباس نہ پہنیں۔ اگر آپ کو ایسے کپڑے پسند ہیں تب بھی خیال رکھیں کہ ایسی قمیص کے ساتھ شلوار سادی ہو اور اگر شلوار ایسی ہے تو قمیص ضرور سادی ہو۔ مکمل ایسا لباس آپ کی شخصیت کو ''اوور'' کر دے گا۔

کندھوں پر کپڑوں میں اسفنج نہ لگائیں یہ بہت پرانا فیشن ہے۔ جواب متروک ہے۔ اس سے کندھے زیادہ چوڑے لگتے ہیں۔ البتہ بہت چھوٹے اور تنگ کندھوں کی صورت میں اسفنج کا ہلکا سا استعمال کر سکتی ہیں لیکن گردن چھوٹی ہو تب تو بڑے اسفنج کو بالکل استعمال نہ کریں اس سے کندھے اٹھے ہوئے اور گردن مزید چھوٹی لگے گی۔

یاد رکھیے، خود پر تھوڑی سی توجہ آپ کو دوسروں میں ممتاز بنا دے گی اس لیے مصروفیت میں بھی خود کو نظر انداز نہ کریں۔ یہ آپ کی ذات پر آپ کا قرض ہے کہ آپ اس پر توجہ دیں، اسے نکھاریں اور سنواریں اگر آپ ان چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں کا خیال رکھیں گی تو خوش لباس اور متوازن شخصیت آپ کا ٹائٹل ہوگا۔

☆.....☆.....☆

نیم

نیم ایک مشہور درخت ہے اس پر پھول آتا ہے جس کی خوشبو بھینی بھینی ہوتی ہے جو آس پاس کے ماحول کو مہکاتی ہے اس کے بعد پھل آتا ہے جو انگور کے برابر ہوتا ہے اور شکل میں گول ہوتا ہے جس کو نبولی کہتے ہیں۔

کچی نبولی سبز رنگ کی ہوتی ہے مزا کڑوا ہوتا ہے۔ پکنے پر رنگت پیلی ہو جاتی ہے اور مزا میٹھا ہو جاتا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ نیم کے تمام اجزاء بنیادی طور پر کڑوے ہوتے ہیں۔

نیم مزے کے لحاظ سے جس قدر کڑوا ہوتا ہے اسی قدر فائدہ کے لحاظ سے میٹھا۔ نیم کے درخت کی ہر چیز استعمال کی جاتی ہے۔ پتے، پھول، پھل، چھال بطور دوا استعمال کئے جاتے ہیں۔ نیم کی شاخوں سے مسواک کرنا دانتوں کو صاف بھی کرتا ہے اور ان کو کیڑا لگنے سے بچاتا ہے اور مسوڑھوں کو صحت مند رکھتا ہے۔ نیم کے درخت کا سایہ صحت بخش اور سکون دیتا ہے۔

نبولی کی گٹھلیوں سے تیل نکالا جاتا ہے جو نیم کا تیل کہلاتا ہے۔ نیم کا تیل نبولیوں سے دوسرے روغنی بیجوں کی طرح نکالا جاتا ہے بہت کار آمد اور اچھا ہوتا ہے۔ خراب قسم کے زخموں کے لئے مفید ہے۔ زخم اگر اس حد تک خراب ہو گیا ہو کہ اس میں کیڑے پڑ گئے ہوں تو وہ بھی اس کو لگانے سے مر جاتے ہیں۔ بچیوں کے سر میں جوؤں کی شکایت عام ہے۔ نیم کا تیل سر میں لگانے سے جوؤں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

جوؤں کے لیے نیم کے پتوں کے پانی سے سر دھونے سے بھی جوؤں سے نجات مل جاتی ہے۔

جلد کے دیگر امراض خارش، پھوڑے، پھنسی، آتشک اور جزام کے مریض بھی اس کے پانی کو استعمال کر کے اپنے مرض کی شدت میں کمی کر سکتے ہیں۔ نیم کے پتے خون صاف کرنے کے لیے بہترین ہیں۔ اگر 20 سے 25 پتے 7 عدد کالی مرچوں کے ساتھ پیس کر چھان کر پیا جائے تو اس سے خارش پھوڑے پھنسی حتیٰ کہ جزام (کوڑھ) کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔

نیم کی کونپلیں پیس کر لگانے سے گرمی دانوں میں بہت فائدہ ہوتا ہے۔ نیم کی خاصیت ہے کہ زخموں سے مواد نکال کر ان کو صاف کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے زخم خراب ہونے اور بگڑنے سے بچ جاتے ہیں۔

سر اور جسم میں خشکی کا مرض آج کل بہت عام ہے ہر دوسرا فرد سر میں خشکی کا شکار ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے بازار میں دستیاب ہر طرح کا شیمپو استعمال کر کے مایوس ہو چکا ہے کہ خشکی اپنی جگہ پر موجود ہے اور اس کی وجہ سے بالوں کے گرنے میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے لیے بھی نیم بہترین ہے۔ نیم کے پتوں کو دھو کر انہیں پانی میں ڈال کر پکائیں اور اس کو ٹھنڈا کر کے غسل کر لیں سر اور جسم دونوں کی خشکی کو اس سے فائدہ ہو گا۔ بال بھی نرم و ملائم ہو جائیں گے خشکی، دمہ جلد پر ہونے والے گرمی دانے بھی اس پانی سے نہانے سے ختم ہو جاتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

رنگِ سخن

ترتیب: شاہ روم خان ولی

محمد سلیم قمر دنیائے شعر و ادب میں قمر صدیقی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ جائے پیدائش گوجرانوالہ ہے۔ آج کل کھاریاں میں رہائش پذیر ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے نانا ماسٹر نذیر الحق مرحوم سے جو کہ ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے گھر پر حاصل کی بعد ازاں میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ جبکہ گریجویشن گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ سے کی زمانہ طالب علمی میں بہترین مقرر رہے ہیں اقوار گولڈ میڈلسٹ ہیں پروفیسر محمد احمد شاد ایم اے نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف حسن بیان میں قمر صدیقی کو پاکستان کے بہترین مقررین میں شمار کیا ہے زمانہ طالب علمی سے ہی شاعری اور نثر دونوں میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں شاعری کے ساتھ ساتھ مختلف اخبارات کیلئے کالم بھی لکھتے ہیں۔ اجالا، سانجھی دھرتی، خوگرانِ حرف و صدا، نعت اکیڈمی پاکستان، الحاج فاونڈیشن اور قلم قافلہ سمیت متعدد ادبی فورمز کے فعال رکن ہیں۔ نمونہ کلام!

دشتِ تاریک سے نکل گئے ہم
شکر، تشکیک سے نکل گئے ہم

ہے عجب خلفشار میں حاضر!
کیسی تکنیک سے نکل گئے ہم
گردشِ بخت سے وعا کے طفیل
دیکھ لو ٹھیک سے نکل گئے ہم
حسن کی اوٹ میں کھڑا تھا عشق
ہنس کے نزدیک سے نکل گئے ہم
کارِ باریک تھا جہاں گیری
کارِ باریک سے نکل گئے ہم

☆☆☆

جو شجر با ثمر نہیں ہوتے
وہ کبھی معتبر نہیں ہوتے
خود پرستانہ سوچ کے حامل
ہم سفر، ہم سفر نہیں ہوتے
کوئی قدغن نہیں خیالوں پر
جب تلک مشتہر نہیں ہوتے
ہم اسیرانِ کربلا ہیں میاں!
گھر میں ہو کر بھی گھر نہیں ہوتے
ان میں آخر شگاف پڑتے ہیں
جن فصیلوں میں در نہیں ہوتے
کون کہتا ہے سوچ کے دھارے
مظہرِ خیر و شر نہیں ہوتے
طائرِ لامکاں ہے گرچہ!
سوچ کے بال و پر نہیں ہوتے
کرہ ہجر کے اسیر قمر
شاد ہوتے ہیں پر نہیں ہوتے

☆☆☆

زمین پر ہے کہیں اور نہ آسمان میں ہے
مرا قیام کسی اور ہی جہان میں ہے

میں اس نتیجے پہ پہنچا ہوں بعد از تحقیق
کہ میری جڑ تو کسی اور کے گمان میں ہے
وہ اک سفر جسے کہتی ہے ارتقاء دنیا
صدائے کُن کا تسلسل ہے اور اٹھان میں ہے
میں چاک کردوں حقیقتِ ازلی
مرا گمان مضافاتِ لا مکان میں ہے
کسی بھی شے میں نہیں زہر اس قدر جتنا
حروف میں یا پھر انسان کی زبان میں ہے

☆☆☆

بات کو طول کیوں دیا جائے
یار خاموش ہی رہا جائے
راکھ میں ہیں ابھی شرر پنہاں
ان کو پانی پلا دیا جائے
بحرِ خاموش پر نگاہ قمر
کوئی طوفان ہی نہ آ جائے
دوستو! تار تار وحدت کو
مل کر بارِ دگر سیا جائے
جس کی زد میں ہیں دخترانِ وطن
اس ہوا کو ، ہوا کیا جائے
اپنے فردا کی بہتری کے لئے
وقت کی راگ کو سنا جائے
سانپ جتنے بھی آستیں میں ہیں
خاتمہ سب کا اب کیا جائے
اپنی پوروں کے لمس سے جاناں
خال و خد کو ترے پڑھا جائے
شاہی قلعہ کے برگدِ کہنہ
آؤ ماضی ہرا کیا جائے
یار صدیقی گھر کی باتوں کو
طشت از بام کیوں کیا جائے

☆☆☆

نظم

جاناں!

سنو!

تم مجھے اتنا ستاتے کیوں ہو؟

تم جانتے ہو ناں میں تمہارے بن ادھوری ہوں

جب ایک بار آ کے چلے جاتے ہو ناں.....

پھر میرا انتظار شروع ہو جاتا ہے

پھر میں دن کا ایک ایک گھنٹہ

ایک ایک لمحہ گنتی رہتی ہوں

پھر تمہاری آمد کی نوید ملتی ہے

تو پتہ ہے تم کو، میں پھر لمحے گنتی ہوں

اور.....اور پھر تم ملتے ہو تو

دن اور رات کا پتہ ہی نہیں چلتا

تم اور میں.....

میں اور تم.....

میری رب سے دعا ہے کہ تم

ہمیشہ یوں ہی ملتے رہو

سدا سلامت.....شاد آباد رہو

میرے پیارے ''ریشم''

﴿مسز نگہت غفار، کراچی﴾

چراغ کو جلتے رہنا ہے

مجید احمد جائی

اگست کے مہینے سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں جب جب اگست کا مہینہ آتا ہے میرے لیے خوشیاں ،مسرتیں لے آتا ہے اور بے پناہ رحمتیں ،نعمتیں دے کر جاتا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتا ہوں۔اس بار بھی میں خوشیوں کے جھرمٹ میں جھوم رہا ہوں۔جی ہاں۔خوشیاں میرے آنگن میں ،میری روح تک رقصاں ہیں۔میں کیوں نہ جھوموں ،میں جشن کیوں نہ مناؤں۔18اگست 2017ء کا حسین ترین دن تاریخی اور یادگار بن گیا ہے۔میری زندگی کا خوبصوت ترین دن۔یہ دن میری لائبریری کے لئے انمنٹ نقش چھوڑ کر حسین یادوں میں اضافہ کر گیا ہے۔

اس مبارک دن کو''مجید احمد جائی ادبی لائبریری'' کا افتتاح ہوا۔میں کیوں ناں شکریہ ادا کروں اپنے دل کے ہیرو کا جنہوں نے ہر موقع پر میرا مان بڑھایا ،مجھے تھپکی دی ،میرا حوصلہ بڑھایا۔اس عظیم شخصیات کے ہاتھوں میری لائبریری کا افتتاح ہونا میرے لیے کسی عظیم تحفہ سے کم نہیں ہے۔پہلے آپ کی تحریروں نے اپنا گرویدہ بنایا اور اب آپ کی سادہ طبیعت نے ،خوش اخلاقی ،اعلیٰ ظرفی نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔خوشی کے اس موقع پر میری خوشیوں میں اور اضافہ ہوا جب''بے ثمر راہ کا مسافر'' میرے ہاتھوں میں آئی۔آپ کی تحریریں میرے دل کی ترجمان ہوتی ہیں۔

18اگست کی سہانی ،مبارک گھڑی کو مقررہ وقت کے مطابق سجاد جہانیہ کے دست مبارک سے مجید احمد جائی ادبی لائبریری کا افتتاح ہوا۔سجاد جہانیہ نے سرخ فیتہ اپنے ہاتھوں سے کاٹ کر مجید احمد جائی ادبی لائبریری کا افتتاح کیا اور خصوصی دُعا کرائی۔اس موقع پر سجاد جہانیہ کے ساتھ میرے عزیز دوستوں اور اہل

علاقے نے پُرجوش شرکت کی۔ جناب اظہر سلیم مجوکہ (سینئر کالم نگار نوائے وقت)، ملک فیاض اعوان (بزم احباب)، قاری محمد عبداللہ (رائیٹرونگ تنظیم)، مفتی عزیز الرحمان نے خصوصی شرکت کی۔ آپ لوگوں کی آمد سے ادبی ماحول کا سماں بندھ گیا۔

دعائیہ تقریب کے بعد حاضرین نے لائبریری کا وزٹ کیا اور مبارک باد کے پھول نچھاور کرتے رہے۔ لائبریری میں مہمانان خصوصی کے قدم رکھتے ہی راقم الحروف نے پھولوں کے ہار پہنا کران کا استقبال کیا۔ اس موقع پر کرن کرن روشنی کی پوری ٹیم پُرجوش انداز میں استقبال کرتی نظر آئی۔ علی عمران ممتاز نے مجید احمد جائی کو پھولوں کے ہار پہنائے اور مبارک باد دی۔

مجید احمد جائی ادبی لائبریری کے وزٹ کے بعد تلاوت قرآن پاک، نعت خوانی کرائی گئی۔ علی عمران ممتاز نے کرن کرن روشنی ٹیم کا مہمانوں سے تعارف کروایا اور مجید احمد جائی ادبی لائبریری کا تعارف پیش کیا۔ ملک محمد فیاض اعوان (بزم احباب) کو اظہار خیال کے لئے دعوت دی گئی۔ ملک محمد فیاض اعوان صاحب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مجید احمد جائی کو اس کاوش پر مبارک باد دی اور بزم احباب کے پلیٹ فارم پر اعزاز کے طور پر تقریب کروانے کا اعلان بھی کیا۔ قاری محمد عبداللہ صاحب نے اظہار خیال کرتے ہوئے مجید احمد جائی کی اس کاوش کو نہ صرف سراہا بلکہ دلی خوشی کا اظہار بھی کیا اور اُنہوں نے بھی اعزاز کے لئے ملتان آرٹس کونسل میں تقریب کروانے کا اعلان کیا۔ جناب جنید اکرم انصاری نے خوبصورت الفاظ میں اس کاوش کو سہراتے ہوئے مبارک باد کے پھول نچھاور کیے۔ جناب اظہر سلیم مجوکہ صاحب نے کتاب دوستی کو فروغ دینے کے اس کام کو سراہتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا اور اپنی کتب ''آس کی تتلیاں'' اور بہت سی کتب لائبریری کے لئے بطور عطیہ کیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ مجید احمد جائی نے اپنی سالگرہ سے دو دن قبل اپنے علاقے بلکہ پورے معاشرے کو خوبصورت تحفہ عطا کیا ہے۔ (یاد رہے بیس اگست کو میری سالگرہ ہوتی ہے)۔ صدر محفل جناب سجاد جہانیہ صاحب نے مجید احمد جائی ادبی لائبریری کے اجراء پر مبارک باد کے ساتھ نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں اس نیک کام کے لئے مجید احمد جائی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان کے اس مقصد کے لئے ہر لمحہ ہر پل اپنی خدمات دیتا رہوں گا۔ کافی دیر محترم سجاد جہانیہ صاحب لائبریری کی کتب کا تفصیلی جائزہ لیتے رہے۔ مجید احمد جائی ادبی لائبریری کے لئے اپنی کتب ''بے ثمر راہ کے مسافر'' ''عورت کتھا'' کے ساتھ تیس خوبصورت کتب کا عطیہ عطا کیا اور وعدہ کیا کہ بہت جلد اور بھی کتب لائبریری کے لئے ارسال کریں گے۔ آخر میں راقم الحروف مجید احمد جائی کو اپنے خیالات کے لئے دعوت دی گئی۔ اس موقع پر آنے والے تمام دوستوں اور اہل علاقہ کا شکریہ ادا کیا گیا اور لائبریری کے مقصد اور اجراء کے حوالے سے شرکاء کو بریف کیا گیا۔ کتاب کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی گئی اور دوستوں کو دعوت دی گئی کہ اس لائبریری کے لئے اپنی خدمات کا موقع فراہم کریں۔ مجید احمد جائی ادبی لائبریری میں ان پڑھ حضرات کو کتاب پڑھ کر سنانے کی سہولت دی جائے گی اور لائبریری میں کتب پڑھنے والوں کو ریفریشمنٹ بھی دی جائے گی۔ آخر میں مجید احمد جائی ادبی لائبریری کی کامیابی و کامرانی کے لئے خصوصی دعا کرائی گئی اور شرکاء کی خاطر و تواضع کی گئی۔ اس دوران کتاب اور کتاب دوستی پر سیر حاصل گفتگو جاری رہی اور سبھی شرکاء نے خوشگوار موڈ میں سلفیاں بھی بنوائیں۔ سورج کے غروب ہوتے ہی اس حسین دن کا اختتام ہوا۔ یوں یہ دن میری یادداشت میں حسین یادیں نقش کر کے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆☆

ضرورت ہے ایک ”مینج گارڈ ریگولا“ کی

بشریٰ مسرور

یہ بات درست ہے کہ میتھ میں کبھی میرے اچھے نمبر نہیں آئے مگر میرا حساب کتاب اتنا کمزور بھی نہیں تھا کہ میں ہفتہ وار بچت بازار میں سبزی والے کو تین چار چھوٹی موٹی سبزیوں کی خریداری کے عوض ہزار روپے کا نوٹ دان کر آتی۔ سو رخ نامہ کی تختی اور اپنے چھوٹے سے شاپر میں ڈالی چند سلاد کی سبزیوں کی جانب اشارہ کر کے بحث کرنے لگی کہ اس نے کھڑے کھڑے اتنے دام کیسے بنا لیے۔ مگر اس کی ڈھٹائی کا عالم یہ تھا کہ میری کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ میری چار سبزیوں کو اس نے بل میں سات آئٹم بنا کر مجھ سے ہزار روپے ہتھیا لیے بقیہ پیسے واپس دینے کو تیار ہی نہ تھا۔ میں نے اپنے شاپر میں موجود سبزیوں اور بل پر نظر دوڑائی تو کھلم کھلا اس بے ایمانی پر سخت تاؤ آیا۔ میں اونچی آواز میں بول رہی تھی مگر دکاندار مجھے نظر انداز کر کے باقی گاہکوں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اسی ہفتہ وار بازار میں موجود سی ڈی اے کے کاؤنٹر پر موجود اہلکاروں کے پاس جا کر شکایت درج کراؤں۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ کوئی بھلا مانس جا کر سی ڈی اے کے دو تین اہلکاروں کو موقع پر بلا بھی لایا جنہوں نے کھڑے کھڑے اپنے رجسٹر میں میری شکایت درج کی اور دکاندار کو سرزنش کرتے ہوئے میرے بقیہ پیسے واپس دلائے مگر اب بھی دکاندار شرمندہ نظر آنے کی بجائے اسی طرح پرسکون تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور یہ واقعہ معمول کا ایک حصہ ہو، میں اسی بازار کا ٹرالی بردار شخص (جس کی ٹرالی پر میں نے خریداری کا سامان رکھا ہوا تھا) مجھ سے کہنے لگا کہ باجی اب ہر جمعہ، منگل اور ہفتہ بازار بس نام کے بچت بازار رہ گئے ہیں۔ یہاں کے دکانداروں کا یہی معمول ہے کہ اکیلی خواتین اور کم تعلیم یافتہ سادہ لوح لوگوں سے پیسوں میں یوں ہی ہیرا پھیری کرتے ہیں اور سو پچاس ہر گاہک سے ٹھگ لینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دو روز قبل اسی بازار میں ایک باجی نے مچھلی خریدی تھی، مچھلی تول میں کم نکلی تو باجی نے سی ڈی اے اہلکاروں کو شکایت درج کرائی۔

اچھا پھر؟ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ پھر کچھ بھی نہیں اس وقت تو باجی کے سامنے دکاندار کو ڈانٹ ڈپٹ کر مچھلی پوری تلوا دی گئی اور بعد میں سی ڈی اے اہلکاروں کے گھروں کے لیے پانچ پانچ کلو مفت مچھلی دے کر مچھلی والے نے رجسٹر سے اپنی شکایت خارج کروا دی۔

سودا لے کر جب میں گھر پہنچی تو میرا چھوٹا بیٹا (جس کی عمر دس سال ہے) منہ بسورے بیٹھا تھا۔ استفسار پر وہ کچھ یوں گویا ہوا کہ امی جی! آپ تو کہتی ہیں کہ جمعے کی نماز کے وقت سارے کھیل کود اور کام چھوڑ کر نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں جایا کرو تو بے شمار نیکیاں اور ثواب ملتا ہے۔ ہاں ہاں تو پھر......؟ میں نے پوچھا۔

جی تو میں آپ کے کہنے پر آج جمعے کی نماز کے لیے مسجد گیا اور واپسی پر مسجد سے گھر تک ننگے پاؤں آیا ہوں کیوں کہ کسی نے میری نئی جوتی چرا لی ہے۔ اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ بیٹا میں نے آپ کو مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جانے کو کہا تھا۔ نئے جوتے پہن کے جانے کے لیے تو نہیں کہا تھا ناں۔ خیر...... ممکن ہے اس جوتی کی آپ سے زیادہ کسی اور کو ضرورت ہو۔ یہ کہہ کر صبر و تحمل پر لیکچر دیا اور وعدہ کیا کہ شام کو اسے نئی چپل لے دوں گی۔ بیٹے کو مطمئن کرنے کے بعد میز پر پڑا اخبار اٹھایا تو خبر تھی کہ ایک فائیو سٹار ہوٹل میں گاہکوں کو سور اور گھوڑے کے گوشت سے بنی ڈشز کھلانے کا انکشاف۔ اس کے علاوہ گوشت کی دکانوں پر مردہ جانوروں کے گوشت کی فروخت کا

سلسلہ جاری۔ میں نے اخبار میز پر رکھ دیا اور سوچنے لگی کہ ہم کتنے رزیل ہو چکے ہیں۔ لالچ و خودغرضی کے حربے سے کمائی گئی دولت کی چمک نے اس حد تک ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد اور اپنی موت کو فراموش کر کے حرص و ہوس کا تازیانہ کھائے ہوئے خواہشات کے بے لگام و منہ زور گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہیں اور ایک دن بے دم ہو کر گر جاتے ہیں، پھر کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ مگر جب تک زندہ رہتے ہیں، کمزوروں کو مزید کمزور کرنے، بے چھت لوگوں کے قدموں تلے سے زمین کھینچنے، تعلیمی اداروں میں نئی نسل کو نشہ آور اشیاء کے استعمال پر لگانے، اغواء برائے تاوان کرنے، اپنی قوم کی بچیوں کو بلیک میل کر کے ان سے پیشہ کرانے، غیر اخلاقی ویڈیوز کا کاروبار چمکانے اور اسی قسم کی کئی دوسری چھوٹی بڑی مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث رہتے ہیں۔ کسی کو بے وقوف بنا کر ٹھگنے کو ہم ذہنیت کا نام دیتے ہیں۔ اپنی اپنی سطح پر ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی نوعیت کی کرپشن میں ملوث ہے، بے روزگاری اور افلاس سے تنگ آئے لوگ اگر جرائم میں ملوث ہوں تو بات سمجھ میں آتی ہے مگر وہ جن کے پیٹ ناکوں ناک بھر ہوئے ہیں۔ وہ اپنی تجوریاں مزید بھرنے کے لیے ہر وقت سادہ لوح لوگوں کا لہو نچوڑنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔ لہو نچوڑنے پر مجھے سلطنت ولاچیا کی تاریخ کا ایک کردار یاد آ گیا۔ جس کا نام شہزادہ ولاد ڈریکولا تھا۔ ناولوں اور فلموں کا یہ خوفناک کردار دراصل شہزادہ ولاد کی غیر اخلاقی و غیر انسانی سرگرمیوں کے باعث تخلیق کیا گیا۔ اس شہزادے کو تاریخ میں ''میخ گاڑ'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ میخ گاڑ لوگوں کے جسموں کو کیلوں کے ساتھ چوبی تختوں یا ستونوں پر جڑوا دیتا تھا۔ پھر اس طرح کے ستون کو سیدھا کر کے زمین میں گاڑ دیا جاتا۔ ستون جتنا لمبا ہوتا۔ سزا پانے والا ملزم بھی اتنا ہی اہم تصور کیا جاتا تھا۔ ولاد، ایذا رسانی کے نت نئے تجربات سے خوشی محسوس کرتا تھا۔ رات کے کھانے پر وہ اپنے ترک دشمنوں کا خون پینا پسند کرتا تھا۔ تاریخ میں ولاد کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا جاتا اور اسے آرڈر آف دی ڈریگن میں شامل کر لیا گیا۔ اسے ڈریکولا کا نام دیا گیا جس کا مطلب ''ڈریکل کا بیٹا'' ہے (ڈریکل ولاد کے باپ کا نام تھا) ولاد کی تمام ایذا رسانیوں کے باوجود اس کے دور حکومت کی خاص بات یہ تھی کہ اس کی پوری رعایا کام کر کے قومی خوشحالی میں اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔ ولاد نے سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ چوروں، جھوٹوں اور ملاوٹ کرنے والوں کو میخیں لگا کر تختوں پر جڑ دیا جائے گا۔ اس معاملے میں کسی بچے کو بھی معاف نہ کیا جائے، اس نے گاہکوں کو دھوکہ دینے والے تاجروں اور دوسروں کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھنے والی عورتوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا تھا۔ ولاد کی ان سخت ترین سزاؤں کے باعث جرم تقریباً ختم ہو کر رہ گیا اور ولاد نے ایک چوک میں سونے کا پیالہ رکھوا دیا۔ ہر ایک کو اس پیالے سے پانی پینے کی اجازت تھی مگر کوئی اسے لے کر جا نہیں سکتا تھا۔ اس کے پورے دور حکومت میں یہ پیالہ وہاں موجود رہا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت کی تقلید کرنے کے تو ہم اب شاید اہل ہی نہیں رہے، کیوں کہ ہم نے اسلام کے مطابق اپنے مسلم معاشرے میں سزاؤں کو رائج نہیں کیا بلکہ بیرونی دباؤں میں آ کر قصاص یعنی موت کے بدلے موت کے حکم کو نظر انداز کرتے ہوئے قاتلوں کے لیے سزائے موت بھی ترک کر دی تو پھر اب ہمیں شکوہ کس بات کا ہے، یہ تو فرمان الٰہی ہے جیسی قوم ویسے حکمران۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ اگر ہم اپنے اسلامی معاشرے میں اسلامی نظام قائم نہیں کر سکتے تو کیا اب ہمیں خدانخواستہ کسی ''میخ گاڑ ڈریکولا'' کی ضرورت ہے جو اپنی وحشت و بربریت کے زور پر جرائم کا خاتمہ کرتے ہوئے عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کر سکے۔

☆☆☆